

# گئے دلوں کے سُرور

پندرہ اٹھویں صدی کے مضامین



جاوید چوہدری

# گئے دنوں کے سورج

---

(چند انٹرویوز، چند مضامین)

جاوید چودھری

طاہر یل ہاؤس  
پریس اسٹریٹ صدر کراچی  
فون: 2253305

رُصیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

## گلے دنور کے سورجے

---

### ملاقاتیں

11	الطاف گوہر
49	ممتاز مفتی
71	عطاء الحق قاسمی
117	بیگم شفیقہ ضیاء الحق
127	ایئر مارشل ذوالفقار علی خان
143	شیمم قریشی
161	پروفیسر عبدالعزیز
175	امیر گلستان پنجوہ
199	ڈاکٹر اقبال ولہ

### فیچرز

213	
215	فیض احمد فیض کے نرم گوشے
227	حکمرانوں کے دسترخوان

241

249

265

277

287

297

311

پروفیسر احمد رفیق اختر

دنیا میں نشے کی تاریخ

ہم جنوں کی دنیا میں رہتے ہیں

خان لیاقت علی خان

جس گھر سے مکینوں کا اعتماد اٹھ جائے اُسے کوئی نہیں بچا سکتا

حکمرانوں کے روحانی باپ

بجٹ نہیں زندگی مسئلہ ہے

## دیباچہ

انسان زندگی میں دو قسم کے لوگوں سے ملتا ہے ایک وہ لوگ جن سے مل کر انسان کو محسوس ہوتا ہے وہ بہت بڑا ہے اور دوسرے وہ لوگ جن سے مل کر انسان کو احساس ہوتا ہے وہ اور اس کی ہستی دونوں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کتاب میں دوسری قسم کے لوگ شامل ہیں۔

جلد دوم

# ملاقاتیں

الطاف گوهر

پاکستان بننے سے بہت پہلے میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد پڑھے لکھے شخص تھے۔ ان کی بہت بڑی لائبریری تھی۔ جب سکول جانے کی عمر ہوئی تو کنونٹنٹ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اسلامی سکولوں کی تعلیم اچھی تھی اور نہ ہی ماحول۔ تعلیم پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ہندو استاد مسلمان طالب علموں کو سائنس کے مضامین اور انگریزی نہیں رکھنے دیتے تھے جو طالب علم اصرار کرتا اسے کہتے یہ تمہارے بس کی بات نہیں تم گائے کا گوشت کھاتے ہو جس سے دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے تم عربی، اردو، فارسی اور ہسٹری کے مضامین رکھ لو۔ سکول میں پہلے روز جب ہندو استاد نے میرا نام ”الطاف حسین گوہر الرحمن“ پڑھا تو نفرت سے کہا میری جماعت میں تمہیں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوگی تم ہمیشہ کھڑے رہو گے۔ اسی ماحول میں میرے چھوٹے بھائی تجمل حسین اور میں نے خالصہ کالج گوجرانوالہ سے ایف۔ اے کیا۔ پھر بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ بی۔ اے کے بعد نوکری کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اس دور میں ہم کلرکی سے آگے نہیں سوچتے تھے کیونکہ پڑھے لکھے مسلمان کی اس سے آگے اپروچ نہیں تھی۔ اس بے روزگاری کے دور میں تین ماہ تک اپنی سن کالج میں فارسی پڑھاتا رہا جب وہاں سے چھٹی ہو گئی تو سوچا چلوفوج ہی میں بھرتی ہو جاتے ہیں چنانچہ سائیکل پر لاہور چھاؤنی میں بھرتی آفس چلا گیا۔ وہاں امیدواروں کی لمبی قطار لگی تھی۔ جس میں میں بھی کھڑا ہو گیا۔ باری آنے پر چڑا اسی نے میرا نام پکارا اور میں بھرتی آفیسر کے سامنے حاضر ہو گیا۔ انگریز کرنل نے میرے کاغذات پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ناگواری آ گئی۔ ”تم نے اتنے لمبے بال کیوں رکھے ہوئے ہیں؟“ میں ان دنوں ”گیسوراز“ ہوا کرتا تھا۔ میں نے کوئی جواب دیا لیکن انگریز میرے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا لہذا نوکری کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ مزید کچھ عرصہ دوڑ دھوپ کی لیکن

الطاف گوہر صاحب نے بڑی بھرپور زندگی گزاری وہ بیوروکریٹ تھے وہ پاکستان کے چھ سربراہان کے سیکرٹری رہے وفاقی سیکرٹری اطلاعات رہے لندن میں انگریزی کے اخبار کے ایڈیٹر رہے اور پاکستان میں وہ ”ڈان“ اور ”دی مسلم“ کے ایڈیٹر رہے۔ میری ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۹۴ء میں شروع ہوا وہ ان دنوں علیل تھے ان ملاقاتوں کے دوران میں نے ان سے ایک طویل انٹرویو کی درخواست کی انہوں نے میری یہ خواہش مان لی یوں میں نے ان کی زندگی کا طویل انٹرویو کیا۔ یہ محض ایک انٹرویو نہیں تھا۔ یہ پاکستان کی تاریخ بھی تھا یہ انٹرویو ۱۹۹۵ء میں بہت مشہور ہوا تھا۔ میں نے گوہر صاحب کی گفتگو آپ بیتی کے سائل میں تحریر کی۔ آپ یہ انٹرویو پڑھیے اور گوہر صاحب کے مشاہدات سے لطف لیجئے۔

ناکامی ہوئی تو ناچار گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ اب تعلیم بے کاری سے نجات کا ایک بہانہ تھی۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر اس دور میں مجھے کلرکی قسم کی کوئی نوکری مل جاتی تو میں کبھی کالج کا رخ نہ کرتا۔

ایم۔ اے انگریزی کے امتحان میں مسلمان طالب علموں میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ کچھ عرصہ کی بے کاری کے بعد اسلامیہ کالج میں لیکچرار ہو گیا۔ ۸۰ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ تھوڑے عرصے بعد آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسٹنٹ ہو گیا۔ اس کی تنخواہ ۱۲۰ روپے تھی۔ اس نوکری کا بڑا چرچا ہوا۔ لوگ مبارکبادیں دینے آتے تھے۔ پہلی تقرری پشاور ہوئی۔ پشاور آنے سے قبل میں نے انڈین سول سروسز کا امتحان دیا بعد ازاں پشاور میں مجھے انٹرویو کی کال ملی۔ انٹرویو دیا جس میں خوش قسمتی سے کامیاب ہو گیا۔ یوں میں ۱۹۴۶ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہو گیا۔ مدراس کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ٹریننگ کے بعد دہلی میں فنانس ڈیپارٹمنٹ میں میری پہلی تقرری ہوئی۔ اس دور میں میرا شمار مسلمانوں کے ان چند افسروں میں ہوتا تھا جو فنانس کو سمجھتے تھے۔ دہلی میں چودھری محمد علی ممتاز احسن اور انور علی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ چودھری محمد علی ان دنوں جوائنٹ سیکرٹری لیول کے افسر تھے اور ہم لوگ سیکشن آفیسر۔ ۱۱ اگست کو جب قائد اعظم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ کراچی تشریف لائے تو ہم لوگ استقبالی قطار میں کھڑے تھے۔ پاکستان کا پہلا فنانس ڈیپارٹمنٹ گورنر جنرل ہاؤس میں قائم ہوا۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد کرنسی نوٹوں اور سکوں کے ڈیزائن تیار کروانا سکے ڈھلوانا اور نوٹ چھپوانے کی ساری ذمہ داری میری تھی۔ ہم نے Brandbury Wilkinson کو نوٹ چھاپنے کا ٹھیکہ دیا۔ نوٹ چھپ کر آئے تو مجھے پاکستان کے پہلے کرنسی نوٹوں کے بکسوں کو بندرگاہ سے آرمی آرڈیننس ڈپو کے تہ خانے تک پہنچانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں رات بھر خوشی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح سویرے میں اپنے سینئر عبدالقادر کے پاس نوٹوں کے نمونے لے کر گیا تو وہ دیکھتے ہی برس پڑے۔ ”نوٹوں پر چاند غلط چھپ گیا ہے۔“ میں نے دیکھا اور لرز کر رہ گیا کیونکہ نوٹوں پر ہلال کے بجائے بدر کا چاند چھپ گیا تھا جو بہت بڑی بدشگونی تھی لہذا ہمیں تمام نوٹ ضائع کر کے دوبارہ چھپوانے پڑے۔

تخلیق پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد میرا تبادلہ مشرقی پاکستان ہو گیا جب ۵۴ء کے انتخابات ہوئے تو میں ہوم پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری تھا۔ الیکشن میں مولوی فضل حق کی

پارٹی اکثریت سے جیت گئی وہ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بن گئے ہمارا خیال تھا وہ مغربی پاکستان کے افسروں کو ہٹا کر اپنے بندے لگا دیں گے لیکن حلف لینے کے کچھ روز بعد فضل حق نے مجھے بلایا۔ میں ان کے گھر گیا تو وہ تہ بند بنیان میں ملبوس لکڑی کی کھات پر لیٹے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا۔ الطاف تم ہوم ڈیپارٹمنٹ میں اپنا کام بھی کرتے رہا کرو اور میرے سیکرٹری بھی بن جاؤ۔ میں بڑا حیران ہوا کیونکہ کسی بنگالی وزیر اعلیٰ کے ذاتی سیکرٹری کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے معذرت کی کوشش کی تو وہ کہنے لگے ہمارے پاس سر دست بندے نہیں ہیں تم عارضی طور پر یہ کام سنبھال لو۔ ناچار مجھے حامی بھرنا پڑی۔

مولوی فضل حق بلا کے مقرر تھے۔ بڑا مشہور واقعہ ہے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے جلسہ عام میں قرارداد پیش ہونا تھی۔ قائد اعظم تقریر کر رہے تھے پنڈال میں فضل حق تشریف لائے۔ ان کو دیکھتے ہی حاضرین نے شیر بنگال زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ قائد اعظم نے مجمع کی توجہ بدلتے دیکھی تو کہا۔ ”جب شیر آگیا تو مہینے کی کیا ضرورت ہے۔“ اور تقریر ادھوری چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب مجمع کے نباض تھے وہ فوراً لوگوں کی ضرورت بھانپ لیتے تھے اور اس کے بعد وہ زمانے دار تقریر کرتے کہ لوگ آپ سے باہر ہو جاتے۔ ان کے ساتھ کام کے دوران مجھے ذاتی طور پر بڑے دلچسپ تجربات ہوئے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ ٹکٹ گئے وہاں لوگوں سے خطاب کے دوران انہیں محسوس ہوا لوگ پاکستان کی حمایت کی بات نہیں سننا چاہتے انہوں نے فوراً میئر ابدلا اور دو قومی نظریہ کے خلاف تقریر جھاڑ دی۔ دوسرے روز مجھے بلایا اور پوچھا۔ تقریر کا کیا اثر ہوا۔ میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا بڑا اثر پڑا ہے۔ انہوں نے فحاشی سے کہا تم نے میری طرف سے تردید کیوں نہیں کی؟ میں بھونچکا رہ گیا پھر انہوں نے مجھے سمجھایا تم میری باتوں پر دھیان نہ دیا کرو دوسرے روز تمہیں جو بات غلط لگے اس کی فوراً تردید شائع کر دیا کرو۔

شاہ سعود کو بنگال کا دورہ کرنا تھا۔ ہم اس کے استقبال کے لئے بڑی تیاریاں کر رہے تھے۔ دورے سے چند روز پہلے سیلاب آگیا۔ بنگال کے سیلاب سے جہاں وسیع پیمانے پر تباہی آئی ہے وہاں عوام کے موڈ بھی تبدیل ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے محلہ سرداراں کے لوگوں نے اعلان کر دیا ہم شاہ سعود کا استقبال نہیں کریں گے۔ یہاں لاکھوں آدمی مر گئے ہیں اور حکومت نمائندوں پر لاکھوں روپے ضائع کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ صورتحال خراب ہو گئی۔ فضل حق نے مجھے بلایا اور کہا کہ اب کیا ہوگا۔ میں نے کہا ظاہر ہے دورے کا پروگرام تو تبدیل نہیں ہو سکتا۔ شاہ سعود تو

کراچی پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچا اور پھر مجھے حکم دیا تم محلہ سرداراں کے لوگوں کو کل سہ پہر تین بجے میرے گھر بلا لو۔ میں نے محلہ سرداراں کے لوگوں کو دعوت دی۔ اگلے روز مقررہ وقت پر شیر بنگال کے گھر لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ ہر شخص دورے کے خلاف رائے دے رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی شیر بنگال دھوتی بنیان میں ملبوس کھات پر بیٹھے تھے جب شور مچا قابل برداشت ہو گیا تو وہ اٹھے اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھتے ہی سناٹا طاری ہو گیا ہم سب ہکا بکارہ گئے اب وہاں صرف شیر بنگال کی چیخیں تھیں۔ آنسو اور سسکیاں تھیں اور ہم لوگوں کی حیرت تھی۔ جب سارا مجمع ان کی طرف متوجہ ہو گیا تو پھر شیر بنگال بولے۔ ”بد بختو آج والی کعبہ میرے گھر آ رہے ہیں۔ میرے پیارے رسول کی چوکھٹ کا دربان آ رہا ہے اور میری بد قسمتی دیکھو فضل حق اس کا استقبال نہیں کر سکتا۔ لوگو! بتاؤ جب کل فضل حق بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوگا تو اپنے رب کو کیا منہ دکھائے گا۔ لوگو! ہم سب جہنمی ہیں۔“ ان کے الفاظ میں ایسا درد تھا کہ پورے مجمع نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور پھر انہوں نے وہ زناٹے دار تقریر کی کہ خدا کی پناہ۔ مجھے ان کے وہ الفاظ تو یاد نہیں لیکن وہ نعرے میرے حافظے کی کتاب میں آج بھی درج ہیں جو بنگالیوں نے وہاں شاہ سعود کی شان میں لگائے تھے۔ جب لوگ مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو چلے گئے تو شیر بنگال مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہا کیوں حضرت؟ اور میرے پاس اس جادوگری کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں تھے۔

اور مئی ۵۴ء کی ایک گرم شام ڈھاکہ کی گلیوں میں سکندر مرزا کی آمد کی خبر گونج رہی تھی۔ فضل حق کو عندا قرار دے کر اس کی حکومت برطرف کی جا چکی تھی اور سکندر مرزا کو گورنر بنا کر مشرقی پاکستان بھجوایا جا رہا تھا۔ جنرل کے ایم شیخ مشرقی پاکستان کے کمانڈر تھے وہ مجھے بار بار بلاتے اور بار بار کہتے سکندر مرزا کے آتے ہی ہم فلاں کو پکڑیں گے فلاں کو ماریں گے اور میں صرف سر ہلا کر رہ جاتا تھا۔ پھر ہم نے ڈھاکہ ایئر پورٹ پر مشرقی پاکستان کے نئے گورنر سکندر مرزا کا استقبال کیا۔ وہ آئے ہمیں دیکھا ہیلو ہائے کی اور گورنر ہاؤس چلے گئے اس شام ہمیں گورنمنٹ ہاؤس طلب کیا گیا۔ ہم لوگ ”مائک ہاؤس“ پہنچ گئے اور گورنر کے بیڈروم کے باہر بیٹھ گئے۔ ڈی آئی جی انوار الحق، این ایم خان اور میں اس نیم تاریک کمرے میں بڑی دیر تک دم سادھے بیٹھے رہے۔ وہاں صرف وال کلاک کی ٹک ٹک تھی اور ہماری سہمی سہمی ڈری ڈری سانسوں کی آواز تھی۔ پھر اچانک سلیٹی رنگ کا پردہ ہٹا اور سکندر مرزا اندر آ گئے۔ ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ وہ سرخ گاؤں

میں ملبوس تھے۔ انہوں نے بغیر وقت ضائع کئے حکم دیا۔ ”کل صبح چھ بجے پندرہ سو غنڈوں کو اندر کر دیا جائے“ انہوں نے حکم دیا اور اندر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انوار الحق نے پندرہ سو کو بنگال کے ۷۷ اضلاع سے تقسیم کیا تو ۴۴ بچ گئے۔ وہ پریشان ہو گئے ہم نے مشورہ دیا میمن سنگھ بڑا ضلع ہے یہ چار اس کے کھاتے میں ڈال دو۔ میری ڈیوٹی تھی کہ میں تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فون کر کے اطلاع کروں۔ اگلی صبح گورنر صاحب کے حکم کی بجا آوری ہو گئی۔ انہوں نے سنا اور کہا۔ ”گڈ ہم لوگ خوش ہو گئے لیکن آپ پوچھیں گے کہ پکڑے جانے والے لوگ کون تھے ان میں اکثریت ان رکشے والوں ریڑھی بانوں اور پیدل چلنے والوں کی تھی جو بد قسمتی سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ حضرات کے ہتھے چڑھ گئے۔“

جنرل سکندر مرزا بڑے سخت آدمی تھے وہ حکم دینا اور پھر اس پر عملدرآمد کرانا جانتے تھے۔ لیکن وہ عام آدمی کو تنگ نہیں کرتے تھے۔ وہ ساڑھے تین ماہ بنگال رہے اس دوران انہوں نے حالات بالکل درست کر دیئے۔ اس دوران ان سے بڑی ملاقاتیں رہیں وہ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ مغربی پاکستان واپسی کے بعد انہوں نے غلام محمد کی چھٹی کراچی۔ خود گورنر جنرل بن گئے اور حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اس دوران انہوں نے مجھے بنگال سے بلا کر کراچی کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لگا دیا۔ این ایم خان چیف کمشنر تھے۔

سکندر مرزا جو نیر افسروں پر دباؤ نہیں ڈالتے تھے۔ بات مان لیتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش گاہ ۷۰ کلخٹن کے سامنے ایران کا سفارتخانہ تھا جس کے سامنے بچوں کا ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ ایک دن چیف کمشنر این ایم خان نے مجھے بلا کر کہا ”گورنر جنرل یہ پارک ایران ائمہ ہنسی کو دینا چاہتے ہیں تم آرڈر کرو۔“ میں نے کہا ”یہ پارک بچوں کے لئے ہے وہاں وہ کھیلتے ہیں یہ زیادتی ہوگی لہذا میں آرڈر نہیں کروں گا۔ آپ بحیثیت چیف کمشنر احکامات جاری کر دیں۔“ این ایم خان نے کہا ”نہیں تم ہی آرڈر کرو“ میں نے انکار کر دیا۔ چند روز بعد مجھے سکندر مرزا نے گورنر جنرل ہاؤس میں طلب کیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ ان میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھ شامل کر لیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔ ”کیا وہ بچوں کے پارک کے سلسلے میں کوئی پرائیلم ہے؟“ میں نے انہیں ساری بات بتائی تو کہنے لگے۔ ”ہاں اس صورت میں یہ پارک ایران ائمہ ہنسی کو دینا مناسب نہیں۔“ یہ ان میں خوبی تھی کہ وہ نہ صرف بات سمجھ لیتے تھے بلکہ مان بھی لیتے تھے ورنہ گورنر جنرل کے سامنے ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اصول کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

سکندر مرزا ادا کے سازشی تھے۔ جمہوریت کے سخت خلاف تھے۔ جوڑ توڑ کے بہت ماہر تھے۔ میں جب بھی جمہوریت کی بات کرتا سخت غصے میں آ جاتے اور کہتے۔ یہ تم کیا کہتے رہتے ہو تمہاری ساری تھیوری غلط ہے، بکواس ہے وہ لوگوں کو حقوق دینے کے خلاف تھے۔ ۵۶ء کے آئین کو انہی نے چلنے نہیں دیا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بہت ایماندار تھے۔ جب ایوب خان نے انہیں برطرف کیا تو گورنر ہاؤس چھوڑنے سے پہلے انہوں نے تمام بل کسٹر کئے۔ نوکروں کو تنخواہیں دیں۔ ان دنوں ان کے ایک ملازم کی تازہ تازہ شادی ہوئی تھی۔ انہوں نے جلاوطن ہونے سے پہلے اسے تختہ دیا۔ بعد ازاں جب وہ کوئٹہ میں دو تین ہفتے قید رہے تو وہاں سے واجبات کی ادائیگی کے لئے ۷۰ ہزار روپے بھیجے۔ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران انہوں نے شہر سیدہ بنائی اور نہ کوئی مالی فائدہ اٹھایا۔ وہ لندن گئے اور باقی زندگی انہوں نے ایک ہوٹل میں نوکری کر کے گزار دی۔

جب میں کراچی کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا تو شہر کی صورت حال بڑی خراب تھی۔ مافیا پرورش پارہا تھا۔ جھوٹے کلیم جمع کرا کر زمینیں حاصل کی جا رہی تھیں۔ کالونیوں پر قبضے ہو رہے تھے اور جسے وصول سے جا رہے تھے۔ ان دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا چلوں۔ جب میں پہلی مرتبہ کراچی کورٹ گیا تو وہاں ۴۴ مجسٹریٹ بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا یہ لوگوں کے کلیمز کی تصدیق کرتے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں انہیں گھور کر دیکھنے لگا۔ میں اس دوران ایک مجسٹریٹ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس نے جب مجھے اوپر کھڑے دیکھا تو زار و قطار رونے شروع کر دیا۔ میں گھبرا گیا اور اسے چپ کرانا شروع کر دیا بعد ازاں اس نے انکشاف کیا وہ نابینا ہے اور اس کی معذوری کو دیکھتے ہوئے میرے پیش رو نے اسے مجسٹریٹ بنادیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تم کلیم کی تصدیق کیسے کرتے ہو؟ اس نے بتایا میں نے ایک پچہ رکھا ہوا ہے وہ کلیم پڑھ کر سنا دیتا ہے اور میں تصدیق کر دیتا ہوں۔ میں نے سب کی چھٹی کرا دی جس پر چیف جسٹس نے میری بڑی تعریف کی کیونکہ غلط تصدیقوں سے بڑے جھگ تھے۔

مجھے ان دنوں وزیراعظم حسین شہید سہروردی کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا۔ وہ بڑے مزے کے آدمی تھے۔ بہت پڑھے لکھے ذہین بات کو سمجھنے والے اور بلا کے مقرر وہ دن رات دیوانوں کی طرح کام کرتے تھے۔ وہ رات کو بالکل نہیں سوتے تھے لیکن کابینہ کے اجلاس میں سو جاتے تھے یا کسی سے بات کرتے کرتے سو جاتے تھے لیکن میں نے انہیں کبھی بستر پر لیئے نہیں

دیکھا۔ رات کو بارہ ایک بجے ان کا فون آ جاتا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب آپ کو خبر ہے شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ میں کہتا نہیں سر میں تو سو رہا تھا۔ وہ کہتے ظاہر ہے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سو رہے ہوں گے تو یہ تو ہوگا اور میں بھاگا بھاگا وزیراعظم ہاؤس جاتا مگر اس وقت تک شکایت رفع ہو چکی ہوتی اور سہروردی صاحب سب کچھ بھول بھال کر گپیں بانگ رہے ہوتے۔

سہروردی ملتان میں جلسہ عام سے خطاب کرنا چاہتے تھے۔ جماعت اسلامی کے ہاتھ ملیا میں کسی خاتون کے ساتھ سہروردی کے ڈانس کی ایک تصویر چڑھ گئی۔ انہوں نے اس کے بڑے بڑے پوسٹر بنائے اور شہر بھر میں لگا دیا۔ نوائے وقت نے سہروردی کے خلاف خبریں لگانا شروع کر دیں۔ ایک روز سہروردی نے مجھے بلایا اور کہا۔ تم اپنے سول سروس کے دوستوں سے پوچھو مجھے ملتان جانا چاہیے یا نہیں؟ میں نے ملتان کی انتظامیہ سے رابطہ کیا انہوں نے بتایا یہاں سہروردی کے خلاف بڑی نفرت پائی جاتی ہے۔ انہیں کہیں یہاں آنے کی غلطی نہ کریں ہمیں نہیں امید وہ ڈانس تک بھی پہنچ پائیں گے۔ میں شام کو وزیراعظم ہاؤس گیا اور انہیں ساری صورتحال بتا دی۔ انہوں نے کہا۔

"So tell your friends, the Hussain Shaheed will be there tomorrow at 3, o' clock"

اور اگلے روز وہ ملتان پہنچ گئے۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ لوگ شور کر رہے تھے ان کے خلاف نعرے لگ رہے تھے لیکن جب انہوں نے تقریر شروع کی تو ان کی اردو اس قدر شستہ اور بلیغ تھی کہ مجمع قوت گویائی کھو بیٹھا مجھے یاد ہے جب تقریر ختم ہوئی تو لاکھوں کا وہ مجمع ان کے ساتھ تھا۔ دوسرے روز سارے اخبارات نے ان کی تقریر کو بڑا سراہا۔

اسی دور میں نہرو سیر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا سکندر مرزا اور حسین شہید سہروردی نے اپنی احقانہ پالیسی کے باعث عوام کو اپنے خلاف کر لیا۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن نے کراچی میں بہت بڑا جلوس نکالا۔ مجھے حکم دیا گیا میں طلباء کو کنٹرول کروں۔ جلوس نے برٹش ہائی کمیشن کی طرف سو کرنا شروع کر دیا۔ ہم لوگ راستے میں کھڑے ہو گئے۔ جلوس کے قائدین کو زبانی کلامی سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ ناچار مجھے لاکھی چارج اور آنسو گیس کا حکم دینا پڑا لیکن جلوس نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ میرے ذہن میں اچانک ایک سکیم آئی میں نے میگافون پر جلوس سے خطاب کرنا شروع کر دیا میں نے ان سے کہا تم اگر حملہ کرنا چاہتے ہو تو برٹش ہائی کمیشن کے بجائے وزیراعظم ہاؤس پر کرو۔ جاؤ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ وزیراعظم ہاؤس کو گھیر لو۔ جہوم

نے نعرے لگائے اور وزیراعظم ہاؤس کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں دوسرے راستے سے فوراً وزیراعظم ہاؤس پہنچ گیا۔ سہروردی ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے تھے ان کے چند عزیز رشتے دار آسو گیس کے شیل دکھا دکھا کر بتا رہے تھے تمہارے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے آج عوام پر بڑا ظلم کیا ہے مجھے دیکھ کر وہ اٹھے اور مجھے برآمدے میں لے جا کر پوچھا "کیا ہوا؟" میں نے ساری کارروائی بتادی اور آخر میں ان سے عرض کیا "اب وہ لوگ وزیراعظم ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے آ رہے ہیں۔" انہوں نے کہا "مرواد دیا یا۔ اب کیا ہوگا؟" میں نے کہا "جناب ہونا کیا ہے آپ جلوس سے خطاب کریں۔" انہوں نے کہا "ٹھیک ہے آنے دو انہیں" اور پھر انہوں نے جلوس کے سامنے ایک گھنٹہ تقریر کی۔ لوگوں نے گالیاں دیں نعرے لگائے لیکن وہ میگافون پر ڈٹے رہے اور آخر کار مجمع ہار گیا اور سہروردی جیت گئے۔

۲۵ دسمبر کو قائداعظم کے یوم پیدائش کے موقع پر مسلم لیگ نے مجھ سے جہانگیر پارک میں جلسے کی درخواست کی میں نے منظوری دے دی۔ دوسرے روز حسین شہید سہروردی کی پارٹی عوامی لیگ نے بھی جہانگیر پارک میں جلسے کی اجازت طلب کر لی۔ میں نے انکار کر دیا۔ پارٹی رہنماؤں نے کہا تم اپوزیشن کو روٹنگ پارٹی پر فوقیت دے رہے ہو۔ میں نے کہا "جناب! فرسٹ کم فرسٹ" والا معاملہ ہے وہ لوگ پہلے آئے تھے۔ عوامی لیگ کو میری یہ دلیل بُری لگی اور وہ سہروردی کے پاس چلے گئے لیکن انہوں نے مجھے طلب نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کی وضاحت مانگی۔ تاہم چند روز بعد سرکاری نوٹ آ گیا کہ وزیراعظم ۲۴ دسمبر کو ڈھاکہ جا رہے ہیں۔ ہم ۲۴ دسمبر کی شام مارڈی پور ایئر پورٹ پر انہیں رخصت کرنے کے لئے پہنچے تو انہوں نے مجھ سے ہاتھ نہ ملایا۔ بعد ازاں ان کا اے ڈی سی آیا اور مجھ سے کہا تمہیں وزیراعظم نے طلب کیا ہے۔ میں جہاز میں چلا گیا وہ پاجامہ پہن رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔ Who are you? میں نے کہا Sir I am District Magistrate. you know کہا ہوئے تھے ہندوستان میں پانچامہ باندھتے ہوئے کہا why P.M. is leaving for Karachi and going to Dhaka. میں نے کہا۔ Sir, I don't know تو کہنے لگے۔ because you have refused to allow main public ground to his party to hold the meeting. Therefore, he must leave the city Sir, but they and you are responsible for this.

came first وہ نفرت سے بولے، technicality اور اس کے بعد انہوں نے مجھے جہاز سے اتارا اور خود ڈھاکہ چلے گئے۔ یہ اس کے کردار کی خوبی تھی کہ وہ خود شہر چھوڑ کر چلا گیا لیکن اس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فیصلہ بدلنے کا حکم نہیں دیا بصورت دیگر وزیراعظم کے سامنے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فیصلے کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔

حسین شہید سہروردی کی ایک اور عجیب عادت تھی۔ کراچی میں جو بھی پوسٹ خالی ہوتی..... وہ مجھے اس کا ایڈیشنل چارج دے دیتے۔ ایک روز انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کراچی میونسپل کارپوریشن کی حالت بہت خراب ہے پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔ تمہاری فنانس کی بیک گراؤنڈ ہے تم فوراً اس کا چارج بھی لے لو۔ میں نے کہا جناب یہ میرے لئے ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا "اچھا چند ہفتوں کے لئے تو اسے اپنے پاس رکھو" میں نے کہا "جی اچھا۔"

چین کے ساتھ تعلقات کا آغاز سہروردی کا بہت بڑا کمال تھا۔ اس نے سکندر مرزا کی مخالفت کے باوجود چواین لائی کو پاکستان کے دورے کی دعوت دے دی۔ پاکستانیوں نے چینی رہنماؤں کی آمد پر بڑی خوشیاں منائیں۔ جب چواین لائی ایئر پورٹ پر اترے تو وہاں اس کے استقبال کے لئے لاکھوں لوگ موجود تھے۔ امریکی اور برطانوی سفیروں نے اس استقبال پر بڑا احتجاج کیا۔ سکندر مرزا پریشان ہو گیا۔ سہروردی نے مجھے بلایا اور حکم دیا۔ استقبالیہ کی صدارت تم کرو گے۔ میں حیران ہوا تو وہ کہنے لگے "تم میسر ہو میونسپل کارپوریشن کا چارج تمہارے پاس ہے لہذا پبلک ریسپنشن کی صدارت تمہارا فرض ہے۔" ناچار مجھے ہامی بھرنا پڑی پھر جب میں خطبہ استقبالیہ کے لئے کھڑا ہوا تو وزیراعظم سامنے عوام میں بیٹھے تھے اور میں سٹیج پر کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ میری وہ تقریر اشتراکی نظریات کے بہت قریب تھی۔ میں نے اقبال کا وہ شعر بھی پڑھ دیا کہ

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی

اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

میری اس تقریر کا امریکیوں نے بڑا سخت نوٹس لیا۔

ہم نے اس تقریب میں ایلو مینیشن کا انتظام بھی کیا ہوا تھا۔ پروگرام تھا کہ جوں ہی چائے ختم ہوگی۔ ہال کی تمام بتیاں جل اٹھیں گی لیکن بد قسمتی سے چائے چند منٹ پہلے ختم ہو گئی میں گھبرا گیا اور بے وقوفوں کی طرح بتیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چواین لائی میری پریشانی بھانپ کر میرے قریب آئے اور کہا

"Is there any problem?"

میں نے کہا سر! ہم نے لائسنس کا انتظام کیا ہوا ہے وہ فوراً اپنی نشست پر واپس بیٹھ گئے اور کہا۔ We will wait پھر چند سیکنڈ بعد ہال کی ساری بتیاں جگمگا اٹھیں اور شرکاء نے بے اختیار تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ اسی طرح میں پاکستان کا پہلا شخص تھا جسے معلوم ہوا کہ چوایں الٹی انگریزی جانتے ہیں اور سہروردی پاکستان کے پہلے حکمران تھے جنہیں پاک چینی دوستی کی اہمیت کا احساس تھا۔

سہروردی اپنی تمام تر جرأت اور ذہانت کے باوجود سکندر مرزا کے زیر اثر تھے۔ جب وہ چین کے دورے پر گئے تو واپسی پر سکندر مرزا نے ان کے خلاف جلوس نکلوادیا میں نے انہیں ایئر پورٹ پر ریسیو کیا۔ انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔ الطاف یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے انہیں مشورہ دیا آپ فوری طور پر ایکشن گرا دیں ورنہ یہ لوگ آپ کو فارغ کر دیں گے۔ انہوں نے نفی میں سر ہلادیا مجھے آج تک افسوس ہے سہروردی نے میرے مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور وہ آخری وقت تک سکندر مرزا پر تکیہ کرتے رہے۔

مجھے وزیراعظم کی حیثیت سے سہروردی کا آخری دن یاد ہے۔ وہ لاہور گئے اور ری پبلکن پارٹی کے خلاف تقریر جھاڑ دی۔ واپس کراچی آئے تو ماحول بدلا ہوا تھا۔ استقبال کے لئے صرف دو چار آدمی تھے۔ میں نے گاڑی میں ان سے کہا جناب یہ آپ نے کیا کیا؟ وہ کہنے لگے "میں تمہیں نہیں پتہ۔" میں دوسرے روز وزیراعظم ہاؤس گیا تو وہ آنکھیں بند کر کے صوفے پر بیٹھے تھے اور وزراء ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ چیخ رہے تھے بتاؤ سکندر مرزا سے کیا بات ہوئی؟ اب کیا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ مجھے لے کر برآمدے میں چلے گئے اور میرے کان میں سرگوشی کی "سکندر مرزا نے مجھے بلا کر کہا ہے۔ تم استعفیٰ دو گے یا میں تمہارے خلاف عدم اعتماد کرا دوں۔" میں نے استعفیٰ دے دیا۔ اب تم میرا سامان وغیرہ پیک کرا دو۔

ایوب خان کا مارشل لا لگا تو میں لاہور سے ڈھاکہ جا رہا تھا۔ یہ شاید جنوری یا فروری ۵۹ء کی بات ہے۔ میں ایئر پورٹ کے وی۔ آئی۔ پی روم میں داخل ہوا تو وہاں متعدد دفوجی جرنلز کھڑے تھے ایک کونے میں سہروردی کرسی پر آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہو گیا انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کہا۔

Altaf! tell me how has this martial Law regime

acquired the reputation of corruption such time?

میرے پسینے نکل گئے۔ مگر انہوں نے اسی اطمینان سے دوبارہ آنکھیں بعد کر لیں۔ بعد ازاں جہاز میں تمام جہاز ایک ایک کر کے ان کے پاس جاتے رہے اور نہایت ادب سے ان سے ملتے رہے۔ میری ان سے آخری ملاقات چٹاگانگ ایئر پورٹ پر ہوئی تھی۔ میں ڈھاکہ جا رہا تھا۔ ان سے اپنا ٹکٹ ملاقات ہو گئی۔ ہم دونوں کی منزل ایک تھی۔ جہاز میں خرابی کے باعث ہمیں دو گھنٹے وہاں رکنا پڑا۔ ہم دونوں ایئر پورٹ کی چھت پر چلے گئے۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے مجھے اپنی زندگی کی ساری کہانی سنائی اور آخر میں کہا۔ الطاف اب میں نہرو کے پاس جا رہا ہوں کیونکہ تقسیم کی ساری سکیم ہی ٹھٹھی۔ اب ہم سارے علاقے کو لسانی بنیادوں پر از سر نو تقسیم کریں گے کیونکہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اس ملاقات کے بعد وہ پوری دنیا کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ دنیا تو ان کے فارمولے کے مطابق تقسیم نہ ہوئی مگر وہ راستے ہی میں گم ہو گئے۔

حسین شہید سہروردی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ڈرتے نہیں تھے ڈرتے نہیں تھے دشمنوں کے خلاف کارروائی نہیں کرتے تھے۔ اقتدار میں رہتے ہوئے انہوں نے کبھی فضل حق اور بھاشانی کے خلاف کارروائی نہیں کی۔ انہیں اقتدار سے الگ ہونے کا افسوس نہیں تھا۔ ایوب خان ان سے بہت خائف تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا وہ سہروردی کو خرید سکیں گے اور نہ ہی ڈرا پائیں گے۔ سکندر مرزا نے ایوب کی مخالفت کے باوجود انہیں وزیراعظم بنایا تھا اور وہ سکندر مرزا کے خوف کے باوجود اپنی من مانی کرتے رہے تھے۔ وہ عملی اور فنی سیاست سے مکمل آگاہ تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی کوئی جائیداد تھی نہ ہی کوئی بینک بیلنس۔

وہ بیروت میں فوت ہوئے تھے ان کے لواحقین۔ پاس ان کی نعش تک لانے کی رقم نہیں تھی وہ اقتدار میں آنے سے پہلے نیکیوں پر سفر کرتے تھے ہونٹوں میں دہتے تھے اور ریزہ ریزہ سے کھانا کھاتے تھے اقتدار سے فارغ ہونے کے بعد بھی ان کی یہی صورت حال تھی۔ وہ جب وزیراعظم ہاؤس سے نکلے تھے تو ہمارے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہم ان کا سامان کہاں بھیجیں کیونکہ پورے کراچی میں ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بڑے عرصے تک ان کا سامان ان کے مختلف دوستوں کے گھروں میں پڑا رہا ان کا کام کرنے کا طریقہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ ان کے کمرے میں دو سنگل بیڈ ہوتے تھے ایک بیڈ پر وہ نیم دراز ہو جاتے تھے ہم ساری فائلیں بیڈ پر ان کے پاس رکھ دیتے تھے۔ وہ فائل دیکھتے اور اسے دوسرے بیڈ کی طرف اچھال دیتے دوسرے روز

بقی فائلیں دوسرے بند پر ہوتیں ان کا مطلب ہوتا "ہیں" اور جتنی نیچے فرش پر پڑی ہوتیں وہ نامنظور ہو چکی ہوتیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فائلیں پڑھتے نہیں تھے وہ نہ صرف فائلوں کا بغور مطالعہ کرتے تھے بلکہ انہیں تمام فائلیں یاد ہوتی تھیں۔ اگر کسی روز ان کا عملہ منظور ہونے والی کسی فائل کو نامنظور ہونے والی فائلوں میں ڈال دیتا یا نامنظور ہونے والے کیس کے سلسلے میں منظوری کا خدا جاری کر دیتا تو وہ فوراً پکڑ لیتے تھے۔

حسین شہید سہروردی کے بعد ملک فیروز خان نون وزیراعظم بنے۔ انہوں نے چند روز بعد مجھے طلب کیا۔ میں حاضر ہو گیا انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔ "اوتے مینو کہندے سن توں بڑا سوہنا وے پر توں تے ایویں ای اے (وہ مجھے کہتے تھے تم بڑے خوبصورت ہو لیکن تم تو یونہی سے ہو۔) میں ہنس کر رہ گیا بعد ازاں انہوں نے مجھے اپنا ڈپٹی سیکرٹری رکھ لیا۔ نون کا دور سازشوں جوڑ توڑ اور ہنگاموں کا دور تھا۔ مجھے ان کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا وہ مجھ سے بڑی شفقت کرتے تھے۔

ان کے ساتھ کام کرنا بہت اچھا لگا۔ وہ دور لٹائل سے بھر پور تھا مثلاً ملک فیروز خان نون کے پاس لیبر لاکا ایک ماہر انگریز آیا اور انہیں لیبر قانون کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ انہوں نے انگریز کو ٹو کا اور کہا۔ No this is not law اس نے کہا۔ مریہ قانون ہے تو وہ چلائے۔ Rubbish, I say this is not law اور مجھے حکم دیا "اسے لے جاؤ اور اسے سمجھاؤ" میں انگریز کو اپنے کمرے میں لے گیا اور کہا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں وزیراعظم کو سمجھاؤں گا۔" بعد ازاں میں وزیراعظم کے دفتر گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ کہنے لگے تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا۔ میں نے کہا جناب میں اس کے سامنے کیسے کہہ سکتا تھا کہ آپ غلط ہیں۔ انہوں نے تھوڑا سوچا اور کہا۔ میں جب بھی غلط بات کہوں تم اپنے کان کی لومسنا شروع کر دیا کرو۔ میں فوراً سمجھ جاؤں گا۔ اس روز کے بعد کان کی لومسنا میری سرکاری ذمہ داری ہو گئی میرے ساتھی اکثر حیران رہتے تھے کہ میں وزیراعظم کی موجودگی میں کان کی لومسنا سنا رہتا ہوں۔ دوسری طرف جوں ہی میرا ہاتھ کان تک پہنچتا وزیراعظم فوراً اپنا موقف تبدیل کر لیتے۔

وزیراعظم لاہور آئے تو ان کا ایک پرانا ساتھی شریف میرے پاس آیا۔ (یہ بعد ازاں سیکرٹری ایجوکیشن بنے تھے) اور ملک صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں اسے

وزیراعظم کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ آدھا گھنٹہ بعد شریف غصے میں باہر نکلا۔ ملک فیروز خان نون اس کے پیچھے پیچھے تھے اور زور زور سے کہہ رہے تھے۔ "شریف روٹی کھا جا میری روٹی وچ نون نہیں ہوتا۔" (شریف کھانا کھا جاؤ میرے کھانے میں نمک نہیں ہوتا۔) میں نے معاملہ پوچھا تو کہنے لگے "شریف مجھے کہہ رہا تھا مجھے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیئرمین بنادو۔ میں نے کہا شریف تم اس کے لئے کوئی فائی نہیں کرتے تو کہنے لگا جناب آپ وزارت عظمیٰ کے لئے کوئی فائی کرتے ہیں؟"

ایک روز مجھے بلا کر کہنے لگے "یار یہ پطرس بخاری عجیب آدمی ہے۔ میں نے اسے اپنی کتاب "فرام میوری" پڑھنے کے لئے دی دو تین ہفتے بعد پوچھا کیسی ہے تو کہنے لگا جناب بڑی شاندار کتاب ہے بس اگر اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے تو کیا بات ہے۔ لو تم بتاؤ۔۔۔ انگریزی کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کا مشورہ دے رہا ہے۔"

جب دورے پر جاتے تھے تو میں ریل گاڑی میں ان کے سیلون میں بیٹھتا تھا اور ناشتے کے بعد انہیں فائلیں پڑھ پڑھ کر سنا تا تھا جس کے بعد وہ مجھے آڈر لکھواتے تھے۔ میں فائل اوٹھی آواز میں پڑھتا تھا۔ بعض اوقات لیڈی نون بول پڑتیں۔

Darling you must not agree with this, this is a bad proposal.

تو وہ پنجابی میں کہتے۔ "بولن دے سو" لیکن وہ فیصلہ ہمیشہ درست کرتے تھے۔ انہوں نے قتل کے مقدمہ میں کبھی رعایت نہیں کی ان کا ہمیشہ وہی فیصلہ ہوتا تھا جو عدالت کرتی تھی خواہ کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ہو۔

رات کو جب ناؤ نوش کی محفل جیتی یا انہیں دوست احباب گھیر لیتے اور ان سے زبردستی احکامات جاری کرانے کی کوشش کراتے تو ان حالات میں جاری ہونے والے احکامات کے بارے میں مجھے ہدایت تھی کہ ان پر ہرگز عملدرآمد نہ کروں۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے وزیراعظم ہاؤس طلب کیا گیا۔ میں حاضر ہوا وہاں مظفر علی قزلباش بیٹھے تھے وہ شکایات کر رہے تھے۔ فلاں افسر تنگ کر رہا ہے اس کا تبادلہ کر دیا جائے۔ فلاں کو فلاں جگہ لگا دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ملک صاحب نے مجھے حکم دیا ان سب کے نام لکھو اور فوری طور پر آڈر جاری کرو۔ جسٹ ناؤ۔ میں نے کہا۔ یس سر۔ باہر آیا اور گھر جا کر اطمینان سے سو گیا۔ دوسرے روز دس بجے دفتر آیا تو انہوں نے پوچھا

رات کے احکامات کا کیا بنا۔ میں نے کہا ”کچھ بھی نہیں“ انہوں نے ممنوعیت سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے ”تھینک یو۔ مگر اس قسم کی کارروائیوں سے مشہور ہو گیا وزیراعظم تو آرڈر دے دیتے ہیں سیکرٹری شراست کر جاتا ہے لیکن میں جانتا تھا یہ سب کچھ میری سرکاری ڈیوٹی کا حصہ ہے۔“

وہ مجھے ایک بار اپنی زمینوں پر سرگودھا لے گئے۔ صبح ناشتے کی میز پر مجھے سرخ شرٹ میں ملبوس دیکھا تو کہنے لگے۔ ”بالشک یو آر لوکنگ کیونسٹ“ پھر ان کی حس مزاح پھڑک اٹھی اور زمینداروں کے قصے سننے لگے۔ کہنے لگے پہلے جہاں آج لاہور کا واپڈا ہاؤس ہے وہاں پاکستان بننے سے پہلے بیٹلز ہاؤس ہوتا تھا۔ یہ انگریز ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ تھی۔ ہر سال یکم جنوری کو ہم پنجاب کے سارے زمیندار پکڑ باندھ کر کھلے لگا کر شراب اور پھلوں کی ٹوکریاں لے کر ڈپٹی کمشنر کو نئے سال کی مبارکباد دینے جاتے۔ ہندو سکھ اور مسلمان زمیندار سب نو بجے ٹھن میں شامیانوں کے نیچے جمع ہو جاتے۔ اندر ڈپٹی کمشنر صاحب شراب پی کر سوتے ہوتے اور ہم باہر کھڑے انتظار کرتے رہتے کہ وہ انھیں اور ہم انہیں مبارکباد دے کر اجازت لیں۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب صاحب بہادر کا چیرا اسی چلتا اٹھا کر باہر آتا اور کہتا۔ ”صاحب بوالاسلام ہو گیا۔“ اور ہم خوشی سے ایک دوسرے کو گلے لگاتے ”مبارکباد دیتے“ شراب اور پھلوں کی ٹوکریاں وہاں چھوڑتے اور واپس آ جاتے ہماری انگریز کے سامنے یہ اوقات تھی۔ ہم لوگ تو آخر وقت تک انگریز کے غلام تھے۔ ہم زمینداروں نے انہیں بڑا سمجھا یا حضور آپ لوگ واپس نہ جائیں ہم پر مہربانی کریں لیکن وہ نہ مانے۔ ہم نے ۴۶ء کے آخر میں مسلم لیگ کو سپورٹ کرنا بھی شروع کر دیا لیکن ہم اندر سے انگریز سے بہت ڈرتے تھے۔

گوادر اور بیرو باری کی پاکستان میں شمولیت ملک فیروز خان نون کا کارنامہ تھا۔ بیرو باری مشرقی پاکستان کے ضلع ٹھاکرگاؤں کا حصہ تھا۔ تقسیم کے دوران بیرو باری بھارت اور اس کے ارد گرد کا علاقہ پاکستان کو دے دیا گیا۔ اس تقسیم سے جغرافیائی مسائل بن گئے۔ نون نے بیرو باری کا ذکر کیا تو میں نے بتایا کہ میں اس سارے علاقے کو جانتا ہوں وہ بڑے خوش ہوئے میں نے انہیں نقشہ بنا کر سمجھایا۔ وہ دو تین دن تک ہاتھ سے بیرو باری کا نقشہ بنانے کی پریکٹس کرتے رہے پھر مجھے اپنے ساتھ دہلی لے گئے جہاں انہوں نے بیرو باری کے مسئلے پر نہرو سے مذاکرات کئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہاں نہرو نون میں اور فارن سیکرٹری تھے۔ نون نے نہرو کو

ہاتھ سے سارے علاقے کا نقشہ بنا کر دکھایا تو نہرو بڑے متحرک ہوئے اور کہا۔ ”سر وزیراعظم آپ تو مجھ سے زیادہ اس مسئلے کو سمجھتے ہیں۔ یہ آپ کا ہی علاقہ لگتا ہے میں بنگال والوں سے بات کروں گا بعد ازاں مشترکہ یادداشت میں بیرو باری کو پاکستان کا حصہ قرار دے دیا گیا۔ اس پر بنگال میں نہرو کے خلاف بڑا ایجنڈا ٹیٹن ہوا۔ جھگڑے ہوئے بنگالی سپریم کورٹ میں گئے لیکن فیصلہ ہو چکا تھا۔ گوادر اومان کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ دشت، خیر اور خشک پہاڑیوں پر مشتمل اس علاقے کے مستقبل کا فیصلہ انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا۔ گوادر میں اس وقت کوئی مسلمان نہیں تھا۔ مچھلی کے کاروبار اور سمگلنگ پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ہمیں خطرہ تھا اومان کہیں یہ علاقہ بھارت کو نہ دے دے۔ فیروز نون صورتحال کی نزاکت بھانپ گئے اور انہوں نے برطانوی وزیراعظم میک ملن سے رابطہ کیا۔ میک ملن ان کے پرانے جاننے والے تھے اس حوالے سے گوادر پاکستان کو مل گیا۔ ملک فیروز نے یہ کام اس وقت کیا جب ان کی حکومت چند دنوں کی مہمان تھی اور انہیں خود مستقبل قریب میں رونما ہونے والے حالات کا اور اک تھا لیکن وہ ایک محب وطن سیاستدان تھے۔

سکندر مرزا نے ملک فیروز خان سے بھی چھکارا پانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ۵۷ء کے آخر میں مارشل لا لگانا چاہتے تھے لیکن امریکیوں نے انہیں روک دیا تھا بعد ازاں ۵۸ء میں وزیر خزانہ امجد علی شاد اور ایوب خان امریکہ گئے اور امریکی انتظامیہ کو سمجھایا کہ آپ پاکستان میں الیکشن نہ کرائیں ورنہ بھاشانی اور عبدالغفار خان جیسے کیونسٹ برسرِ اقتدار آ جائیں گے۔ پاکستان میں صرف فوجی راج ہی تمہارے لئے سودمند ہے۔ نون کی بدقسمتی ملاحظہ کریں خود اس کا وزیر خزانہ اور کمانڈر انچیف امریکہ میں حکومت کے خلاف مذاکرات کر رہے تھے اور انہیں خبر تک نہیں تھی۔

ایوب خان کی مدت ملازمت ختم ہونے والی تھی اور انہیں توسیع کی بڑی فکر تھی۔ سکندر مرزا انہیں یہ کہتے تھے کہ یہ وزیراعظم کا کام ہے میں اس سے بات کروں گا اور خود نون سے کہتے تھے تم اسے ذرا ڈرا کر رکھو۔ جوں جوں ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آ رہا تھا ایوب خان توں توں پریشان ہوتے جا رہے تھے۔ پھر وزیراعظم راولپنڈی کے دورے پر آئے تو وہ ایوب خان کے پاس ٹھہرے اور ایوب کو ایکسٹینشن دے دی گئی جس کے فوراً بعد ایوب نے امریکیوں کے ساتھ مل کر جو منصوبہ تیار کیا تھا اس کی زمین ہموار ہو گئی۔ سکندر مرزا نے فیروز خان نون کی چھٹی کراچی اور چند ہی روز بعد ایوب خان نے سکندر مرزا کو نکال باہر کیا۔

ملک فیروز خان نون کی قوت فیصلہ بہت زبردست تھی۔ وہ حالات و واقعات سے آگاہ

تھے۔ انہیں علم تھا آری آری ہے اس لئے وہ ایوب خان کی ملازمت میں توسیع نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن سکندر مرزا نے انہیں مجبور کر دیا۔ پنجاب میں مظفر علی قزلباش نے انہیں بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ نوں نے سسٹم کو بچانے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کا بس نہ چلا۔ وہ بہت ایماندار تھے دلیر تھے اور سب سے بڑھ کر ان میں جس مزاج بہت زیادہ تھی۔ پھل پھریاں چھوڑتے رہتے تھے۔ مجھے ان کے فیملی ممبر کی حیثیت حاصل تھی وہ بہت پڑھے لکھے تھے۔ انگریزی اچھی طرح بولتے تھے ان کی بیوی غیر ملکی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو سے میری ملاقات کسی حادثے سے کم نہیں تھی۔ ۵۶ء میں جب میں ٹراپی کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا تو صاحبزادہ حسن محمود ایک خوبصورت نوجوان اپنے ساتھ میرے دفتر آئے اور مجھ سے کہا۔ ”یہ ذوالفقار علی بھٹو ہیں انہیں کن لائسنس چاہیے۔“ میں بھٹو کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس وقت وہ زیادہ جانے پہچانے بھی نہیں جاتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا ”آپ کے پاس پہلے کوئی کن لائسنس ہے۔“ ”۳۵۔“ بھٹو نے جواب دیا۔ میں نے کہا یہ کافی ہیں آپ کو مزید لائسنس کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا اچھا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اور مجھے قطعاً خبر نہیں تھی کہ میں کتنی سنگین غلطی کر چکا ہوں اور اب مجھے اس کی عمر بھر سزا ملے گی۔

ایوب خان کے مارشل لاء میں مجھے امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس کا چیف کنٹرولر بنادیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا مرس مسٹر تھے۔ میں چارج لینے کے بعد ان سے ملنے گیا تو وہ تپے بیٹھے تھے۔ ۵۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے جھاڑ پلا دی۔ ”ان لوگوں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہیں پوسٹ کر دیا۔ میں نے اب چیک کیا تو تم میرے پلے باندھ دیئے گئے۔ مجھے ابھی تک اپنی توہین نہیں بھولی۔“ وغیرہ وغیرہ۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ لائسنس والا واقعہ میرے ذہن سے بالکل محو ہو چکا تھا۔ میں نے کہا جناب میں کچھ سمجھا نہیں انہوں نے کہا۔

Don't you remember when you were District Magistrate and I came to you with Hussain Mahmood and you refused to issue a licence to me.

میں نے کہا۔ جناب میرا جواب تو کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ وہ چلائے۔ تمہیں نہیں معلوم زمینداروں کے لئے لائسنس کتنے اہم ہوتے ہیں اور انکار کتنا بڑا۔ میں نے کہا جناب میں بنگال سے آیا تھا وہاں کسی نے مجھ سے کبھی لائسنس نہیں مانگا تھا لہذا مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ اور پھر ہماری دوستی ہو گئی لیکن لائسنس والا واقعہ بھٹو نے کبھی فراموش نہ کیا۔

بھٹو کی یادداشت بڑی غیر معمولی تھی۔ آرٹ و ادب اور عالمی امور سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ ان کی ذاتی لائبریری بہت شاندار تھی۔ ان دنوں ان کی تقریریں لکھنے کی ذمہ داری میرے پاس تھی۔ ایک مرتبہ تصاویر کی کوئی نمائش تھی بھٹو نے وہاں تقریر کرنا تھی۔ انہوں نے مجھے بلایا اور تقریر لکھنے کا کہا۔ میں نے کہا جناب آپ کو پینٹنگز کا کیا پتہ؟ ہنس کر کہنے لگے اسی لئے تو تمہیں تقریر تیار کرنے کا کہا ہے خیر میں نے لکھ دی۔ دوسرے روز وہ نمائش میں گئے اور کہا۔ ”آرت کل زیادہ تر دزیر لکھی ہوئی تقریریں پڑھتے ہیں میں بھی چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا کسی نا اہل بیورو کریٹ کو کہتا اور وہ میری تقریر لکھ دیتا لیکن میں ایسا نہیں کرتا کیونکہ آرٹ اور کلچر میں میرا اپنا ایک نظریہ ہے اور اس کے بعد انہوں نے میری لکھی ہوئی تقریر ساری کی ساری زبانی پڑھ دی۔ تقریب کے بعد وہ مجھے دیکھ کر شرارتی لہجے میں بولے ”کیوں پھر؟“ اور میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے جناب۔“

میں پاکستان ٹریڈ سے غیر ملکی کمپنیوں کا اثر و رسوخ کم کرنا چاہتا تھا۔ بھٹو اس سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بھٹو فیصلہ کرتے اور میں فوری طور پر اس پر عملدرآمد شروع کر دیتا۔ یہ بات امریکہ کو بڑی لگی کیونکہ اس وقت ملک میں امداد آ رہی تھی لہذا بھٹو کے خلاف امریکی شکایات شروع ہو گئیں۔ جب یہ دباؤ بڑھا تو ایوب خان نے بھٹو سے وزیر تجارت کا پورٹ فولیو لے لیا اس کے بعد بھٹو سے میرا رابطہ کم ہو گیا۔

بھٹو خامیوں اور خوبیوں کا عجیب مجموعہ تھا۔ وہ جب کسی شخص کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتا تو دوسرے شخص کے پاس بھٹو کی دوستی کے علاوہ کوئی چوائس نہیں رہتی تھی۔ بڑا رنگین مزاج اور ریٹیکس آدمی تھا۔ سول سروس کو علم ہونے سے قبل ان سے اس کی دوستی ہو چکی ہوتی تھی۔ مکمل کر بات نہیں کرتا تھا سول سروس کو ایک دوسرے کے بارے میں کریدتا رہتا تھا۔ اس کو بیورو کریسی کے تمام معاملات کی خبر ہوتی تھی لیکن وہ انہیں صرف اپنی حد تک رکھتا تھا۔ اپنی معلومات کو کسی کے خلاف استعمال نہیں کرتا تھا۔ ایوب خان کا بڑا مداح تھا۔ ان کا بیٹا بنا ہوا تھا۔ کیبنٹ میں کبھی ایوب خان کی مرضی کے خلاف بات نہیں کرتا تھا۔ اپنے ساڑھے پانچ برس کے حکومتی قرب کے دوران میں نے اسے کبھی ایوب خان سے اختلاف کرتے نہیں دیکھا۔

میں ایوب خان کے دور میں انفارمیشن سیکرٹری بنا تو بھٹو کے ساتھ میرا قرب بڑھ گیا۔ میں اور بھٹو اینٹی امریکن کمپ سمجھے جاتے تھے جبکہ وزیر خزانہ محمد شعیب اور نواب آف کالا باغ

امریلی نوازان ونوں نام اور نیور ویک میں میرے اور بھٹو کے خلاف آرٹیکل بھی چھپتے تھے لیکن میں کسی گروپ میں نہیں تھا۔ بس بھٹو سے میری دوستی تھی اور بھٹو وہ اتنے قرب کے باوجود کہ ہم کانفرنسوں میں اکٹھے جاتے تقریریں کرتے اور ملتے ملتے رہتے لیکن وہ مجھ سے ہمیشہ مختار رہتا تھا۔ ۶۵ء کے الیکشن کے دوران سندھ میں بھٹو کی پوزیشن بہت خراب تھی۔ وہ تو الیکشن بھی نہیں لڑنا چاہتے تھے اس کی وجہ سے فاطمہ جناح تھیں۔ وہ بھٹو سے ناراض تھیں۔ انہوں نے میدان آبا کے جلسہ عام میں بھٹو پر شراب نوشی اور عورتوں کا الزام لگا دیا۔ بھٹو اس الزام سے گھبرا گیا ان دنوں لوگ فاطمہ جناح کی بات کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ایوب خان سے کہا آپ اپنی تقریر میں ذوالفقار علی بھٹو کا دفاع کریں کیونکہ وہ آپ کا وزیر خارجہ ہے۔ صدر ایوب نے میری بات مان لی جس کے بعد بھٹو کی پوزیشن بہتر ہو گئی۔

۶۵ء کی جنگ سازش نہیں تھی لیکن پھر بھی بعض باتیں غلطی ہیں مثلاً جبرالٹر سازش محسوس ہوتا ہے۔ فروری ۶۵ء میں یہ بھٹو عزیز احمد اور آئی ایس آئی نے کابینہ کی انٹیلی جنس کمیٹی میں پیش کیا جسے سن کر ایوب خان نے سب کو ڈانٹ دیا اور کہا میں نے تو تم لوگوں کو صرف کشمیر پر نظر رکھتے اور بھارت پر دباؤ بڑھانے کا کہا تھا لیکن تم نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سیشننگ میں سینہ سارا عرصہ خاموش رہا لیکن بیکری خارجہ وزیر احمد کرشنی دکھاتے رہے پھر میں ایوب خان سے ساتھ دوس چلا گیا تو وہاں ایک روز صدر نے بتایا ان لوگوں نے میری غیر موجودگی میں جنگ چھینے دی ہے۔ ہم واپس آئے تو ملک میں رن آف کچھ کا بڑا یوٹو، یا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا پاک فوج نے بھارت کو مار مار کر بھگا دیا ہے۔ ایوب خان نے واپس چکپتے ہی جنگ بند کرادی لیکن ان پر اس یوٹو کا بڑا اثر ہوا۔ اسی دوران یہ بات چل نکلی کہ یہ بھارت پر حملے کا بہترین وقت ہے۔ پھر یہ لوگ مئی ۶۵ء میں ایوب خان کو مری لے گئے اور وہاں جنرل اختر ملک نے ایوب خان کو جبرالٹر کا پلان سمجھایا اور انہوں نے انہیں مقبوضہ کشمیر اور اکھنور پر حملے کی اجازت دے دی۔

مجھے مزید پسند باتیں بھی بڑی طرح کھلتی ہیں مثلاً یہ سارا آپریشن مجھ سے فضا رکھا گیا۔ بھٹو جو مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے انہوں نے بھی ذکر نہ کیا جبکہ ہم اس دوران الہیہ کے دور سے پر بھی گئے۔ ہاں ایک مرتبہ انہوں نے اتنا ضرور کہا کہ میں نے تم سے ضروری بات کر لی ہے لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔ ان لوگوں نے ایوب خان کو بھی مجھے اس آپریشن سے الگ رکھنے کے لئے قائل کر لیا تھا۔ شاید ان لوگوں کا خیال تھا کہ ایوب خان میری بات کا ٹولس

لیتے ہیں اور میں انہیں اس اقدام سے باز رکھ سکتا ہوں۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ میرا چین سے رابطہ ہے اور یہ لوگ اس آپریشن کی بھٹک چینوں کو نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ دوسرے ان لوگوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ وہ آپریشن کے دوران پھنسیاں گزارنے کے لئے سوات چلے جائیں کیونکہ وہ یہاں رہیں گے تو بھارت سمجھے گا کوئی سازش ہو رہی ہے ایوب خان نے ان کی یہ بات بھی مان لی وہ سوات گئے اور وہاں انہوں نے شاہ ولی اللہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ایوب خان کے جانے کے بعد ان لوگوں نے فوجی جوانوں کو پھنسیاں دے دیں۔ بھٹو اور عزیز احمد میرے سامنے ایوب خان کو یقین دلاتے تھے کہ انہیں گارنٹی ہے کہ بھارت بین الاقوامی بارڈر کر اس کر کے پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ جنگ شروع ہوئی تو بھارت نے بارڈر عبور کر لیا۔ کابینہ کے اجلاس میں ان لوگوں کو ان کی باتیں یا کرائی گئیں تو ان لوگوں نے کہا۔ وہ تو ہماری رائے تھی۔ تیسرا یہ لوگ جن کشمیری مجاہدین کی بنا پر اتنا بڑا آپریشن شروع کرنے والے تھے ان کا ان سے رابطہ تک نہیں تھا۔ یہاں تک کہ لندن میں ان کی فاروقی عید اللہ سے بات تک نہیں ہوئی تھی۔ آپریشن کے سلسلے میں کسی اور کمانڈر تک کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ پوچھا یہ آپریشن مکی میں قائل ہوا تو جون میں سیکرٹری دفاع وزیر احمد نے واگہ بارڈر سے بارہوی سرنگیں اٹھوا دی تھیں۔ جنگ کے بعد جب اٹھواری شروع ہوئی تو جنرل موسیٰ نے کہا سرنگیں بارشوں کی وجہ سے بے کار ہو گئی تھیں اس لئے ہوا پڑیں جبکہ میں نے محکمہ موسمیات سے رپورٹ لگوائی تو اس ماہ وہاں مغرب میں بارش ہوئی تھی۔ آپریشن شروع ہوا تو ۸ اگست کو آئی ایس آئی نے اعلان کر دیا مقبوضہ کشمیر میں ہمارے سارے رابطے منقطع ہو چکے ہیں اور فوجیوں نے کہا ہمارے ٹرانس میسر خراب ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں کچھ پتہ نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

جبرالٹر کا آپریشن کام ہو گیا تو جنرل موسیٰ بھاگتے ہوئے بھٹو کے پاس آئے (میں بھی وہاں موجود تھا) اور کہا۔ ”بھٹو میرے فوجی بڑی طرح پھنس چکے ہیں بھارتی مظفر آباد پر نظریں کاڑھتیے ہیں اب اکھنور پر ریل کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ بھٹو نے کہا ”ٹھیک ہے کر لو۔“ موسیٰ نے کہا ”اس کے لئے ہمیں بین الاقوامی بارڈر کر اس کرنا پڑے گا جس کے لئے صدر کی اجازت ضروری ہے۔“ بھٹو فوری طور پر سوات گئے اور ایوب خان کا آرڈر لے آئے جس کے بعد ہماری فوجیں بھارتی سرحد عبور کر کے اکھنور کی طرف بڑھنا شروع ہو گئیں وہاں انہیں بڑی طرح مار پڑی۔ جب ایوب خان سوات سے واپس راولپنڈی آئے تو ان لوگوں نے انہیں فتوحات کی غلط

رپورٹیں پیش کرنا شروع کر دیں لیکن وہ معاملے کو بھانپ گئے اور انہوں نے آپریشن کی کمان ہنزل اختر ملک سے لے کر جنرل یحییٰ خان کو دے دی۔

۴ ستمبر ۶۵ کو بھارت میں ہمارے ہائی کمشنر میاں ارشد حسین نے ترکی کے سفیر کو ایک پیغام دیا جس نے وہ پیغام استنبول بھیجا اور وہاں سے کراچی میں ترکی کے سفیر کو پاس کر دیا گیا۔ اس نے اسی رات یہ پیغام پاکستان کے سیکرٹری خارجہ عزیز احمد تک پہنچا دیا۔ انہوں نے پیغام پڑھا تو اس میں لکھا تھا بھارت ۶ ستمبر کو پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ وہ فوری طور پر بھٹو کے پاس پہنچے اور انہیں یہ پیغام دکھایا۔ بھٹو نے یہ پیغام پڑھنے کے بعد کہا۔ ارشد حسین ٹروس ہو گیا ہے ایسے ہی بے تنگی باتیں کر رہا ہے۔ یہ خدا ایوب تک پہنچا تو وہ گھبرا جائے گا تم جا کر سو جاؤ۔ جنگ کے بعد جب ارشد حسین نے پاکستان کا بینہ کے اجلاس میں شور مچایا تو بھٹو اور عزیز احمد کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

۴ ستمبر کو میں اور وزیر اطلاعات شہاب الدین فہا کہ تھے۔ وہاں شام کو ہم نے ریڈیو پر بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کا وہ خطاب سنا جس میں اس نے قوم کو جنگ کے لئے تیار رہنے کی صاف صاف ہدایت کی تھی۔ تقریر ختم ہوتے ہی میں نے شہاب الدین سے کہا اب یہاں ایک منٹ کے لئے ٹھہرنا ہے وقوفی ہوگی ہمیں فوری طور پر بنگلہ دیش سے نکل جانا پڑے گا۔ ہم ۵ ستمبر کو ہا کہ سے کراچی آ گئے۔ یہاں ہا کہ سے مغربی پاکستان آنے والی آخری فلائٹ تھی۔ یہاں آ کر انکشاف ہوا کہ لال بہادر شاستری کی اس تقریر کی اطلاع ایوب خان کو فاران آفس نے دی اور نہ ہی جی ایچ کیو نے۔ یہاں تک کہ ۶ ستمبر کی صبح ایوب خان کو ایئر فورس کے ایک آفیسر نے جگا کر خبر دی تھی کہ بھارت نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔

میں ۶ ستمبر کی صبح اسلام ایئر پورٹ پر اترا تو میرے جوائنٹ سیکرٹری نے بتایا۔ صدر آپ کو طلب کر رہے ہیں۔ میں ایوان صدر پہنچ گیا۔ وہاں باہر وزیراعظم کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ صدر کا ملٹری سیکرٹری ملا اور کہا صدر کا حکم ہے آپ فوری طور پر ان کے لئے تقریر لکھیں۔ صبح آغا شاہی اور بھٹو نے تقریر لکھی تھی لیکن صدر نے وہ مسترد کر دی۔ میں نے کہا جناب جب تک میں صدر سے بات نہ کروں تقریر کیسے لکھ سکتا ہوں۔ ملٹری سیکرٹری نے صدر کو جی ایچ کیو فون کر دیا وہ فوری طور پر آ گئے۔ میں نے دیکھا وہ بہت مطمئن تھے۔ مجھ سے معمول کے مطابق حال احوال پوچھا ہا کہ کی حالت پوچھی بعد ازاں بتایا صبح امریکی سفیر آیا تھا اور مجھے کہنے لگا

Mr. President the Indian have got you by the neck میں نے کہا۔ The Indian don't know the people they have taken on. میں نے فوراً کہا۔ ”سر بس ٹھیک ہے میں سمجھ گیا آپ کو کس قسم کی تقریر چاہیے۔“ اور اس کے بعد میں نے ۶۵ء کی جنگ کی وہ معرکہ آراء تقریر لکھی جس نے پوری قوم کا مورال بلند کر دیا۔ یہ تقریر دن گیرا رہے ریکارڈ ہوئی تھی۔ میں نے ساڑھے دس بجے یہ مکمل کی۔ ایوب خان نے پڑھی میں نے لکھا تھا۔ have virtually اتوا انہوں نے Virtually کاٹ دیا۔ تقریر ریکارڈ ہو گئی تو اس تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اس تقریر کے بعد صدر کی تمام تقریروں کا بوجھ مجھ پر پڑ گیا۔ مجھے یاد ہے میں نے جنگ کی اختتامی تقریر لکھی اور کا تب اس مقام پر آیا کہ ہم فائر بندی کر رہے ہیں تو اس نے رونا شروع کر دیا میرے پاس آج بھی تقریر کا وہ صفحہ موجود ہے جس پر کا تب کے آنسوؤں کے نشان ہیں۔

۶۵ء کی جنگ کو آرڈینیشن کی بدترین مثال ہے۔ فوج کو یہ پتہ نہیں تھا۔ کمانڈر انچیف کہاں ہے اور کمانڈر انچیف کا بیوی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایئر مارشل نور خان سے پوچھیں تو وہ اتنے فوج تو لڑ رہی نہیں رہی سارا کام ایئر فورس کو کرنا پڑ رہا ہے۔ پیچھے رہ گئے نیوی والے تو وہ کراچی میں بیٹھ کر جھوٹی فتوحات کا اعلان کر رہے تھے۔ جنگ کے لئے تیاری سرے سے نہیں تھی اور حکمت عملی کی یہ حالت تھی ان لوگوں نے ایئر مارشل اصغر خان کو جس نے پاک فضائیہ کی بنیاد رکھی جس نے اسے سکیمیشن کیا۔ اسے جوائی میں ریٹائر کر دیا اور ان کی جگہ ان ایئر مارشل نور خان کو لگا دیا جو عرصہ سے کمرشل لائن اختیار کر چکے تھے۔ کشمیر کمیٹی نے کشمیریوں سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ مقبوضہ کشمیر میں (جبرالٹر آپریشن) گوریلا جنگ کے لئے ایسے کمانڈوز بھیج دیئے گئے جن کا کمانڈر کرنل غفار مہدی چیف چیف کر کہہ رہا ہے میرے لوگ اس قابل نہیں انہیں وہاں نہ بھیجو شہریوں کی کوئی تربیت نہیں۔ جنگ ہو رہی ہے اور لوگ چھتوں پر کھڑے ہو کر ہوائی جہازوں کی لڑائی کا نظارہ کر رہے ہیں۔ یہ جنگ نہیں ہڑ بونگ تھی۔

جنگ کے دوران ہمارے پاس ہتھیار ختم ہو گئے۔ سرحدوں پر صورتحال بہت خراب تھی۔ مشرقی پاکستان سے کوئی رابطہ نہیں تو ایک روز ایوب خان نے مجھ سے پوچھا۔ اب کیا کریں۔ میں نے کہا۔ سر آپ کے پاس چین کا گارڈ ہے آپ وہ استعمال کیوں نہیں کرتے۔ ایوب خان چونک اٹھے اور کا بینہ کی میٹنگ بلا لی۔ پھر اسی رات وہ خفیہ طور پر چین چلے گئے ہم نے

یہ بات ان کے گھر والوں تک سے چھپائی تھی۔ صبح میرا معمول کے مطابق بیڈروم میں چائے لے کر گیا وہاں پی پی پر پیالی خالی تھی۔ گارڈز تک کو یہ علم نہیں تھا کہ صدر ایوان صدر میں موجود نہیں ہیں، چین میں چوہین الٹی نے ان سے کہا۔ ”ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔“ ایوب خان نے پوچھا ”کہاں تک؟“ اس نے جواب دیا ”جہاں تک تم کہو گے۔“ ایوب نے حیران ہو کر کہا ”آپ بہت بڑا رسک نہیں لے رہے؟“ وہ ہوا۔ ”نہیں ہم نے سوچ لیا ہے تم جنگ لڑو خواہ تمہیں پہاڑوں تک پسائیوں نہ ہونا پڑے تم ہم سے جو چاہو گے ہم دیں گے۔ لیکن ہم سے غلط بیانی نہ کرنا کیونکہ دوستوں میں یہ نہیں ہونا چاہیے۔“ ایوب خان واپس آئے تو وہ ڈبل مائینڈ ڈتے وہ جنگ لڑنا چاہتے تھے لیکن پاکستان کے لیڈر اور فوجی لڑائی کے لئے تیار نہیں تھے چنانچہ ایوب خان نے چینی کارڈ استعمال نہیں کیا۔

۶۵ء کی جنگ میں بھٹو کا کردار بہت بڑا تھا۔ بھٹو کا مزاج سازشی تھا۔ وہ جھوٹ بہت بولتا تھا۔ اس میں دوسروں کو بے وقوف بنانے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس نے ایوب خان کو بے وقوف بنایا کہ ہمیں کارنی مل گئی ہے بھارت پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ جنگ کے دوران اسے ڈر تھا ایوب خان اس کے اور جنرل موسیٰ کے خلاف انکوائری آرڈر نہ کر دے لہذا وہ سیکورٹی کونسل میں بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھا ایک مرتبہ تو ایس ایم ظفر گئے جب بھٹو کو یقین ہو گیا کہ اس نے حکومت سے توبہ دخل ہو ہی جاتا ہے تو اس نے سوچا چلو اب عوام کو ہی اپنے ساتھ شامل کر لوں۔ پھر وہ سیکورٹی کونسل گیا وہاں اس نے وہ تقریریں کیں کہ خدا کی پناہ۔ ناشقند میں وہ ہمارے ساتھ تھا۔ اس دوران اس نے ایوب خان کی کسی بات کی مخالفت نہیں کی میں اور وہ معاہدوں کے لئے ڈرافٹ تیار کرتے رہے وہ مجھے ہر ایک کرتا تھا اور میں ڈرافٹ تیار کرتا تھا لیکن جب وہ واپس پاکستان پہنچا تو اس کا رویہ بدل گیا اس نے سب کچھ ایوب خان کے کھاتے میں ڈال دیا۔

بھٹو میں جواری کی خوشی۔ اسے صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا ملکہ حاصل تھا۔ پاکستان آ کر اس نے محسوس کیا عام آدمی جنگ بندی کے سخت خلاف ہے۔ لہذا اس نے معاہدہ ناشقند کے خلاف تقریریں شروع کر دیں۔ فوج کو بھی بدنامی کا ڈر تھا لہذا وہ لوگ بھی بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے کہ جی ہم تو لڑنا چاہتے تھے لیکن ایوب خان نہیں لڑا جبکہ فوجی جرنیل بالکل لڑنا نہیں چاہتے تھے ان کے پاس تو اسلحہ تک نہیں تھا وہ ایوب خان کے خلاف تحریک میں اس لیے شامل ہو رہے تھے کہ انہیں خوف تھا کہیں ایوب خان انکوائری کمیٹی نہ بٹھائے کہیں انہیں نکال نہ دے۔

دوسری طرف ایوب خان خود کو اس سانحہ کا مجرم قرار دیتے تھے۔ وہ ساری ساری شام تنہا اور خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ مجھے روز شام چھ بجے ان کا فون آ جاتا تھا۔ میں وہاں پہنچتا تو وہ چھوٹا سا ریڈیو لئے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں سامنے خاموشی سے بیٹھ جاتا وہ کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد مجھے خدا حافظ کہہ دیتے۔ کبھی کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں جاتا تو مجھے پڑھ کر سناتے وہ ان دنوں ایک فقرہ بہت دہراتے تھے۔ **One fatal mistake and you lost the war.**

میں دل میں پوچھتا تھا وہ مہلک غلطی کون سی تھی تو اندر سے آواز آتی تھی اکھنڈ۔ کیونکہ ان لوگوں نے طے نہیں کیا تھا کہ اس پر پہلے حملہ کرنا چاہیے یا آخر میں۔ ایوب خان پورے دو ماہ اس کشمکش کا شکار رہے۔ مجھے ڈر تھا شاید یہ فیصلہ اب پوری زندگی اس سے نہ نکل پائے گا۔ انہوں نے پوری زندگی کسی دوسرے کو ۶۵ء کی جنگ کا الزام نہیں دیا وہ پوری زندگی خود کو مجرم قرار دیتے رہے وہ دراصل ایک کمانڈر تھے اچھے کمانڈر۔

ایوب خان کے بعد یحییٰ خان کا دور آیا یحییٰ خان نے ۳۱۳ بیوروکریسی کے ساتھ مجھے بھی نوکری سے درخواست کروایا۔ میں نے یحییٰ خان کا سارا دور اپنے گھر میں بیٹھ کر گزارا میرے سامنے ملک ٹوٹا میں نے ملک کی ٹوٹی کرچیاں دیکھیں یہ دو ایک الگ انٹرویو کا مقناضی ہے اس لیے میں سر دست اس پر بات نہیں کرتا ہم سیدھے بھٹو کی طرف آتے ہیں۔

جب بھٹو برسر اقتدار آئے تو میں ”ڈان“ کا ایڈیٹر تھا ایک ادارے کی پاداش میں انہوں نے مجھے قید کر دیا میں رہا ہو گیا اس دوران مقدموں عدالتوں اور وکیلوں کا ایک لمبا دور شروع ہو گیا۔ اس دوران میں نے قید تنہائی بھی کائی اور جیلوں کی سنگلاخ دیواریں بھی جھیلیں، جھنگڑیاں اور بیڑیاں بھی برداشت کیں لیکن سارے الزام ہالآ خرازاں ہی ثابت ہوئے اور میں رہا ہو گیا اس دوران مجھے لندن سے ایک ریسرچ کے لئے بلاوا آ گیا۔ میں نے بھٹو سے اپنا پاسپورٹ وگزار کرنے کی درخواست کی انہوں نے مجھے بلایا۔ میں دس بجے حاضر ہوا لیکن میری باری اڑھائی بجے آئی۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ میز پر پاؤں رکھے بیٹھے تھے میں نے کہا **Prime Minister! you worked long hours** بھٹو نے ہنس کر کہا۔ **We don't play golf like you used to play** میں بیٹھ گیا تو کہنے لگے۔ تم ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ بہت عرصے آؤٹ رہے ہو اب ”مین مٹریم“ میں آ جاؤ۔ میں

نے کہا۔ ”سر میری کوئی مین سٹریم نہیں تو امپیشن نو مین سٹریم“ پھر جب میں رخصت ہونے لگا تو انہوں نے کہا۔ Altaf, whenever I want to see you why does every body here get very agitated and start talking against you.

”جناب ان کا خیال ہے آپ مجھے کنگ آف بھاو پور بنادیں گے“ انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”الطاف یہ نام ممکن بھی نہیں۔“ پھر میں لندن چلا گیا جہاں مجھے بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی۔ بھٹو صورتحال کو پلٹنے کا ماہر تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا وہ اس نے انجام کو کیسے پہنچایا کیونکہ میرا خیال تھا دنیا میں بھٹو کو بھٹو کے علاوہ کوئی پھانسی نہیں چڑھا سکتا تھا شاید بھٹو کی پھانسی بھی بھٹو ہی کا کمال تھا۔

اب ذرا ایوب خان کا ذکر ہو جائے۔ ایوب خان کے ساتھ میں نے سب سے زیادہ کام کیا لہذا زیادہ تفصیل سے ان کا ذکر ہونا چاہیے۔

میں ملک فیروز خان نون کا سیکرٹری تھا تو ایک دوپہر دو اڑھائی بجے میرے دفتر کا دروازہ کھلا اور سامنے جنرل ایوب خان پوری وروی میں ملبوس کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ وزیراعظم لنگ کے بعد آرام فرما رہے ہیں اور پرنسپل سیکرٹری کھانا کھانے گئے ہیں اس لئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ آپ وزیراعظم کو میری طرف سے دعوت دے دیجئے گا کہ جب وہ راولپنڈی کا دورہ کریں تو میرے پاس ٹھہریں۔ میں نے کہا۔ درست۔ وہ فوجی انداز میں واپس چلے گئے۔ یہ ایوب خان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مارشل لاء کے بعد جب مجھے ڈائریکٹر امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس لگایا گیا تو وہ ایک آدھ مرتبہ ہمارے دفتر آئے لیکن اس ملاقات کو ملاقات نہیں کہا جاسکتا تھا ان سے اصل ملاقاتیں سیکرٹری اطلاعات بننے کے بعد شروع ہوئیں۔ میں اگست ۶۳ میں ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کے لئے امریکہ گیا تھا۔ مجھے وہاں چیف سیکرٹری کا پیغام ملا کہ تم فوراً واپس آ جاؤ۔ میں آ گیا تو مجھے بتایا گیا صدر نے آپ کو سیکرٹری اطلاعات لگا دیا ہے۔ میں بڑا پریشان ہوا اور سیدھا تختیا گلی میں نواب آف کالا باغ کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے کہا الطاف صابا (وہ مجھے ہمیشہ الطاف صابا کہہ کر پکارتے تھے) میرے ساتھ وچ کج نکلیں پتہ نہیں کہنے صدر صاحب نون اکھیاتے اوہناں نے فیصلہ کر لیا اے (الطاف صاحب میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے پتہ نہیں کس نے صدر صاحب کو کہا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا) میں اگلے روز پنڈی

ایوب خان کے پاس حاضر ہو گیا اور انہیں کہا۔ ”سر میں اکنا ملک پول کا آدمی ہوں مجھے اطلاعات کا کوئی تجربہ نہیں۔ انہوں نے کہا لٹریچر میں تمہارا نام ہے وغیرہ وغیرہ مجھے ان کی باتوں سے محسوس ہوا انہوں نے طے کیا ہوا ہے لہذا میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے ستمبر ۶۳ء میں سیکرٹری اطلاعات کا چارج لیا آتے ہی پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس سر پر آگرا۔ اس آرڈیننس پر اگست سے کام شروع ہو چکا تھا۔ پریس نے ہڑتال کا نوٹس دے رکھا تھا۔ پریس میں چند بنگالی واقف کار صحافیوں کے علاوہ میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ ایوب خان صحافیوں پر بہت گرم تھے۔ آرڈیننس کے سلسلے میں پہلی میٹنگ ہی میں انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں ان سب کو سیدھا کمرہ دوں گا۔ یہ بڑے بد معاش لوگ ہیں۔ جب تک میں نے مارشل لاء رکھا یہ لوگ میری بڑی خوشامد کرتے رہے جوں ہی مارشل لاء اٹھا ان لوگوں نے اپنا رویہ بدل لیا۔ ”بہر حال میں نے آتے ہی ایک تو پریس سے مذاکرات کا آغاز کر دیا اور دوسرا پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کا تفصیلی مطالعہ شروع کیا۔ مجھے اس کی افادیت اور ضرورت دونوں مشکوک لگیں کیونکہ سیفٹی اینڈ سیکورٹی آرڈیننس اور دوسرے قوانین کی موجودگی میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مزید برآں بعض شقوں کی وجہ سے وہ بالکل ناقابل عمل تھا۔ مثلاً آرڈیننس میں ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی اخبار اسمبلی اور عدالت کی کارروائی رجسٹرار کی تصدیق کے بغیر شائع نہیں کر سکتا یہ ظاہر ہے ممکن ہی نہیں تھا۔ پریس سے مذاکرات کے دوران مجھے محسوس ہوا یہ آرڈیننس مناسب یا نامناسب کے دائرے ہی میں نہیں آتا۔ یہ بالکل ناقابل عمل ہے۔ میں نے اس کے جواز کے خلاف پوری تیاری کر لی۔ ایوب خان کی پریس سے فائل ملاقات سے ایک روز قبل آرڈیننس کے سلسلے میں تشکیل دی گئی۔ کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں نواب آف کالا باغ غلام علی میمن، خورشید مرحوم پرنسپل آفیسر این اے فاروقی، میں اور ایوب خان تھے۔ میٹنگ سے قبل لاء منسٹر خورشید احمد نے مجھے اشارہ دیا کہ ان کا اس آرڈیننس سے کوئی تعلق نہیں یہ سب کچھ میمن کا کیا دھڑا ہے۔ میٹنگ کے دوران سب لوگ پریس کو گالیاں دے رہے تھے یہ بڑے بد معاش ہیں بد کردار ہیں۔ یہ پریس والے نہیں۔ ان کا مقصد پیسہ دینا ہے۔ یہ سب مالکان ہیں جو اینڈ میٹر بنے ہوئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایوب خان آرام سے سنتے رہے آخر میں انہوں نے میری رائے پوچھی تو میں نے صاف کہہ دیا سر یہ ناقابل عمل ہے سب کے چہروں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ایوب خان نے وجہ پوچھی تو میں نے تفصیل سے سارے آرڈیننس پر روشنی ڈالی اور آخر میں کہا۔

Whatever the character of this Press. No responsible, Government should be things of this kind.

تو ایوب خان ان سب پر چڑھ دوزے اور کہا: "او خذیر کے بچو! یہ تم نے کیوں بنایا تھا۔ تم کو کس نے کہا تھا۔" اور سب کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور یہ لوگ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔ اب اس کا کیا کریں۔ میں نے مشورہ دیا اسے چھ ماہ کے لئے ماری نوریم میں رکھ دیا جائے۔ وہ کہنے لگے یہ صوبائی قانون ہے تمہیں مغربی اور مشرقی پاکستان جانا پڑے گا۔ میں نے کہا "سر میں جاؤں گا؟" دوسرے روز انہوں نے آرڈیننس ماری نوریم میں رکھ دیا جس سے پاکستانی صحافت اس آرڈیننس کے تباہ کن اثرات سے بچ گئی۔ پاکستانی اخبارات نے میرے اس اقدام پر اگلے روز خبریں اور مضامین شائع کئے۔ میں چند روز بعد اہور تواب آف کالا باغ کے پاس گیا تو انہوں نے کہا۔ "الطاف صاحب! تو تے بیڑا ہی غرق کر دیتا ہے۔" (الطاف صاحب آپ نے تو بیڑا ہی غرق کر دیا ہے) میں نے کہا "کیوں؟" کہنے لگے۔ "توں جسکا جانندالے ولایت نہیں اے ساڈی پولیس اے ساڈے تک ہونندے سن جھنڈ آج ابے رپورٹر بن گئے نے" (تم نہیں جانتے یہ ولایت نہیں ہماری پولیس ہے پہلے ہمارے بھانڈے ہوتے تھے اب یہ لوگ رپورٹر بن گئے ہیں۔) پھر میں ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے گورنر منعم خان کے پاس گیا تو وہ عجیب دیوانہ آدمی تھا اس کا نہ پتہ چلتا تھا سو رہا نہ پتہ چلتا تھا جاگ رہا ہے۔ میں انگریزی میں ساری بات سمجھا تا رہا وہ سنتا رہا استار ہا جب میری بات مکمل ہو گئی تو اس نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔ "الطاف تم واقعی گور ہوا اور جو تم کہو گے وہی ہوگا" مجھے نہیں پتہ تھا وہ کس قدر منافق ہے بہر حال آرڈیننس "ماری نوریم" کے باعث ان لوگوں نے کوئی "قابل ایکشن" تو نہ لیا لیکن پولیس پر ان فارمل ایکشن جتنے ہو سکتے تھے وہ ان لوگوں نے لئے اشتہار بند کر دیئے اور صحافیوں کو پریشان کئے رکھا وغیرہ وغیرہ۔

اس دور میں میری ایوب خان سے بہت ملاقاتیں ہوئیں وہ مجھے اکثر ذاتی زندگی کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے بتایا کہ وہ شروع زندگی میں بہت سگریٹ پیتے تھے۔ دو روز ۶۰، ۵۰ سگریٹ پھونک جاتے تھے۔ جب وہ ڈھاکہ میں جی۔ او۔ سی تھے تو صبح اردلی ناشتے کے ساتھ سگریٹوں کا کاٹن دے جاتا۔ ایک روز وہ چائے کے ساتھ سگریٹ لانا بھول گیا تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے اردلی سے کہا۔ سگریٹ کہاں ہیں؟ اس نے بتایا آج نہیں ملے۔ انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اردلی غصہ سے بولا۔ "تم کیسے آدمی ہو تم میں تو برداشت ہی نہیں۔ تم ذرا سے سگریٹوں کے لئے اس شخص کو ڈانٹ رہے ہو جس نے اتنی برسوں تمہاری خدمت کی۔" پھر

لپٹے گئے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا زندگی میں دوبارہ سگریٹ نہیں پیوں گا اور یہ فیصلہ انہوں نے زندگی بھر نبھایا۔

ایک دن بتانے لگے قائد اعظم مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ تقسیم کے وقت میں باؤنڈری فورس میں بریگیڈیئر تھا۔ میری ڈیوٹی پنجاب میں فسادات کی روک تھام تھی لیکن انگریز نے سازش کر کے مجھے صرف ڈیڑھ سو جوان دیئے۔ جب فسادات شروع ہوئے تو فورس کم ہونے کی وجہ سے میں فسادات روکنے میں ناکام رہا۔ نتیجتاً پنجاب میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ لوگوں نے مشہور کر دیا ایوب خان ہندوؤں سے ملا ہوا ہے۔ راجہ پٹیل کی لڑکیوں پر عاشق ہے وغیرہ وغیرہ۔ میری یہ بُری شہرت قائد اعظم تک پہنچی تو وہ بھی مجھ سے متنفر ہو گئے۔ ۴۸ء میں جب قائد اعظم ڈھاکہ آئے تو لیٹر پورٹ پر ان کے لئے سلامی کا انتظام کیا گیا۔ قائد اعظم مجھے وہاں دیکھ کر ناراض ہو گئے۔ میں ڈاکس پر ان کے پیچھے کھڑا تھا میں نے انہیں مشورہ دیا آپ ذرا سا آگے ہو جائیں انہوں نے پیچھے منہ کر کے مجھے جھڑک دیا جس سے مجھے ان کی ناراضی کا صاف اندازہ ہو گیا۔

ایوب خان بہت سنجیدہ اور "ری زرو" شخص تھے۔ انہوں نے کیبنٹ میٹنگ میں کبھی مجھ سے نہیں پوچھا یہ کیا چھپ گیا۔ ان اخبار والوں کو روکو وغیرہ جبکہ دوسرے وزراء کا رویہ بہت بُرا تھا۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات عبدالوحید خان روز صبح سویرے فون کر کے مجھے کہتے۔ "الطاف صاحب آپ نے جنگ کراچی دیکھا اس کے پانچویں صفحے پر میری تصویر بہت چھوٹی ہے اور بیان بھی نہیں چھپا۔" مجھے بہت غصہ آتا۔ ایک روز میں نے راجہ ہو کر کہہ دیا۔ "وحید خان صاحب آپ کو غلط فہمی ہے کہ میں ساری رات اخبار والوں کے دفتروں میں بیٹھ کر تصویروں کا ساؤز دیکھتا رہتا ہوں۔" انہوں نے فنانس منسٹر سے میری شکایت کر دی۔ وزراء ایوب خان سے بھی میری شکایتیں کرتے رہتے تھے لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا۔

۶۵ء کے انتخابات کے دوران مس فاطمہ جناح کی مقبولیت دیکھ کر ایوب خان کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ شروع میں ان لوگوں نے ایوب خان کو یقین دلایا کہ کوئی شخص آپ کے مقابلے میں الیکشن کے لئے کھڑا نہیں ہوگا لیکن جب اپوزیشن نے فاطمہ جناح کو کھڑا کر دیا تو ان لوگوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا۔ آپ عوامی اجتماعات سے خطاب نہ کریں چند روز بعد فاطمہ جناح عوام میں آگئیں اور پورا پاکستان ان کے استقبال کے لئے گھروں سے باہر نکل آیا۔

یہ لوگ پریشان ہو گئے۔ اس وقت میں نے ایوب خان کو مشورہ دیا آپ عوام سے ضرور خطاب کریں۔ فاطمہ جناح گاؤں گاؤں جا رہی ہیں۔ ایوب خان کو مجبوراً ”انتخابی مہم“ کے لئے نکلنا پڑا۔ پشاور میں ایوب خان کے لئے صورتحال بڑی خراب ہو گئی۔ فاطمہ جناح ایک روز قبل وہاں بھرپور جلسہ کر کے گئی تھیں۔ ایوب خان کے جلسے کا وقت ہوا تو پنڈال خالی تھا۔ انتظامیہ نے بڑی مشکل سے لوگ اکٹھے کئے۔ ایوب خان نے تقریر کی لیکن ان کی اردو اچھی نہیں تھی، پشتو وہ سرے سے بول نہیں سکتے تھے لہذا جلسہ ناکام ہو گیا۔ شام کو کالا باغ اور منعم خان ایوب خان کو یقین دلا رہے تھے بڑا شاندار جلسہ ہوا ہے بہت لوگ آئے تھے فاطمہ جناح کا جلسہ تو ہوانے اڑا دیا تھا وغیرہ وغیرہ انہوں نے میری رائے پوچھی میں نے کہا جناب عوامی رد عمل بڑا منفی ہے۔ یہ لوگ غلام کہہ رہے ہیں میں نے مس جناح کا جلسہ دیکھا تھا وہ بڑا کامیاب تھا۔ انہوں نے استغھامیہ انداز میں میری طرف دیکھا میں نے مزید بتایا جناب کل تین بجے فاطمہ جناح کا جلسہ ہونا تھا دو بجے بڑی شدید آندھی اور بارش آئی شامیائے اڑ گئے قاتیں گر گئیں اس کے بعد بارش آئی لیکن ایک گھنٹے کی بارش کے بعد میں نے اپنی موٹر میں بیٹھے ہوئے دیکھا انہی ٹوٹی قاتوں اور گرے شامیائوں سے ہزاروں کا مجمع باہر نکلا۔ جناب لوگ آپ کو سننے آتے ہیں لیکن فاطمہ جناح کو دیکھنے آتے ہیں کیونکہ لوگ ان کی تکریم کرتے ہیں وہ بات سمجھ گئے۔ جیسے جیسے انتخابی مہم تیز ہوتی چلی گئی ایوب خان کے ساتھی بھاگتے چلے گئے۔ وزیر اطلاعات وحید خان جو کنونشن مسلم لیگ (ایوب خان کی پارٹی) کے جنرل سیکرٹری بھی تھے وہ اس دوران نظر ہی نہیں آئے۔

کالا باغ منعم خان اور انتظامیہ کے بھرپور ”تعاون“ کے باوجود ایوب خان بہت تھوڑے ”مارجن“ سے فتح یاب ہوئے اور اس میں بھی کراچی اور ڈھاکہ جیسے بڑے شہروں سے انہیں شکست فاش ہوئی۔ مجھے ایوان صدر سے بلاوا آیا۔ میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا۔ انتخابی مہم کے دوران غائب ہونے والے تمام لوگ دوبارہ وہاں جمع تھے اور ایوب خان کو چیخ چیخ کر مشورے دے رہے تھے انہیں کس قسم کی تقریر کرنی چاہیے اور ایوب خان سکتے کی حالت میں منہ اوپر کئے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایوب خان نے پلاننگ کمیشن کے سعید حسن کی طرف اشارہ کیا وہ بھی بڑھ چڑھ کر مشورے دے رہے تھے صدر نے کہا۔ آپ انہیں باہر لے جائیں اور ان کی بات سن لیں۔ میں انہیں الگ لے گیا اور انہیں کہا۔ ”جناب آپ کو کوئی اور کام نہیں۔ میں صدر کے لئے ڈیڑھ سو تقریریں نہیں لکھ سکتا۔“

یہ ایوب خان کے لئے حیران کن تجربہ تھا کیونکہ ان کا خیال تھا وہ عوام میں بہت مقبول ہیں لیکن جب وہ عوام کے پاس گئے تو انہیں بہت مایوسی ہوئی۔ پھر انتخابات میں اتنے کم مارجن سے جیتنا بھی ان کے لئے بڑا افسوسناک تھا۔

ایوب خان کی کتاب ”فرینڈز ناٹ ماسٹرز“ کا منصوبہ قدرت اللہ شہاب نے تیار کیا تھا۔ اس کے لئے وزارت اطلاعات میں باقاعدہ بحث مختص کیا گیا تھا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد شہاب کو رائلٹی میں بھی حصہ دار بننا تھا لیکن ان کا تبادلہ ہو گیا۔ جب میں سیکرٹری اطلاعات بنا ایوب خان نے مجھ سے کتاب کا ذکر کیا میں نے کہا ”سر چھوڑیں کیا کریں گے مشکل ہو جائے گا۔“ اسی دوران ایوب خان کا ہرنیا کا آپریشن ہوا اور وہ مری منتقل ہو گئے۔ انہوں نے مجھے طلب کیا اور حکم دیا۔ میں ۳ ہفتے یہاں ہوں تم اس دوران میرے انٹرویوز کرو اور کتاب مکمل کر دو۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ میں روزانہ کے سامنے بیٹھ جاتا۔ مائیکروفون لگ جاتے۔ میں سوال کرتا اور وہ فائلیں کھول کھول کر ہر بات کا تفصیلی جواب دیتے بعد ازاں یہ گفتگو ٹائپ ہو جاتی۔ تین ہفتے ختم ہوئے تو وہ دو ہزار صفحے بن گئے۔ ہم نے اسے ایک طرف رکھ دیا پھر ہم مصروف ہو گئے۔ درمیان میں انہوں نے ایک مرتبہ پوچھا تو میں نے کہا سر اس کے لئے کوئی ماہر رائٹر چاہیے آپ باہر سے کسی کو بلا لیں۔ انہوں نے اپنے ہائی کمشنر کو کہہ دیا۔ کچھ روز بعد لندن میں ہمارے ہائی کمشنر نے ”سکائس مین“ نامی اخبار کے ایڈیٹر کو پاکستان بھیج دیا۔ ہم نے اسے دو ہزار صفحے دے دیئے اس نے ایوب خان سے چند ملاقاتیں کیں اور سارا مواد لے کر ساؤتھ فرانس چلا گیا۔ اس نے وہاں سے کتاب لکھ کر بھجوا دی۔ یہ کتاب دیکھنے کے بعد ایوب خان نے کہا یہ تو میری کتاب ہی نہیں۔ نہ میری زبان ہے۔ نہ واقعات درست ہیں یوں وہ مسئلہ ایک بار پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ ۶۶ء میں بھٹو کی بے دخلی کے بعد حکومت میں میری پوزیشن خراب ہو گئی کیونکہ میں بھٹو کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ میں ایوب خان کو بھٹو کے خلاف ایکشن لینے سے بھی منع کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ وزراء نے اعتراضات شروع کر دیئے۔ میں نے ایوب خان سے کہا۔ ”آپ مجھے ہٹا دیں“ انہوں نے کہا ”نہیں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہاں سر دست تم مری چلے جاؤ اور کتاب کا کام شروع کر دو۔“ بہر حال میں اپنے سیکرٹری کے ساتھ مری گیا اور کتاب شروع کر دی۔ اس وقت تک مجھے ایوب خان کی زبان پر بھی عبور ہو چکا تھا۔ میں نے ایوب خان کے خیالات کو اس کی زبان میں ڈھال دیا وہ ساری کتاب ایوب خان کی تھی۔ ماسوائے فارن پالیسی کے دو ابواب کے وہ میں نے اس کی تقریروں کی روشنی

میں تیار کئے تھے شاید اسی لیے اس کتاب میں دو انداز محسوس ہوتے ہیں۔ کتاب مکمل ہونے کے بعد ایوب خان نے کہا ”تم اس میں اپنا نام بھی شامل کرو۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا ”سر میں کھوسٹ رائٹر ہوں میں نے اس کتاب میں کوئی کنٹری بیوٹن نہیں کی اس کی ساری ذمہ داری آپ کو لینا پڑے گی۔“ ”فرینڈز ناٹ ماسٹرز“ میں نے لکھی تھی وہ کتاب ایوب خان ہی کی تھی کیونکہ اس کتاب میں درج بے شمار نظریات سے مجھے اختلاف تھا۔ کتاب کی تحریر کے دوران میری جنرل یحییٰ خان سے پہلی ملاقات ہوئی۔

یحییٰ خان ان دنوں او۔ جی۔ سی ڈھا کہتے تھے۔ ایوب خان نے کہا ”تم اس سے مل لو وہ میرا سنا فیسر رہا ہے اس سے کتاب لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔“ میں نے یحییٰ خان کا انٹرویو کیا مجھے وہ بہت ذہین اور تیز شخص محسوس ہوا۔ ڈھا کہ میں اس کی شہرت بڑی خراب تھی۔ وہاں اس کی شراب خوری اور عشق بازی کے قصے بہت مشہور تھے۔ بعد ازاں اس کا تبادلہ جی۔ ایچ۔ کیو ہوا تو اس سے باقاعدہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ہم اکٹھے گالف کھیلتے تھے۔ ایک روز ایوب خان نے اپنے ملٹری سیکرٹری کے سامنے مجھے کہا۔ تم یحییٰ خان کے ساتھ گالف کھیلتے ہو وہ بہت سونا ہو گیا ہے اسے سمجھاؤ شراب بند کرو۔ میں نے کہا جناب میں اسے کیسے کہہ سکتا ہوں۔ جب وہ کمانڈر انچیف بنا تو کابینہ کے اجلاس میں بھی آنے لگا۔ میں نے دیکھا اگر بھٹو ایوب خان کو اپنا باپ سمجھتا ہے تو یحییٰ خان کے لئے ایوب خان باپ سے بھی زیادہ معتبر تھا۔ وہ ایوب کے سامنے سر جھکا کر خاموش بیٹھا رہتا کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ پھر میں نے اسے بدلتے ہوئے بھی دیکھا۔

اردن کا شاہ حسین پاکستان کے دورے پر آیا۔ اس کے استقبال کے دوران میں نے ایوب خان سے ہاتھ ملایا تو ان کا ہاتھ بہت گرم تھا۔ پھر جب وہ تقریر کرنے لگے تو ایک صفحہ چھوڑ گئے۔ میں نے ملٹری سیکرٹری سے پوچھا اس نے بتایا صدر صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں اسے معمول کی بیماری سمجھ کر ڈھا کہ چلا گیا۔ واپس آیا تو نقشہ بدل چکا تھا۔ ایئر پورٹ پر صدر کے پی آر اوفیسیر سعید نے بتایا صدر کو ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے اور ایوان صدر پر اب یحییٰ خان کا قبضہ ہے۔ کوئی سویلین آفیسر اندر نہیں جاسکتا۔ میں دفتر چلا گیا روز ایوان صدر سے ایک میڈیکل ٹیم آ جاتا تھا کہ صدر کو بخار ہے اب زلہ شروع ہو گیا ہے طبیعت بحال ہو گئی ہے وغیرہ وغیرہ ہم یہ ٹیم جاری کر دیتے تھے۔ پورے ملک میں پریشانی تھی۔ انوائس گردش کر رہی تھیں کہ صدر کو فالج ہو گیا۔ کوئی کہتا ان کا انتقال ہو گیا۔ لوگ ہم سے پوچھتے مگر ہمارے پاس مال منول کے سوا کوئی

جواب نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایوان صدر پر یحییٰ خان جنرل حفیظ جیڑا، رحیم اللہ کریم، بریگیڈیئر اے آر صدیقی، جنرل حمید اور جنرل عمر کا قبضہ تھا۔ چار پانچ روز بعد مجھے صدر کا بلاوا آ گیا۔ میں ایوان صدر گیا تو کوریڈور میں گوہر ایوب کے بڑے بھائی اختر ایوب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ ”ایناں نے تو انوں آن دیتا اے تو اڈا تے ایناں نے بی ڈی بنا دیتا سی۔“ (آپ کو ان لوگوں نے آنے دیا؟ انہوں نے تو آپ کا بی ڈی بنا دیا تھا) میں ایوب خان کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ مشین لگی ہوئی تھی۔ جوس کا گلاس پڑا تھا۔ کہنے لگے مجھے تھوڑی سی دل کی تکلیف ہو گئی تھی میں اب اچھا ہوں۔ میں نے کہا سر آپ اب لوگوں سے ملنا شروع کر دیں۔ میں گورنر موسیٰ اور منعم خان کو بلاتا ہوں تاکہ لوگ آپ کو بی ڈی پر دیکھ کر مطمئن ہو جائیں۔ انہوں نے اجازت دے دی لیکن جب میں دفتر آیا تو مجھے فون پر اطلاع دی گئی کہ ملاقاتوں کا شیڈول کینسل کر دیں صدر کو بڑا ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔

ایوب خان کی طبیعت زیادہ خراب ہونے کے باعث باہر سے انگریز ڈاکٹر گڈول کو بلانا پڑا۔ اس نے آتے ہی میڈیکل ٹیمیں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اس کا کہنا تھا یہ ڈاکٹر کا کام نہیں ہے اگر آپ عوام کو اطلاع کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے کریں جھوٹ نہ بولیں۔ اس روز پہلی مرتبہ سچا میڈیکل ٹیم جاری کیا گیا جس کے بعد آئینی مسئلہ کھڑا ہو گیا صدر بیماری کے باعث امور سلطنت چلانے سے معذور تھے چنانچہ آئین کے مطابق سپیکر عبدالباقی کو عبوری صدر بنایا جانا تھا۔ کابینہ کا اجلاس ہوا تو وزیر قانون ایس ایم ظفر نے اس آئینی شق کی عجیب تشریح شروع کر دی انہوں نے کہا سپیکر اس وقت عبوری صدر بن سکتا ہے جب صدر معمولی بیمار ہوں یا دورے پر گئے ہوں۔ صدر کی اس بڑی بیماری میں سپیکر کا عبوری صدر بننا ضروری نہیں وغیرہ وغیرہ۔ دراصل ایس ایم ظفر اس وقت تک یحییٰ خان کے کنٹرول میں آچکے تھے لہذا ایوب خان کی بیماری کے دوران ملک صدر کے بغیر ہی چلتا رہا بعد ازاں ایک مرتبہ یحییٰ خان نے مجھے کہا۔ ”میرا کیا تھا مجھے تو ایوب خان نے بیماری کے دوران واضح کہہ دیا تھا یو بی ٹیک اودر“ بہر حال ایوب خان ٹھیک ہو گئے اور انہوں نے کام شروع کر دیا۔

یحییٰ خان اگر تلہ سازش کیس کی وسیع پیمانے پر پبلیٹی چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کر کہا ہم ٹریبونل اوپن رکھیں گے آپ دنیا بھر کے پریس کو جمع کر دیں۔ میں نے جب کیس کی سٹیڈی شروع کی تو اس میں شیخ مجیب الرحمن کے خلاف ثبوت تو رہے ایک طرف اس کا نام تک

نہیں تھا جہاں اس کا ریفرنس آتا وہاں لکھا ہوتا "دی شیخ سیڈ لیس اینڈ دی شیخ سیڈ ڈیٹ" میں فوراً ایوب کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا آپ اس کیس میں مجیب کو شامل نہ کریں کیونکہ اس سے کیس بین الاقوامی ہو جائے گا اور اس کے خلاف ہمارے پاس ثبوت اس قدر کم ہیں کہ ہم ثابت نہیں کر سکیں گے۔ میں نے انہیں بتایا یہ کیس مغربی پاکستان کے کسی شخص نے تیار کیا ہے جسے یہ تک معلوم نہیں بنگالی میں "دی شیخ" نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بنگالی مجیب کو شیخ مجیب کہتے ہیں یا "مجیب الر" پکارتے ہیں۔ ایوب خان نے میرے ساتھ اتفاق کیا اور دوسرے روز ملزمان کی فہرست سے مجیب الرحمان کا نام اڑا دیا گیا لیکن سات آٹھ روز بعد اخبار میں مجیب الرحمان کا نام بھی آ گیا۔ میں ایوب خان کے پاس گیا تو انہوں نے بتایا "بیگی خان کہہ رہا تھا بڑے مسائل ہیں اس کا نام شامل کرنا ضروری ہے۔" اس وقت بیگی خان نے ایوب کے خلاف سازش شروع کر دی تھی۔ اسے ایک مرتبہ پاور مل چکی تھی اسے اندازہ تھا ایوب خان بیمار ہے زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ مجھے اس دور میں صاف محسوس ہو گیا اگر تلہ سازش کیس کی آڑ میں مغربی پاکستان کی اعلیٰ قیادت میں سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں بنگالی بڑی مصیبت ہیں انہیں ہٹاؤ۔ بیگی خان بڑا چال باز تھا۔ سازشی اور بے اصول تھا مگر بہت ذہین اور تیز بھی تھا۔ مجھے دشمن سمجھتا تھا۔

امریکیوں کے لئے بھی ایوب خان کو بے دخل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ انہوں نے بیگی خان کا حوصلہ بڑھایا۔ بیگی خان نے پاورزا اپنے اختیار میں لینا شروع کر دیں۔ وزراء نے بھی فوج کی طرف رخ کر لیا۔ اس وقت بیگی خان نے آخری ضرب لگانے کے لئے عوامی ایجنسی کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ کیا۔ جب پبلک ایجنسی ٹیشن شروع ہوا تو میں نے ایوب خان کو سیاست دانوں سے مذاکرات کا مشورہ دیا لیکن وہ کہنے لگے۔ یہ سب سودے باز ہیں ان میں کوئی جان نہیں۔ مذاکرات شروع ہوئے تو ان میں سے کوئی اصول پر بات نہیں کرے گا سب اپنی اپنی پارٹی کی بات کریں گے لیکن میرے اصرار پر انہوں نے اپوزیشن کے کئی نوابزادہ نصر اللہ کو وفد تشکیل دے کر ملاقات کی دعوت دے دی۔ نوابزادہ نصر اللہ مقررہ وقت پر اکیلے آئے اور کہا میں اپوزیشن کا وفد نہیں بلا سکتا آپ لوگ انہیں دعوت دیں۔ ناچار ہمیں دعوت نامے جاری کرنا پڑے لیکن فوج اس وقت تک بھنوسے گئے جوڑ کر چکی تھی چنانچہ بھنونا کرات میں شامل نہ ہوئے جس سے کانفرنس کمزور ہو گئی۔ ایوب خان اپوزیشن کی تمام شرطیں مانتے چلے گئے لیکن صورتحال درست نہ ہو سکی اس دوران بیگی خان ایوب خان کو کہتے رہے۔ "آپ فکر نہ کریں ہمیں جب حکم دیں گے ہمیں حاضر

پائیں گے۔" پھر ایک روز کراچی ڈھاکہ اور لاہور میں جزوی مارشل لاء کا فیصلہ ہوا۔ ایوب خان نے بیگی کو کابینہ میں بلایا تو اس نے جزوی مارشل لاء سے صاف انکار کر دیا اور صورتحال وہی ہو گئی جو کبھی سکندر مرزا کی ایوب خان کے سامنے تھی۔ بے شک تاریخ خود کو دہرائی ہے۔

پھر بیگی نے ایوب سے کہا۔ اپوزیشن برسرِ اقتدار آ کر آپ کا ٹرائل کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں ان سب کو سیدھا کر دوں گا۔ بھٹو کیا، مجیب کیا سب کی چھٹی کرادوں گا۔ ایوب خان باتوں میں آ گئے۔ بیگی خان نے انہیں مشورہ دیا۔ آپ تین ماہ کے لئے چھٹی چلے جائیں اور مجھے ایک خط لکھ دیں کہ کمانڈر انچیف اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کریں۔ ایوب خان نے مجھے طلب کیا اور خط ڈرافٹ کرنے کا حکم دیا۔ میں خط دینے ان کے دفتر گیا تو انہوں نے کہا۔ تم یہ نہ سمجھنا میں ہٹ رہا ہوں میں نے بیگی کو ہدایات دے دی ہیں اور ساتھ ہی قائل کھول کر وہ ہدایات پڑھنا شروع کر دیں جو انہوں نے بحیثیت صدر کمانڈر انچیف کو دیں۔ اسی اثناء میں اے ڈی سی اندر آیا اور بیگی خان کی آمد کی اطلاع دی۔ ایوب خان نے مجھے باہر بھیج دیا بعد ازاں بیگی خان نے خط کا ڈرافٹ دیکھا اور اس کی منظوری دے دی۔ ایوب خان کے گمان میں ہی نہیں تھا بیگی خان خط ملتے ہی شام کو مارشل لاء لگا کر آئین ختم کر دے گا اور ساری پاورزا اپنے قبضے میں لے لے گا۔ ایوب خان مارشل لاء کے بعد دو دن ایوان صدر میں رہے۔ اس دوران انہوں نے پرانی تاریخوں میں ایس ایم ظفر کا استعفیٰ منظور کیا تو جنرل پیرزادہ اور بیگی خان کو بہانہ مل گیا وہ دونوں ایوب خان کے پاس گئے اور انہیں مشورہ دیا اب آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں آپ سوات چلے گئے۔

صدر کے گھر سے صدر کی بے دخلی کا منظر بڑا دردناک تھا۔ وہاں ہم صرف ۳ شخص تھے۔ میں اے ڈی سی اور صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل رفیع ایوب خان گاڑی میں بیٹھے لیکن ٹھوڑی دیر بعد باہر آ گئے اور ایوان صدر کے اندر چلے گئے۔ واپسی پر ان کے ہاتھوں میں چند کتابیں اور کچھ کاغذ تھے جو انہوں نے اے ڈی سی کو پکڑا دیے اور خود گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی سنارٹ ہوئی انہوں نے کھڑکی سے منہ باہر نکال کر آخری مرتبہ خدا حافظ کہا اور گاڑی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں گاڑی نے آخری مرتبہ اپنے صدر کو سرکاری سیلوٹ کیا اور وہ ہمیشہ کے لئے اقتدار کے ایوانوں کو اس چھوڑ کر چلے گئے لیکن مجھے آج تک ان کے چہرے کی سلوٹیں اور لرزتے ہونٹ یاد ہیں انہیں بھول بھی کون سکتا ہے بالخصوص وہ شخص جس نے اپنی زندگی کے ساڑھے پانچ برس ان

کے انتہائی قرب میں گزارے ہوں۔

ایوب خان سے اس کے بعد میری دو ملاقاتیں ہوئیں۔ جب یحییٰ نے میرے خلاف مقدمات قائم کئے تو ایک روز میں اسلام آباد میں ان کے گھر گیا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ الطاف تم احتیاط کرو فوجی بڑی دور تک جاسکتے ہیں۔ میں تو ہٹ گیا ہوں یہ لوگ اب ساری ذمہ داری تم پر ڈال دیں گے۔ میں نے کہا۔ سر جو اللہ کرے۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب ڈھاکہ میں آرمی ایکشن شروع ہوا تو کراچی میں اصغر خان مجھ سے ملے اور کہنے لگے ان لوگوں نے وہاں کیا شروع کر دیا ہے چلو کسی سے پوچھیں میں اسلام آباد ایوب خان کے گھر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”الطاف تمہیں یاد ہے جب ہم نے اسلام آباد کا پلان بنایا تھا تو ہم نے اس شہر میں ایسی گلیاں رکھی تھیں جو آگے جا کر بند ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔ یس سر۔ تو کہنے لگے۔ یہ لوگ بھی ایسے ہی راستے پر چل نکلے ہیں جس نے آگے جا کر بند ہو جانا ہے۔ پھر کہنے لگے ان لوگوں نے حبیب الرحمن کو غدار قرار دے کر بہت بڑی غلطی کی کیونکہ اب یہ لوگ مذاکرات کس سے کریں گے؟ یہ ان سے آخری ملاقات تھی پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بیوہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا ایوب خان میرے لئے کچھ کاغذ چھوڑ گئے تھے میں نے وہ کاغذ مانگے لیکن ان کے بچوں نے وہ کاغذ مجھے نہیں دیا۔

یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالتے ہی مجھے سمیت ۳۰۳ سرکاری افسروں کو نکال دیا۔ مجھے ملٹری کورٹ میں طلب کیا گیا۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا مجھے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ پھر انٹیلی جنس نے وہ اخبارات شیخ اور ڈیلی نیوز میں رپورٹیں شائع کرا دیں کہ بنگلہ دیش کے نکات میں نے تحریر کئے ہیں۔ میرے بارے میں مشہور کر دیا گیا میں بنگالیوں کا ایجنٹ ہوں۔ کورمانڈر جنرل رحیم میری گفتگو شیپ کرتے رہتے۔ ایک روز انہیں مقدمہ بنانے کا موقع بھی مل گیا۔ ایک تقریب کے دوران جب مجھ سے ڈھاکہ کے فوجی ایکشن کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کہہ دیا۔ ”یہ فوج وہاں سے واپس نہیں آ سکے گی“ ایک اور جگہ جہاں ایڈمرل احسن بھی موجود تھے ایک میجر ڈھاکہ میں اپنی شجاعت کے قصے سنارہا تھا کہ کس طرح فرنیئر کاؤٹ کا کمانڈر نواب پور روڈ پر نکلا اس نے گولی چلا دی اور ۳۲ غدار بنگالی وہیں ڈھیر ہو گئے مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے با آواز بلند کہہ دیا۔ ”مجھے آج پاکستانی ہونے پر شرمندگی ہے“ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ طویل مقدمہ بازی ہوئی جس کے آخر میں جج نے ان الفاظ کو ایک محبت وطن کے الفاظ قرار دے کر مجھے بری کر

دیا لیکن مجھے پھر گرفتار کر لیا گیا اور مجھ پر ملک سے فرار ہونے ایک بوتل شراب اور دو سو ڈالر رکھنے کا مقدمہ بنا دیا گیا لیکن میرے وکیل دوست منظور قادر نے عدالت میں کیس ہوا میں اڑا دیا مجھے رہا کر دیا گیا تو بھٹو نے مجھے بلا کر کہا۔

”میری سیاسی زندگی میں کورٹ نام کی کوئی چیز نہیں۔“ میں ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا لیکن میں نے دل میں سوچا اتنا غرور انسان کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ پھر میں نے اپنی زندگی ہی میں بھٹو کو کورٹس میں دھکے کھاتے دیکھا کورٹ ہی نے اسے سزا سنائی اور اسی کورٹ کے حکم سے اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا افسوس میرا دوست ذوالفقار علی بھٹو اپنے ہی غرور کے ہاتھوں مارا گیا۔

بہر حال وہ جیلوں قیدیوں اور کورٹ پکچریوں کا دور تھا۔ اس میں نظر بندی بھی تھی اور قید تنہائی بھی۔ یحییٰ خان کے ظلم بھی تھے اور بھٹو کی دوست نشی بھی۔ میں کس کس کا ذکر کروں کبھی مجھے بنگالیوں کی حمایت کا سزاوار قرار دیا گیا کبھی ”ڈان“ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے فوج اور حکمرانوں سے اوارتی جواب طلبی کا مجرم لیکن میں شرمندہ بالکل نہیں ہوں کیونکہ وہ دور میرے بچے کا دور تھا۔ سترہ لاکھ کی زہر خوری اور منصور کی سولی کا دور تھا۔

جج ہے برے وقت میں خدایا داتا ہے۔ یحییٰ خان نے جب مجھے قید خانے میں پھینکا تو میرا اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہو گیا۔ قید تنہائی کے دوران میں نے خدا کو یاد کیا۔ مجھے جس مکان میں رکھا گیا تھا اس کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کسی حافظ نے تلاوت قرآن پاک شروع کر دی۔ وہ الفاظ میرے لئے قبولیت کا پیغام بھی تھے اور زندگی کے ایک نئے دور کی نوید بھی۔ پھر میں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ طلب کیا اور روز کے تین صفحے پڑھنا شروع کر دیئے۔ اس دور میں فکر دین تھی۔ قرآن فہمی کا جنون تھا اور اپنے پروردگار کی نظر کرم کی طلب تھی اور اسی طلب میں ایک روز قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کر دیا۔ پتہ نہیں ترجمہ کیسا رہا لیکن نور بصیرت سے میرا سینہ ضرور روشن ہو گیا۔

صاحبو! میں نے اس ملک کو جتنے دیکھا اس میں اسلامی شخص اور اس کی شناخت ابھرتے دیکھی۔ پھر اسی شناخت کو نوٹے اور گم ہوتے بھی دیکھا۔ میرے سامنے نور ائیدہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے ان تمام سیاستدانوں کو غدار قرار دے کر بے دخل کر دیا گیا جنہوں نے پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی تھی اور ان کے بعد ۶۹ ارکان کی اسمبلی میں جاگیر دار زمیندار اور

میور و کریت رو گئے پھر خان لیاقت علی خان غلام محمد اور چودھری محمد علی سمیت تمام بڑے بڑے سیاستدان صرف اس لئے ملک میں انتخابات کرانے سے گھبراتے رہے کہ یہاں ان کا کوئی اپنا حلقہ نہیں تھا اور انہیں شکست کا خوف تھا۔ اور صاحبو! میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ان لوگوں نے فضل حق کو غدار قرار دیا پھر اسے وزیر اعلیٰ بنادیا پھر غدار کہا پھر ہوم منسٹر بنایا ان لوگوں نے سہروردی کو غدار قرار دیا پھر وزیر اعظم بنادیا پھر غدار قرار دے کر بے دخل کر دیا۔ ان لوگوں نے مجیب کو غدار قرار دیا پھر اس سے مذاکرات کئے۔ پھر غدار قرار دیا اور پھر جیل سے باہر لا کر اپنے سامنے بٹھا دیا۔ پھر بھٹو نے ایوب خان کو مجرم قرار دیا 'یکٹی' خان نے بھٹو کو صدر بنادیا۔ پھر اسے پاکستان توڑنے کا مجرم قرار دیا اور پھر وزیر اعظم پھر مجرم اور پھر پھانسی پر چڑھا دیا اور صاحبو! اب بھی لوگ الطاف حسین کو غدار قرار دے رہے ہیں۔ اس شخص کو جس کے ساتھ ۶۰ لاکھ لوگ ہیں اور وہ وہاں لندن میں بیٹھ کر ہڑتال کی کال دیتا ہے تو سارا شہر بند ہو جاتا ہے۔ صاحبو! مجھے دوبارہ ایوب خان کے الفاظ یاد آ رہے ہیں کہ یہ لوگ ایسے راستے پر چل پڑے ہیں جس نے آگے جا کر بند ہو جانا ہے اور جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں.... صاحبو! میرا اور آپ کا خدا حافظ۔

● — — — ●

”جاوید! میں بابا نہیں ہوں“

میں نے اپنے بابا سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا مجھے بابا نہ بنا دینا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں۔ باباؤں کی پابندیاں سہہ نہیں سکتا۔ میں ایک عام انسان کی طرح جینا چاہتا ہوں۔ یہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے میرے اندازے کے مطابق تجھے بھرتی کر لیا گیا ہے۔ آج کل بھرتی ہو رہی ہے چونکہ جسے نشاط ثانیہ کہتے ہیں (میں دورِ جد و جہد کہتا ہوں) وہ قریب آ گیا ہے۔ مجاہد مزاج افراد کو بھرتی کیا جا رہا ہے۔ پھر Condition کیا جائے گا۔ پھر ان سے کام لیا جائے گا۔ انہیں احساس نہیں دیا جائے گا کہ انہیں بچن لیا گیا ہے۔ تمہیں اس لیے چنا ہے کہ تم میں دونوں خوبیاں موجود ہیں ذہن اور عمل۔ دونوں بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں۔ یاد رہن ہوتا ہے اور یا عمل لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے اس لیے ملایا گیا تھا کہ میں تمہیں حوصلہ دے سکوں کہ یہ تبدیلی تعمیری ہے، تخریبی نہیں۔ پروفیسر میرے بابا کو نہیں مانتا۔ میں پروفیسر کو مانتا ہوں۔ وہ سول سروس میں ہے اس لیے کھل کر بات نہیں کرتا۔ پابند ہے۔

آج کل اس کی ڈیوٹی فوج پر لگی ہوئی ہے۔ ابھی ابھی کوئے سے آیا ہے۔

لگتا ہے اسی سال کے آخر تک یا اگلے کی ابتداء میں کچھ ہونے والا ہے۔ Great  
dourgs are ahead تم خوش قسمت فرد ہو کہ تم کو چن لیا گیا ہے۔ یہ سب میرے اندازے ہیں۔

ممتاز مفتی

میں یہ خط پڑھ کر حیران رہ گیا، ان دنوں میں روزنامہ پاکستان اسلام آباد میں نیوز ایڈیٹر تھا۔ یہ ۱۹۹۴ء کی بات تھی اس وقت تک میں نے کسی اخبار کسی رسالے میں ایک سطر نہیں لکھی تھی اور نہ ہی مجھے راسٹر بننے کی خواہش تھی البتہ مجھے لڑ پڑا ہونے کا شوق تھا۔ مفتی صاحب سے میرا

ممتاز مفتی صاحب کے ساتھ میرا تعلق ایک خط کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ میں ایک دوست کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے گیا۔ وہ ملے اور ہم واپس آ گئے۔ دوسری ملاقات میں ان سے عرض کیا۔ ”مفتی صاحب آپ میں بے تحاشہ کشش ہے۔ آپ مجھے با بے لگتے ہیں۔“ وہ اٹھے دوسرے کمرے میں گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ انہوں نے وہ لفافہ مجھے تھما دیا۔ میں لفافہ لے کر گھر آ گیا۔ اس لفافے سے ایک خط برآمد ہوا۔ یہ خط آگے چل کر ہمارے تعلق کی بنیاد بن گیا۔

اس سے پہلے کہ بات آگے چلے آپ مفتی صاحب کا خط ملاحظہ کیجئے۔

تعارف یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ میں نے یونیورسٹی میں ممتاز مفتی کو پڑھنا شروع کیا تو وہ میرے دل میں کھب گئے۔ میں ۱۹۹۳ء میں اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ دو سارا سال مشقت اور جدوجہد کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۹۴ء کے شروع میں ایک دوست کے ساتھ میں مفتی صاحب کے گھر پہنچ گیا ان سے ملاقات ہوئی اس ساری ملاقات کے دوران میں خاموش رہا جبکہ میرا دوست اور مفتی صاحب گفتگو کرتے رہے میں اٹھنے لگا تو مفتی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے پیار سے بولے۔ ”جاوید تم مجھے اچھے لگے ہو میرے پاس آتے جاتے رہا کرو“ میں نے عقیدت سے ان کے ہاتھ پر ہوسہ دیا اور واپس آ گیا۔ دوسری ملاقات بھی ان کے گھر ہی میں ہوئی اس ملاقات کے دوران میں نے ان سے عرض کیا ”میرا دل آپ کی طرف کھینچا چلا آتا ہے“ انہوں نے قہقہہ لگایا ”میرا ہاتھ دیا اور اندر چلے گئے بس منٹ بعد واپس آئے اور ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھا دیا یہ خط اس لفافے سے برآمد ہوا تھا اس ملاقات کے دوران انہوں نے پیشین گوئی کی ”جاوید تم کبھی بہت مشہور رائٹر بنو گے“ میں تو اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا لیکن پورے ملک میں تمہارے ڈائریکٹس ہیں ان کی بات قہقہے میں اڑا دی۔ تیسری ملاقات میں انہوں نے بتیجی لہجے میں فرمائش کی۔ ”تم لکھنا شروع کیوں نہیں کرتے؟“ میں نے کہا۔ ”میں نے زندگی میں ایک نظر نہیں لکھی“ فرمانے لگے۔ ”لیکن تمہارے اندر ٹیلنٹ ہے تم لکھ سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ نے آج تک میری کوئی تحریر نہیں پڑھی۔“ ہنس کر بولے۔ ”میں ایک بار تربوز خریدنے گیا“ میں نے تربوز بیچنے والے بابے سے کہا ”مجھے فلاں تربوز دو“ بابے نے کہا ”بابو جی وہ تربوز نہ لیں وہ اندر سے کچا ہے آپ یہ لے لیں یہ اندر سے سرخ ہے میں نے بھی تمہاری طرح بابے سے پوچھا بابا تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو بابے نے جواب دیا ”بابو جی مجھے تربوز بیچتے ہوئے ۵۰ برس ہو چکے ہیں اگر مجھے آج بھی تربوز کی پہچان نہیں ہوگی تو مجھ پر لاکھ لعنت۔“ دو ذرا دیر کے لیے رکے اور پھر ہنس کر بولے۔ ”میں ۶۰ سال سے لکھ رہا ہوں اگر ۶۰ سال بعد بھی مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ کس میں لکھنے کا ٹیلنٹ ہے اور کس میں نہیں تو مجھ پر بھی لاکھ لعنت ہو۔“ میں ہنس پڑا۔ واپسی پر مجھے ان کی بات یاد آتی رہی لیکن دل اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر میری ان کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ میں ان سے تقریباً روزانہ ملنے لگا وہ ہر ملاقات پر پوچھتے ”کا کا تم نے لکھنا شروع کیا“ اور میں ان سے کہتا ”پھد مفتی جی مٹی پاؤ“ لیکن وہ مٹی ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھے وہ مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ایک روز ان سے عرض کیا۔ ”ٹھیک ہے مفتی جی

میں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔ ”بولے۔ ”کیا؟“ میں نے عرض کیا۔ ”میں اپنی زندگی کا پہلا مضمون آپ پر لکھوں گا۔“ انہوں نے فوراً ہاں میں گردن ہلا دی اس رات میں نے اپنی زندگی کا پہلا مضمون لکھا یہ مضمون مفتی صاحب کے بارے میں تھا ”آپ مفتی صاحب کی شخصیت پر مزید گفتگو سے پہلے وہ مضمون پڑھ لیں“ یہ مضمون میری ابتدائی تحریر تھا لہذا اس میں بے شمار خامیاں تھیں لیکن اس کے باوجود مفتی صاحب نے اس کی تعریف فرمائی ”یہ ان کی ذات کا بڑا پن ان کا ظرف تھا۔“

”ممتاز مفتی ہمالیہ ہے۔“

اس سے دور رہنے والا سکھیں نہ قریب رہنے والا خوش۔ جو دور ہے وہ ہر وقت ”روزے دی جالی چم لین دے“ کا ورد کر رہا ہے اور جو قریب ہے وہ ”یا اللہ بچا“ کی تسبیح کر رہا ہے لیکن وہ ہمالیہ کی طرح ایسا دو ہے۔ خاموش باوقار سیدھا۔ نہ دوری کا غم نہ قربت کا اندیشہ جو قریب ہے اس سے لا تعلق اور جو دور آس لگائے بیٹھا ہے اس سے نا آشنا کوئی آجائے، آجائے، کوئی اٹھ کر چلا جائے، چلا جائے، وہ آنے والے کا سوا گت کرے گا نہ جانے والے کو روکے گا، اس کے سامنے چائے کا ایک کپ دھرا ہے وہ چپ چاپ اسے اٹھا کر پی جائے گا اور سامنے شخص کو جھوٹے منہ تک سے نہیں پوچھے گا۔ سگریٹ کی طلب ہوئی تو پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگائے گا اور مزے سے ناک منہ سے دھواں اٹھنے لگے گا پر مجال ہے جو دوسرے کو سگریٹ پیش کر دے۔ پوچھیں تو آنکھ مار کر کہے گا، میں منہ پھٹ ہوں اور منہ پھٹ لوگوں کو پسند کرتا ہوں جسے طلب ہے وہ کہنے چائے ہوئی تو پیش کر دوں گا نہ ہوئی تو افسوس میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کروں گا، اور کہنے والا اکھیلائی ہنسی ہنس کر خاموش ہو جاتا ہے کیونکہ ممتاز مفتی ہمالیہ جو ہوا۔

جو ممتاز مفتی کو پڑھتا ہے وہ کہتا ہے ”مفتی یہ ہے لیکن جو ملتا ہے وہ کہتا ہے نہیں ممتاز مفتی وہ نہیں وہ یہ ہے۔ یہی سوال جب اس سے پوچھا

جاتا ہے تو وہ مزے سے کہتا ہے صاحبو! نہیں میں نہ وہ ہوں اور نہ یہ بلکہ میں دھوکہ ہوں۔ جب میں ایلٹی ہوتا ہوں تو اس وقت میرے اندر ممتاز مفتی قہقہے لگا رہا ہوتا ہے جب میں ممتاز مفتی بن کر تخت پر بیٹھتا ہوں تو میرے اندر ایلٹی بغلیں بجا رہا ہوتا ہے۔ جب میں ممتاز ہوتا تو میں اس وقت ممتاز نہیں ایلٹی ہوتا ہوں اور جس وقت ایلٹی ہوتا ہوں تو اس وقت میں ایلٹی نہیں ممتاز ہوتا ہوں۔ یا حیرت اب کیا کہئے؟ کیا سمجھئے؟ یہ ڈور ہے یا الجھاؤ؟ سمجھئے لگیں تو الجھ جاتے ہیں الجھئے لگیں تو سمجھ جاتے ہیں اکثر ایسا بھی ہوا کہ کوئی ممتاز مفتی سے ملنے گیا تو اسے ایلٹی مل گیا اور کوئی ایلٹی سے ملاقات کے لئے گیا تو اس کا پاؤں ممتاز مفتی سے پڑ گیا اب جھگڑو جب ممتاز مفتی بول رہا ہو تو ایمان کی دستار پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے ”اللہ تعالیٰ بچہ ہے لاکھ گناہ کرو شرک کرو حکم عدولی کرو جب احساس ہو جائے تو سر جھکا کر کھڑے ہو جاؤ وہ فوراً خوش ہو جائے گا“ اللہ تعالیٰ سے بیچ کر رہو اگر اسے تمہاری کوئی ادا پسند آگئی تو جیسا ڈال دے گا پھر گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے“ اور ہنس کر کہتا ہے ”اللہ تعالیٰ تو ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ میرے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے چلتا پھرتا ہے۔ میں تو اس سے تنگ آیا بیٹھا ہوں“ یہ سب کچھ ممتاز مفتی بغیر ڈر سے جھجکے رُکے کہہ جاتا ہے اور وہ کیوں ڈرے؟ کس سے جھجکے؟ کہاں رُکے؟ کیونکہ وہ ہمالیہ جو ہوا اور ایلٹی کو اس کے سامنے بیٹھنے سے پہلے ہزار ہزار مرتبہ سوچنا پڑتا ہے روایت کہتی اخلاق بچاؤ۔ اخلاق کہتا ہے میری خیر ہے عقل بچاؤ عقل قہقہہ لگا کر کہتی ہے مجھے چھوڑ ذرا دل کو سنبھالو۔ اور جب ایلٹی بولتا ہے تو بولتا ہی چلا جاتا ہے کہتا ہے ”یورپ کی عورت نے ننگا ہو کر حسن کھودیا ہے“ کہتا ہے ”گورے سوچ رہے ہیں اب ہماری نسل کیسے بڑھے گی کیونکہ مردوں کو عورتوں میں کشش ہی محسوس نہیں ہو رہی“ ممتاز مفتی دانشوروں میں خوش رہتا ہے اور ایلٹی لڑکے بالوں میں خوب پھلتا پھولتا ہے۔ لیکن اس سے پوچھیں تو وہ کہتا ہے نہیں میں تو دھوکہ ہوں دانشوروں

میں ایلٹی ہوتا ہوں اور نو جوانوں میں ممتاز مفتی اب کیا کہئے۔ چپ ہی رہے ہم اسے قائل نہیں کر سکتے ہم اسے منا بھی نہیں سکتے کیونکہ یہ ہمالیہ جو ہوا۔

ممتاز مفتی جسے ناپسند کرتا ہے اس کے سامنے سر سے پاؤں تک بجز بن جاتا ہے دشمن کو پیار سے بلائے گا مسند پر بٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرے گا کنگی پٹی کر کے اس کی آنکھوں میں سرما لگائے گا پھر ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا مہاراج سارے جہاں میں آپ ہی آپ ہیں آپ کا یہ داس آپ کے سامنے کیا ہے ہاتھی کے سامنے چیونٹی اور جب دشمن کا سینہ غرور سے پھول جائے گا گردن فخر سے تن جائے گی تو مفتی کو ایک عجیب تسکین محسوس ہوگی ایک ایسی تسکین جو صرف مفتی ہی کو محسوس ہو سکتی ہے کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں لیکن جب مفتی کسی سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے پیچھے ڈنڈا لے کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے وہ اسے خوب ڈانٹے گا بھری محفل میں اس کی بے عزتی کرے گا اس پر نکتہ چینی کرے گا اور بات بات پر وہ بگڑے گا اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ شخص اس سے ناراض ہو جائے۔ بھاگ جائے دور ہو جائے اور ہاں ایک اور بات جس سے اسے جتنا اختلاف ہو گا وہ اسے اتنا ہی دوست سمجھے گا۔ خود کہتا ہے وہ فکری طور پر اشفاق احمد اور احمد بشیر کا سخت دشمن ہے لیکن پچھلے چالیس برس سے وہ جب بھی لاہور جاتا ہے تو وہ صرف انہی دونوں کے گھر ٹھہرتا ہے۔ پوچھا جائے تو کہے گا میں کسی دوسرے کے پاس ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ ہے نہ ٹیڑھی لکیر پر۔ ہم کیا بگاڑ سکتے ہیں کیونکہ یہ ہمالیہ جو ہوا۔

ممتاز مفتی پچھلے ۶۰ برسوں سے لکھ رہا ہے ان ۶۰ برسوں میں اسے پڑھنے والوں کو اردو آگئی لیکن وہ آج تک اردو نہ لکھ سکا۔ اس کا کہنا ہے اس نے آج تک اردو ادب نہیں پڑھا اسے اردو سرے سے نہیں آتی وہ صبح بیدار ہونے سے رات سونے تک پنجابی بولتا ہے۔ انگریزی ادب

پڑھنے کی وجہ سے ہمیشہ انگریزی میں سوچتا ہے، لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہے تو سوچ ایک اجنبی زبان میں ترجمہ ہو کر کاغذ کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ زبان اس کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ وہ زبان کیا ہے اسے صرف ممتاز مفتی کے چاہنے والے جانتے ہیں کیونکہ وہ چاہت، سادگی، ابلاغ اور احساس کی زبان ہے۔ مفتی نے زندگی میں ہمیشہ کہنے کے لئے نہیں بلکہ پہنچانے کے لئے لکھا چنانچہ اس کا ایک ایک لفظ وہاں پہنچ گیا جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ اس نے بھی لکھ کر نہیں کاٹا کیونکہ اس کا خیال ہے اس سے بات کا فطری پن مجروح ہوتا ہے بات وہ نہیں رہتی جو اسے ہونا چاہیے اس لئے ممتاز مفتی کہتا ہے اس نے ادیب بننے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے لکھا لہذا جو پڑھے اس کا بھلا جو نہ پڑھے اس کا بھی بھلا۔ میرا ذاتی خیال ہے ممتاز مفتی لکھنے سے قبل اس پر کچھ پڑھ کر پھونکتا ہے اسی لئے اس کے فقرے آگے ہوتے ہیں۔ ایسی آگے جو انسان کو اندر سے جلا کر رکھ کر دیتی ہے۔ اور رکھ بھی وہ جس میں ہر لمحہ چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں۔ اسے پڑھنے والا یا اس کے قریب رہنے والا وہ نہیں رہتا کچھ اور ہو جاتا ہے۔ میں نے خود کئی لوگوں کو اور ہوتے دیکھا لیکن جب اس سے پوچھا جائے تو وہ آنکھیں میچ کر کہتا ہے ”میں بابا نہیں ہوں میں نے اپنے بابے سے کہا تھا مجھے بندر بنا دینا لیکن بابا نہ بنانا“ مجھے یقین ہے ممتاز مفتی نے اپنے بابے سے یہ ضرور کہا ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ شخص اس طرح بات نہ کرتا تو ممتاز مفتی نہ ہوتا کوئی اور ہوتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے بابے نے اس کی درخواست مان بھی لی ہو لہذا لوگوں کو ممتاز مفتی میں وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو بابوں میں ہوتا ہے یا پھر بابوں میں ہونا چاہیے۔ تاثیر کی بھیک برابری کا مزہ اور کبھی کبھار کشف کے چھینے اس میں سب کچھ ہے لیکن کون ہے جو اس سے یہ راز اگلو اسکے کیونکہ ممتاز مفتی ہمالیہ ہے اور ہمالیہ کا کام راز اگلتا نہیں دفن کرنا ہوتا ہے۔

ممتاز مفتی کا نام ممتاز ہے لہذا اس کی شخصیت سے انوکھا پن

نکال دیا جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ اس کی ہر بات زبانی ہے۔ اسے کوئی ابا نہیں کہتا۔ بچے تو رہے ایک طرف اس کے پوتے اور نواسے تک اسے یار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے وہ پاکستان بننے سے قبل باپ بن چکا تھا لیکن یہ حرکت جسم کی حد تک محدود تھی کیونکہ وہ آج تک ذہنی طور پر باپ نہیں بن سکا۔ اس کا بیٹا جوانی میں اس سے ہر بات بھاگ دہل کہہ دیتا جو عموماً نو جوان اپنے قریبی راز دار ہی سے کہتے ہیں اور وہ بھی کان میں۔ اس حرکت کو بعد میں پیدا ہونے والے بچوں نے خاندانی روایت جانا لہذا آج اس کے پوتے اور نواسے بھی اس سے ان ”دو طرفہ امور“ پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں جن کا کوئی باپ متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا کیا جائے ممتاز مفتی اپنی عمر کے ہاتھوں مجبور ہے کیونکہ جب وہ ۱۶ سال کا تھا تو اس کا جذباتی ارتقاء رک گیا آج اس ساٹھ کو ۷۲ برس گزر چکے ہیں لیکن وہ اپنی جوانی کو اسی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے جس طرح ہائیل کانبل کو مارنے کے بعد لئے پھرتا تھا۔ اس کی محفل میں کبھی جزییشن گیپ مسئلہ نہیں بننا۔ ہر دور میں نو جوان اس کے یار رہے ہیں۔ آج سے چھاس سال پہلے بھی اور اب بھی۔ دوسروں کے برعکس (جن میں تارڑ سمیت بے شمار لوگ شامل ہیں۔ جو دوسروں کے بچوں کو ”خراب“ کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔) ممتاز مفتی کا پہلا وار ہمیشہ اپنے گھر پر چلا۔ عکسی جب جوان ہوا تو ممتاز مفتی نے اسے فوراً ”کرپٹ“ کر دیا وہ اسے سارا سارا دن کراچی کی سڑکوں پر لئے پھرتا تھا اسے فلموں کی ترغیب دیتا، شرطیں لگاتا تھا اور ہر فنش بات پر ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا۔ جب تک عکسی جوان رہا مفتی اس کا سب سے گہرا اور اچھا یار رہا پھر عکسی میں سنجیدگی آ گئی جو عموماً ادھیڑ عمر میں آتی ہے تو ممتاز مفتی نے ایک سعادت مند برخوردار کی طرح اس کا ادب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی موجودگی میں سگریٹ پیتا اور نہ اونچی آواز میں بات کرتا ”چپ بابا سو رہے ہیں۔“ ممتاز مفتی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پوتوں کو سمجھاتا۔ ان دنوں ممتاز مفتی بہت ادا اس رہتا تھا اسے

رہنا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ کون سا نو جوان ہے جو ایسے بزرگ کے ساتھ ایک گھر میں سہولت کے ساتھ رہ لے جو ۵۰ برس قبل اس کا بیٹا اور ۳ سال پہلے تک دوست تھا۔ یہ ادا سی فراریت بنی اور ممتاز مفتی گھر سے باغی ہو گیا ان دنوں اس نے اداس نو جوانوں کی طرح دو ایک معاشقے بھی کئے جو روایتی بندشوں کے باعث ناکام ہو گئے۔ چنانچہ مجبوراً صبح کا بھولا شام کو واپس آ گیا لیکن گھر میں اس کے لئے سر پرانز تھا۔ اس دوران اس کے پوتے جوان ہو چکے تھے۔ ممتاز مفتی اپنے ہم عمر دیکھ کر کھل اٹھا۔ اب وہ خوش ہے تحفلیں بھتی ہیں باتیں بنتی ہیں اور قہقہے لگتے ہیں لیکن جب یہ نو جوان اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو ممتاز مفتی اچانک خاموش ہو جاتا ہے مجھے پتہ ہے یہ خاموشی دانشور ممتاز مفتی کی خاموشی نہیں ایل کی چپ ہے اور وہ اس وقت یقیناً کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ ان نو جوانوں کی جوانی ”فریز“ کر سکے تاکہ یہ بڑے نہ ہو سکیں یہ نہیں رک جائیں ان کے چہرے پر شرارت ٹھہر جائے ان کے بالوں پر کبھی متانت کا سفید بال نظر نہ آئے کیونکہ اسے خدشہ ہے اگر ایسا ہو گیا تو اس کے گھر میں دو تین بزرگوں کا مزید اضافہ ہو جائے گا جس کے بعد اس کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی اور اسے بیک وقت چار چار پوزٹوں کو سنبھالنا پڑے گا۔ سب کا خیال رکھنا پڑے گا اور وہ ادب کی وجہ سے کسی کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکے گا اور یہ سب کچھ نو جوانوں کے بس کی بات نہیں یقیناً کوئی اور نو جوان بھی وہ جس کی عمر ۹۰ سال ہو اور خواہ وہ ہمالیہ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ ایک بے ہتھم فضول اور بے ربط سا مضمون تھا یہ غالباً مارچ ۱۹۹۳ء میں روزنامہ پاکستان میں شائع ہوا اور ممتاز مفتی صاحب کے سوا کسی نے اس کا نوٹس تک نہ لیا میں اس شام ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے اٹھ کر میرا استقبال کیا مجھے گلے لگایا اور جادو گروں کے لہجے میں بولے۔ ”تم نے کام شروع کر دیا ہے اب اسے بند نہ ہونے دینا“ لیکن میں نے ان کے مشورے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا میں نے کام بند کر دیا وہ روز مجھ سے اصرار کرتے میں ہنس کر ٹال دیتا۔

میرا خیال تھا میرے اندر لکھنے کا ٹیلنٹ ہی نہیں اور مفتی صاحب جان بوجھ کر میرے ساتھ گیم کر رہے ہیں۔ جب وہ کہہ کہہ کر تھک گئے تو ایک روز کہنے لگے ”تم انٹرویوز کا سلسلہ کیوں شروع نہیں کرتے“ میں نے پوچھا ”کیا مطلب؟“ بولے ”تم مختلف لوگوں کے انٹرویوز کرو یہ سلسلہ بہت پاپولر ہوگا۔“ مجھے ان کی بات میں وزن لگا لہذا میں نے عرض کیا ”ایک شرط ہے“ انہوں نے قہقہہ لگایا ”تم چاہتے ہو میں تمہیں انٹرویو دوں“ میں نے بھی قہقہہ لگا دیا۔ انہوں نے فرمایا ”چلو بسم اللہ کرو اسی وقت انٹرویو کرو“ میں نے ان سے کاغذ لئے اور ان ہی کی بال پوائنٹ اٹھائی اور انٹرویو شروع کر دیا۔ یہ ایک حیران کن انٹرویو تھا اس انٹرویو میں انہوں نے اپنی ساری فدا سنی بدل دی انہوں نے اپنے کام اپنے سارے عزیز رشتے داروں اور دوستوں کا چہرہ ہی بگاڑ دیا۔ ہم نے اس انٹرویو کی چند جھلکیاں ۹ مئی ۱۹۹۳ء کو ”روزنامہ پاکستان“ اسلام آباد میں شائع کیں تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مفتی صاحب پر اتنا زیادہ دباؤ پڑا کہ انہوں نے مجھے تحریر تفصیلی انٹرویو شائع کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے ان کے اس حکم کا احترام کیا لیکن ڈیڑھ سال بعد جب ان کا انتقال ہوا تو ہم نے وہ انٹرویو دوبارہ شائع کر دیا۔ ایک بار پھر ہنگامہ ہو گیا یہ انٹرویو اب تک بے شمار اخبارات رسائل جرائد اور کتب میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کی نذر کرتا ہوں۔ اس انٹرویو سے بھی آپ کو مفتی صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔

سوال: چلئے شہاب صاحب کی باتیں کریں۔

جواب: شہاب میں بہت خرابیاں تھیں مثلاً وہ ”لیس سر“ کہنے والا انسان تھا جو اس کے پاس نے کہہ دیا اس کی ادائیگی شہاب کی ذمہ داری ہوگی۔ جب بھی کسی بڑے افسر کا فون آتا وہ سر پر ٹوپی رکھ کر کھڑے ہو کر بات کرتا۔ اس کی دوسری خامی صدر ایوب تھا۔ ایوب کو ایوان اقتدار تک پہنچانے میں چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ قدرت اللہ شہاب کا بھی ہاتھ تھا۔ جب سکندر مرزا نے غلام محمد کو فارغ کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تو کراچی کی ایک خاتون عطیہ موجود نے، جو مستقبل بنی کی قدرتی صلاحیت رکھتی ہے کہنا شروع کر دیا۔

Tell this block headed pathan I see his corps on a gun.

کسی نے یہ بات ایوب کو بتادی پہلے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا پھر متردّد ہو گیا شہاب سے

اس کی یاری تھی۔ اس نے عطیہ سے رابطے کی ذمہ داری شہاب کی لگا دی۔ دوسرے روز میں اور شہاب عطیہ کے پاس چلے گئے عطیہ نے بتایا کہ میں ریل گاڑی میں فلاں دن فلاں فلاں قسم کی تین بیگمات دیکھ رہی ہوں۔ یہ بیگمات ایوب کو زبردستی کے لئے نکلی ہیں۔ تحقیقات ہوئیں اور وہ بیگمات ٹرین سے واقعی پکڑی گئیں۔ بعد ازاں شہادت اور چند دوسرے لوگوں نے ایوب کو مجبور کیا کہ وہ سکندر مرزا کو نکال باہر کریں۔ شہاب نے ایوب کی پیش بہادری کی شہاب کی غلطی تھی۔ یہاں شہاب مار کھا گیا۔ میں نے شہاب سے کہا اس میں کوئی شک نہیں ایوب خان میں بہت خوبیاں ہیں لیکن وہ دانش مند نہیں شہاب نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ وہ ایوب خان کو انتہائی دانشمند اور بہتر انسان سمجھتا تھا۔ تیسرا قدرت اللہ شہاب بھی میری طرح احساس کمتری کا شکار تھا۔ بنیادی طور پر نیک تھا مگر کمزور آدمی تھا۔ اس میں جنس مخالف کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ چھوٹا سا تھا وہ غیر متاثر کن شخصیت تھی لیکن اس کے باوجود خواتین اس میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ امریکہ نے شہاب کے پیچھے ایک فرانسیسی خاتون لگا دی وہ دو برس تک اس کی جاسوس کرتی رہی۔ دو برس بعد اس نے خود ہی شہاب کو بتا دیا۔ میں نے حیران ہو کر اس بی بی سے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگی امریکہ شہاب کو روس کا ایجنٹ سمجھتا ہے چنانچہ شہاب کو ایوب کے قریب برداشت نہیں کر پاتا۔ ”شہاب نامہ“ کا صرف آخری باب آدھا بچا ہے۔ میں نے شہاب سے کہا اگر آپ نے سچ نہیں لکھنا تھا تو کتاب ہی کیوں لکھی وہ ہنس پڑا مثلاً میں بملا کماری کی روح والے باب کو حقیقت تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ گراموفون پر کلمہ شریف لکھ کر رکھیں تو سہگل کی آواز آنا شروع ہو جائے۔ یہاں مولوی حضرات بھوت بنگلوں میں پورا پورا قرآن پڑھ جاتے ہیں لیکن بھوت اپنا ٹھکانہ نہیں بدلتے۔ ”شہاب نامہ“ میں بعض جگہوں پر خود نمائی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ جسے میں بحیثیت نقاد برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں جب بھی ان کے پاس کوئی دوست کام لے کر گیا ان کو پسینہ آ گیا۔ وہ اپنے ماتحتوں کو بھی اس لجاحت سے بلاتا تھا کہ اس پر بے اختیار رحم آ جاتا تھا۔

اور شہاب صاحب کا روحانی پہلو۔

سوال:

جواب:

ہاں اس سے بڑا کوئی بابا مجھے نہیں ملا۔ ان میں انتہا درجے کا عجز تھا۔ پولیس کا عام سا سپاہی صدر کے سیکرٹری کو روک کر کھڑا ہو جاتا تھا اور وہ کھڑے ہو جاتے تھے۔ انتہائی ٹھہراؤ آپ جو چاہیں کہہ جائیں وہ خاموشی سے سنتے رہتے تھے۔ کبھی کسی کو ڈانٹنا نہیں، کبھی کسی کو نصیحت نہیں کی۔ آپ کہیں شہاب صاحب میں نے فلاں گناہ کیا تھا وہ اس طرح مسکرا کر دیکھیں گے جیسے داؤد سے رہے ہیں۔ راتوں کو اٹھ کر اسلام آباد کی سڑکوں پر پھرتے رہتے تھے اور پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہتے تھے جو ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ مجھ پر شہاب کے بڑے احسانات ہیں میری بات میں اس نے اثر پیدا کیا۔ مجھے کہنے کی جرأت دی۔ مجھے لوگوں کے خوف سے آزاد کر دیا، میں صرف کہہ سکتا تھا، بات پہنچا نہیں سکتا تھا۔ شہاب نے میری بات کو پہنچنے کا سلیقہ بخشا وہ اس کے دم قدم سے میری زندگی آسان ہو گئی۔ دنیا جنت بن گئی یہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ لوگ اب مجھے بھی ”بزرگ“ سمجھنے لگے ہیں۔

آپ نے ایوب خان کو کیسا پایا۔

سوال:

جواب:

صدر ایوب بنیادی طور پر کمزور شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اکثر فیصلے غلط کئے۔ کابینہ میں ان کا رویہ بھی عجیب ہوتا تھا۔ وہ کسی ایک مسئلہ پر تمام وزراء سے رائے لیتے پھر سیکرٹریوں کے سامنے مسئلہ اٹھاتے لیکن جب فیصلہ کرتے تو وہ بالکل مختلف ہوتا۔ ان کی شخصیت اس قدر کمزور تھی کہ وہ براہ راست کسی کو مورد الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا سائل کچھ یوں ہوتا تھا ”لوگ آپ کے بارے میں کہتے ہیں“ لوگوں کا خیال ہے آپ یوں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ۶ ستمبر ۶۵ء کو پاک بھارت جنگ کے موقع پر شہرہ آفاق تقریر کے دوران ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ایوب مسلمان تھے نہ ہی متعصب ان کے صاحبزادے گوہر ایوب ان دنوں اشتراکی نظریات کے حامی تھے لہذا وہ ایوان صدر میں بیٹھ کر اپنے والد کی اصلاحات کو گالیاں دیتے رہتے تھے اور ایوب خان طیش میں آ کر تنکے سے ان کی پٹائی کرتے تھے۔ ایوب میں ایمانداری ضرور تھی لیکن استقلال نہیں تھا۔ وہ بات پر قائم نہیں رہتے تھے۔ ایوب نے پاکستان کو سیکولر بنانے کا فیصلہ کیا تو شہاب نے منع کر دیا۔ ایوب نے پوچھا آپ عالمی فائدے کی بات کر رہے ہیں یا اسلامی نقطہ نظر

سے سفارش کر رہے ہیں شہاب نے کہا میں اسلامی نقطہ نظر سے بات کر رہا ہوں پاکستان اسلامی ریاست رہا تو آپ کو عالمی سطح پر بہت فائدے ہوں گے لہذا ایوب نے شہاب کی بات مان لی۔

سوال:

جواب:

آپ نے اشفاق احمد کا ذکر نہیں کیا۔ اشفاق احمد پچاس برس سے میرا راز ہے۔ میں چاہوں بھی تو اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بالکل ایسے جیسے وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔ ہم دونوں اندر سے ایک دوسرے کے بہت مخالف ہیں۔ اشفاق کے سارے ”بابے“ فراڈ ہیں۔ کہانیاں ہیں۔ دوزخیت کی انتہا کو پہنچا ہوا شخص ہے۔ جسے اپنے سوا دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اس نے زندگی بھر شہاب کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ دوسری شخصیت کا مالک ہے۔ ٹھیک ہے وہ قابل ہے لیکن اس کے بچے اس سے زیادہ قابل ہیں پر وہ انہیں اٹھنے نہیں دے رہا۔ خان میں غصہ اس قدر ہے کہ جب وہ بولتا ہے تو گھر کے برتن تک کا پھینے لگتے ہیں۔ میں نے اسے بہت پہلے کہا تھا۔ دیکھ اشفاق تو ریڈیو ٹی وی کے لئے شوق سے لکھ لیکن قلم کاری نہ چھوڑنا کیونکہ تیرا اصل ہنر یہ ہے لیکن اس نے یہ کہہ کر میری تجویز مسترد کر دی کہ ”میرا پیغام وسیع ہے اور ادب چھوٹا“ اب ٹی وی والے اسے گھاس نہیں ڈال رہے تو سخت پریشان ہے۔ میں بانو کی بہت عزت کرتا ہوں وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے لیکن میری ماں۔ میں اس کے بغیر بالکل یتیم ہوں لیکن اس نے شہاب کی ذات پر ”مردا بریشم“ جیسی تنک آمیز کتاب لکھ کر بہت زیادتی کی۔ اس نے اس کتاب میں شہاب کی بجائے اشفاق کو بڑا آدمی بنا کر پیش کیا بڑی زیادتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف نے پوری کوشش کی قاری شہاب کو اشفاق احمد سے دوتی کے طفیل بڑا آدمی سمجھے لیکن اس میں بانو کا بھی کوئی قصور نہیں وہ ادیب اور دانشور ہونے کے باوجود ”پتی پوجا“ ہے۔ اپنے خاوند کو خدا سمجھتی ہے۔ اشفاق احمد ”شہاب نامہ“ اپنے کسی پبلشر دوست کے حوالے کرنا چاہتا تھا شہاب نے مجھ سے رائے لی میں نے منع کر دیا۔ انہیں پبلشر سے تحریری معاہدے پر قائل کر لیا تو اشفاق ایک ایسا معاہدہ تیار کر کے لے آیا جس کا تمام تر فائدہ اسے پہنچتا تھا۔ میں نے شہاب کو

دوبارہ منع کر دیا لہذا اس نے صاف انکار کر دیا۔

یہ اللہ کیا ہے؟

سوال:

جواب:

اللہ، اللہ ہے لیکن ہے بالکل بچہ، آپ کفر کریں، شرک کریں، زنا کریں اور جو جی چاہے کریں جب تھک جائیں تو سر پر ٹوپی رکھ کر آنکھوں میں دو آنسو چا کر اس کے پاس چلے جائیں وہ فوراً خوش ہو جائے گا وہ فوراً مان جائے گا۔ میرا اور اللہ کا تعلق بڑا پرانا ہے۔ پہلے میں اسے مولوی کی آنکھ سے دیکھتا تھا لہذا اس سے ڈرتا تھا مجھے لگتا تھا اللہ ایک بھٹیاریں ہے جس نے دوزخ کے نام پر بہت بڑی بھٹی جلا رکھی ہے، بھٹی پروانے بھن رہی ہیں۔ لوگ بھٹی کے قریب آتے ہیں اور اللہ انہیں پکڑ پکڑ کر بھٹی میں بھونک دیتا ہے۔ پھر میں نے اللہ کو شہاب کی آنکھ سے دیکھا تو وہ فوراً صوفے پر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اب تک بیٹھا ہے میں روز اس سے باتیں کرتا ہوں وہ مجھے جواب دیتا ہے۔ ہم گھنٹوں گپیں لگاتے ہیں جو ک شیعہ کرتے ہیں۔ ہنستے ہنساتے ہیں۔ میں تھک جاتا ہوں تو اٹھ کر سونے چلا جاتا ہوں لیکن اللہ اسی طرح صوفے پر بیٹھا رہتا ہے۔ اللہ میرے ساتھ اس حد تک رہا ہے کہ میں اب اس سے تنگ آ گیا ہوں۔ ”رج“ گیا ہوں۔ میں نے بھٹیاریں اللہ اور دوست اللہ دونوں کو بڑے قریب سے دیکھا لیکن مجھے کچھ دنوں کی نہیں آئی۔ اس کے غصے اور اس کی رحمت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ مولوی معمولی سی بات پر شام کو قتل کر دے تو جنتی دانشور گستاخی کو اختلاف رائے سمجھ کر فراخ دلی کا مظاہرہ کرے تو وہ بھی جنتی، لوہے کیا بات ہوئی میں پوچھوں گا اس سے۔ وہ بہت عجیب ہے۔ بالکل عورت کی طرح میں جب اسے نہیں مانتا تھا تو سارا سارا دن اس کے خلاف تقریریں کرتا تھا لوگوں کو اس کے خلاف اکساتا تھا وہ مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ سارا سارا دن میرے پیچھے پھرتا رہتا تھا مجھے اپنی آوازوں سے لہجاتا، اپنے حسن خوبصورتی اور اخلاق سے قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن جب میں نے اسے مان لیا میں اس کا پبلک ریلیشن آفیسر بن گیا، چلیٹی میجر بن گیا تو وہ آگے آگے چل پڑا۔ اب وہ میری طرف دیکھتا تنک نہیں۔ میں نے کئی مرتبہ اس کا پلو پکڑ کر مجھ کا اس کو متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ پر ایک ترچھی نظر تنک نہ ڈالی۔ کبھی ملاقات ہوئی تو اس سے ضرور کہوں گا

”جناب اللہ صاحب اللہ اس قسم کے نہیں ہوا کرتے آپ فوراً اپنی پالیسی بدلیں۔ لوگوں میں آپ کی ریپوٹیشن متاثر ہو رہی ہے“ چلو تمہیں ایک اور کام کی بات بتاتا ہوں کبھی زندگی میں زیادہ اللہ اللہ نہ کرنا اگر اس نے جیسا ڈال لیا تو پھر کہانی ختم دنیا رہنے کے قابل نہیں رہے گی۔ درمیانے درجے کی مسلمانی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خوش قسمتی نہیں ہوتی۔

سوال: یہ بزرگ کیا ہوتا ہے؟

جواب: تو بہ تو بہ اللہ کسی کو بزرگ نہ بنائے بزرگی سے بڑی زیادتی کسی شخص کے ساتھ نہیں آتی۔ ایک دن شہاب بزرگی کی اہمیت پر روشنی ڈال رہا تھا تو میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ”شہاب خدا کے لئے مجھے گدھا بنا دو مگر بزرگ نہ بنانا۔ مجھے عام انسان رہنے دو میں افضل ہونے سے بہت ڈرتا ہوں“ آپ کو بھی جب کوئی بزرگ ملے تو اس سے صرف دنیاوی فائدے کی بات کریں اسے کسی کام یا حاجت کے چکر میں ڈال دیں اسے دل پلٹنے کی طرف نہ آنے دیں نہیں تو جانیں گے کام سے۔ دنیا سنور جائے تو آخرت بھی سنور ہی جاتی ہے۔ یہ بابا لوگ بڑے مظلوم ہوتے ہیں کوئی شہرت پر قادر ہوتا ہے کوئی عزت اور نیک نامی پر کسی کے ہاتھ میں اختیار ہوتا ہے کوئی اقتدار باغتا ہے کوئی رزق وسیع کر دیتا ہے کوئی علم دیتا ہے کوئی کچھ اور کوئی کچھ لیکن خود تلاش ہوتے ہیں۔ اپنے لئے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا وہی پیوند لگے دو کپڑے ذرا خود بتاؤ ان لوگوں کو دیکھ کر کوئی صحیح الدماغ شخص بزرگی قبول کرے گا؟ میری پوری زندگی ”بابوں“ میں گزری لیکن مجھے ان کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔ ان میں نزکیت بہت ہوتی ہے۔ ایک بابا دوسرے بابے کو تسلیم نہیں کرتا۔ بابے کی اپنی بیور کرہی ہے، فائلیں آتی ہیں جاتی ہیں کچھ ضائع کر دی جاتی ہیں کچھ بڑے عرصے تک حکم کی منتظر پڑی رہتی ہیں وہاں بھی سفارشیں چلتی ہیں۔ رشوتیں پیش کی جاتی ہیں، وہاں بھی دھونس دھاندلی، اقربا پروری کا دور دورہ ہے وہاں کا بھی کوئی انتظامی افسر پاک صاف نہیں۔ اگر وہاں سفارش نہ چلتی تو میں آج ایک باعزت شخص نہ ہوتا۔ یہ بابے عام آدمی کے لئے جس قدر موم ہوتے ہیں اپنی ذاتی محفلوں میں یہ اتنے ہی سخت تشدد دھوتے ہیں۔ بڑے بابے چھوٹے بابوں کے

ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ایک ظالم استاد گندہ پن طالب علم کے ساتھ کرتا ہے۔ مرغا بنا دیتے ہیں ڈوڈ پرید کر اتے ہیں۔ بچوں پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جسمانی اذیت بھی دیتے ہیں۔ میرے سامنے شہاب وکٹی مرتبہ اتنی مار پڑی کہ وہ کئی کئی دن تک ہسٹر سے لگا رہا۔ اسی مار سے اس کی ایک ٹانگ بھی ضائع ہو گئی۔ ان بابوں کی دنیا میں رقابت بھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے جلتے ہیں لہذا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی چغلی کرتے ہیں۔ ایک بابا کبھی برداشت نہیں کرتا کہ اس کا کوئی بالکا دوسرے بابے کے پاس چلے جائے۔ ایک بابا اپنے وظائف کی دوسرے بابے کو ہوا تک نہیں کھنے دیتا۔ یہ لوگ عجیب لوگ ہیں صاحب ان سے بچ کر رہو نہیں تو کام سے چاؤ گے۔

سوال

جواب

آپ سرفراز شاہ سے بہت متاثر ہیں؟

بالکل نہیں سرفراز شاہ میرا دوست ضرور ہے لیکن میں اسے بزرگ نہیں مانتا کیونکہ وہ بزرگوں کے ”کرائی ٹیریا“ پر پورا نہیں اترتا۔ بزرگ کی پہلی نشانی بجز ہے جو سرفراز شاہ میں سرے سے نہیں اس میں ”ہم“ کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بزرگی کی دوسری نشانی دنیا داری سے پرہیز ہے۔ سرفراز شاہ اس پر بھی پورا نہیں اترتا۔ وہ دنیا داری کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل اس نے کروڑوں روپے سے فیکٹری لگائی ڈاکٹر اشفاق حسین بے نظیر بھٹو کا پرسل فیلوشپ بنا تو اس نے جسٹس ایاس کو ڈاکٹر اشفاق کے پاس بھیج دیا اور کہا کہ بے نظیر سے سفارش کر کے اسے چیف جسٹس لگا دو خود وہ صاحب اقتدار لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے بزرگی کی تیسری نشانی گرم نامی کی تلاش ہوتی ہے۔ جبکہ سرفراز شاہ شہرت کی تلاش میں رہتا ہے اس نے مجھے اپنے اوپر مضمون لکھنے کا کہا میں نے لکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ کہا ایک اور لکھ دیا۔ تیسری مرتبہ کہا تو میں نے انکار کر دیا اور دماراٹھ ہو گیا۔ میں نے کہا سوہم اللہ بزرگی کی پوتھی نشانی کشف کے مظاہروں سے پرہیز ہے۔ بزرگ کبھی کشف کا اعلان نہیں کرتے جبکہ سرفراز شاہ کرتا ہے۔

سوال

جواب

پھر سرفراز شاہ کیا ہے؟

سرفراز شاہ عامل ہے۔ اس کے قبضے میں جنات ہیں یہ جنات لوگوں کی سوچ بڑھ کر

سرفراز شاہ کو بتا دیتے ہیں۔ خود اس نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ لوگ اس کے پاس بیٹھے تھے تو اچانک ایک جن تین چڑیلوں کے ساتھ آ گیا اور لوگ چیخیں مار کر بھاگ گئے۔ سرفراز شاہ کے مرشد یعقوب شاہ ”شکر درہ“ میں جہاں چلے کشتی کرتے رہے وہ جنات کا علاقہ ہے کیونکہ اس دس پندرہ میل کے علاقے میں آپ کو کوئی چرند پرند نظر نہیں آتا یہ جنات کی بستی کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

سوال:

آج کے دور میں کوئی سچا بزرگ ہے؟

جواب:

ہاں پروفیسر ہے۔ پروفیسر کی بات دل کو لگتی ہے۔ اثر کرتی ہے۔ یہی سچ ہونے کی سب سے بڑی علامت ہے اور یہی ایک دانشور کو بزرگ سے ممتاز کرتی ہے۔ دانشور کی بات دماغ میں اثر کرتی ہے اور بزرگ کی دل پر، دماغ پر اثر کرتی ہوتا ہے لیکن دل پر اثر ہوتا ہے تو بندہ بھیگ جاتا ہے اور سے اور ہو جاتا ہے اور پروفیسر کی بات دل تک پہنچتی ہے۔ دوسرا پروفیسر کا طریقہ کار منفرد ہے وہ علم کے زور پر بزرگ بناتا ہے۔ عالم سے عالم شخص بھی اس کی ضرب سے نہیں بچ سکتا۔ اگلا زمانہ پروفیسر کا زمانہ ہے۔ باقی سارے بزرگ اس سے پیچھے رہ جائیں گے۔

سوال:

اسلام پر آپ نے رائے نہیں دی۔

جواب:

اسلام دو ہیں۔ ایک مولوی کا جاہل اسلام دوسرا اللہ کا علم اور عمل میں گوندھا اسلام۔ بدقسمتی سے رائج اسلام مولوی کا اسلام ہے۔ اسی لئے مسلمان تیزی سے تنہا ہو رہا ہے۔ ماڈرنائف اسے قبول نہیں کر رہی وہ بنیاد پرست اور ”فکڈ امین ٹلسٹ“ بن کر رہ گیا ہے۔ پاکستان میں اگر دس ہزار مساجد ہیں تو ہر مسجد میں ایک جاہل اور ان پڑھ شخص اسلام کے بارے میں ”اوس انفارمیشن“ پھیلا رہا ہے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں اور تو اور اسلام آباد کی لال مسجد میں جہاں ہر نمازی ۲۰ گریڈ کا افسر ہوتا ہے امام خطبہ دیتا ہے تو کہتا ہے جرائیں پہن کر نماز پڑھنے سے نماز فسق ہو جاتی ہے اور سینکڑوں کے مجمعے سے کوئی ایک شخص بھی کھڑا ہو کر اس مولوی کو اس جہالت پر نہیں ٹوکتا اور کوئی نوکنے کی جرأت کرے بھی کیسے جو کھڑا ہو گا وہ زشدی بن کر قابل گردن زنی ہو جائے گا۔ اس کا مردہ تک جلا دیا جائے گا۔ خدا جس قدر وسیع قلب ہے مولوی اسے اسی قدر تنگ نظر بنا کر پیش کر رہا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہیں مولوی سے

نفرت ہماری آئندہ نسل کو عیسائیت، یہودیت یا دہریت قبول کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ شہریت تو ہماری نسل تبدیل کر رہی ہے۔ اصل اسلام امن ہے آشتی ہے، رواداری ہے، وسیع القلبی ہے۔ وہ سارے وصف جو نبی اکرمؐ کے تھے اسلام کی بنیاد ہیں جو اسلام اختلاف رائے کی اجازت نہیں دیتا ”کفار مکہ“ کے اعتراضات کو خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کرتا اسلام نہیں ہو سکتا بلکہ وہ تو مذہب بھی نہیں ہو سکتا۔ کیا مولوی کا اسلام اس کوئی پرپورا اترتا ہے؟ جواب دیں اگر آپ نے آج جواب نہ دیا تو کل کو تو آپ کو جواب دینا ہی پڑے گا لیکن مجھے افسوس ہے میں آپ کا جواب سننے کے لئے موجود نہیں ہوں گا۔

سوال:

کیا آپ خود مسلمان ہیں؟

جواب:

میں اندر سے مسلمان ہوں، ایمان سے لبالب اللہ کے شیرے میں لتھڑا ہوا جیسے جلیبی شیرے میں لتھڑی ہوتی ہے لیکن میرا ظاہر مسلمان نہیں۔ میں نے اپنے ظاہر کو مسلمان کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ممتاز مفتی ہی رہا۔ تنگ آ کر میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو باہر سے ایمان ہی ایمان ہوتے ہیں مسلمان ہی مسلمان ہوتے ہیں لیکن اندر سے کچے ممتاز مفتی ہوتے ہیں لیکن میں باہر سے ممتاز مفتی ہوں، چلو یہی غنیمت ہے۔

سوال:

آپ شاید زندگی بھر ”محبوب آپ کے قدموں میں“ قسم کا کوئی عمل کرتے رہے ہیں۔ اسی لئے آپ کو اتنے چاہنے والے ملے؟

جواب:

نہیں بھائی ہرگز نہیں لیکن میں تمہیں ایک ایسا نسخہ بتا دیتا ہوں۔ دنیا میں اس سے بڑا کوئی جادو نہیں۔ وہ ہے قرآن مجید۔ اس کا ہر لفظ ہر آیت ”عمل“ ہے۔ کوئی ہی آیت لے کر اس کا مسلسل ورد شروع کر دے بس ایک احتیاط ہو اس میں کسی دن کا نام نہ نہ آئے۔ چند ہی دن میں وہ آیت جسم شکل میں تمہارے سامنے آجائے گی۔ انہیں کوئی بتائے یہ سفلی علوم کے پیچھے بھاگنے والے بڑے بے وقوف ہیں۔ یہ پاگلوں کی طرح راتوں کو قبرستان میں ایک مانگ پر کھڑے ہو کر وظیفے پڑھتے رہتے ہیں انہیں کوئی بتائے بے وقوف قرآن کی طرف آؤ، یہاں سے جو خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے وہ کہیں اور سے نہیں ملیں گے۔

سوال: مرنے کے بعد جنت میں جانا پسند کریں گے یا؟

جواب: میں جنت میں جانا بالکل پسند نہیں کروں گا کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ کی جنت سے بہت اختلاف ہے۔ میں تبدیلی کا شخص ہوں اور وہاں صرف یکسانیت ہوگی کوئی بھی معقول شخص ہزاروں برس تک انگوٹھیں کھا سکتا، دودھ اور شہد مجھے ویسے بھی پسند نہیں، بھجوروں کے درخت میرے حسن ذوق پر کراں گزرتے ہیں اور غوروں کے ساتھ مباشرت سے مجھے کھن آتی ہے لہذا میں اللہ تعالیٰ سے یہی گزارش کروں گا کہ مجھے زیادہ لوگوں میں رکھے۔ مولویوں سے بچائے۔

سوال: آپ خود کو واقعی عظیم ادیب سمجھتے ہیں؟

جواب: نہیں جیسا کہ مجھے آج اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا ادب سفرانی ہے۔ میں پوری زندگی لوگوں کے کہنے پر لکھتا رہا کسی رسالے کے ایڈیٹر نے زور دیا تو میں نے کہانی لکھ کر بھیج دی، کسی دوست نے کہا تو میں نے اس پر خاک لکھ دیا میں ادیب نہیں ہوں کیونکہ ادیب کے لئے زبان پر عبور اور اچھوتا خیال ضروری ہے اور یہ دونوں چیزیں میرے پاس نہیں۔ اردو زبان مجھے سرے سے نہیں آتی۔ خدا کواد ہے میں نے آج تک اردو ادب کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ انگریزی پڑھتا رہا پنجابی بولتا رہا جب لکھنے کی پوری آئی تو انگریزی میں سوچ کر اسے اپنی ہی جتنی زبان میں لکھ دیا۔ اہل زبان نے بہت شور مچایا۔ ادیبوں نے بڑا احتجاج کیا لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی کیونکہ میں کون سا ادب تخلیق کر رہا تھا جو پریشان ہوتا۔ اسی مشقت کے دوران مجھے ادیب مان لیا گیا۔ لوگوں نے کہا مفتی بڑا مہمان ہے اس نے اپنی ہی زبان دریافت کر لی۔ میں نے سنا تو فہم دیا کیونکہ مجھے پتا ہے میں کس قدر مہمان ہوں۔ میں نے جو کچھ لکھا خود جانے رکھ کر لکھا، اپنی خامیاں، کوتاہیاں اندر کے چور اندر کے منافق کو دنیا کے سامنے پیش لیا خود کو بار بار لوگوں کے سامنے پیش کرتا رہا کہ لوگ ”ایلی“ کو دیکھ کر اپنی کمزوریوں تک پہنچ جائیں۔ ان کے اظہار سے نہ کھرا میں۔ میں نے معاشرے یا فرد کی اصلاح کو مد نظر رکھ کر کبھی نہیں لکھا۔ اگر نادانستگی میں ایسی کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو تو بندہ معافی کا خواستگار ہے۔ میرے بیٹے کو بھی مجھ سے یہی اختلاف ہے۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے بابا تم نے معاشرے کو

سدا ہارنے کے لئے کچھ نہیں کیا تو میں اسے کہتا ہوں اچھا میں اگر ایسا کرتا تو دوسرے روز میرے دروازے پر پولیس کا سپاہی آ کر کھڑا ہو جاتا، یہ لوگ ادیب کی بات کہاں برداشت کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ سمجھتے ہیں لکھاری کا کم وقت کی مداح کے لئے بنے ہیں۔ قصیدہ خواں ہیں، دربار آئے ہیں، انہیں اختلاف کا کوئی حق نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا لہذا پولیس سے بچنے کے لئے میں نے اپنی ذات کے کیڑے نکالنا شروع کر دیے۔ اگر آپ اس کو ادب کہتے ہیں تو اپنے رہنمائی پر کھلیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

سوال:

جواب:

طویل عمری کے لئے کیا کھاتے رہے ہیں؟  
یار نہیں مجھے میرے اندر کے نوجوان نے ۹۰ برس تک زندہ رکھا۔ دراصل میرا جذباتی ارتقا ۵۵ برس کی عمر میں رک گیا تھا۔ میں نے ہر دور میں نوجوانوں سے محبت کی اس میں خواتین بھی شامل ہیں۔ نوجوان میرے دوست رہے ہیں اگر کوئی بوڑھا میرا دوست بنا تو اس کی سوچ لازمی جوان تھی جو مجھے اپنا تایا، چاچا بنا کہتا ہے میں اس سے لڑ پڑتا ہوں۔ میں صرف ممتاز مفتی ہوں بلکہ ممتاز بھی فالتو ہے میں صرف مفتی ہوں۔ آج کل میرا ایک پندرہ سالہ لڑکی سے چکر چل رہا ہے وہ کینیڈا میں پڑھتی رہی وہاں اس نے اولیول کے امتحان میں پوری دنیا میں ٹاپ کیا، مجھے میں نہیں سمجھنے کے خط لکھتی ہے ہر دو سطر بعد مجھے یاد لکھتی ہے۔ لڑکیاں مجھے اپنی تصاویر بھیجتی ہیں۔ روز ڈاک سے درجنوں عشقیہ خط موصول ہوتے ہیں، کبھی نوے سالہ بوڑھوں کے ساتھ ایسا ہوا، نہیں ہرگز نہیں یہ صرف مفتی کے ساتھ پیشسل سلوک ہے کیوں؟ اس لئے مفتی پوری زندگی نوجوان رہا وہ کبھی بزرگ نہیں بنا وہ بابا نہیں بنا اس نے کبھی نوجوانوں کو نصیحت کی انھی سے نہیں ہانکا۔ اس نے کبھی جزمیشن گیپ پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس میں کبھی بناوٹ نہیں آئی اس نے کبھی دانش نہیں بھاری اس نے ہمیشہ نوجوانوں سے ان کے دل پسند موضوعات پر گپ لگائی۔ ادب میں بھی اور محفل میں بھی۔

سوال:

جواب:

آج نوے برس بعد جو خواہش سب سے زیادہ تنگ کرتی ہے۔  
مجھے مرنے کا بہت شوق ہے۔ جی جی کراکتا گیا ہوں، تنگ آ گیا ہوں اب میں

ریسٹ چاہتا ہوں۔ اب میری چھٹی ہو جانی چاہیے۔ شہاب کے بعد عزرائیل میری تلاش میں نکلا تھا لیکن وہ تھوڑا سا لیٹ ہو گیا اور میں نے ”الکھنگری“ شروع کر دی وہ آیا ”میر“ میں اس سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے تھوڑی سی مہلت مان لی وہ مان گیا ”الکھنگری“ مکمل ہوئی تو میں اس کا دوبارہ انتظار کرنے لگا لیکن اس کے جاتے ایک اور پیغام آ گیا کہ اب ”تصوف“ پر بھی کتاب لکھو اپنی زندگی کی آخری کتاب۔ تو میں ہنس پڑا، کہاں تصوف کہاں ممتاز مفتی اسلام کے بارے میں میری معلومات اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ اس میں اللہ اور نبی کا بار بار ذکر آتا ہے اور یہاں، اہل اورم سے بنا ہے۔ میں نے پیغام کو پیغام رساں کی غلطی سمجھ کر ایک طرف رکھ دیا کچھ دنوں بعد دروازے پر ایک لمبی داڑھی اور اونچے پگڑ والے بزرگ آ گئے۔ کتابوں سے بھر ایک تھپا میرے ہاتھ میں پکڑا کر کہنے لگے آپ جو کتاب لکھ رہے ہیں یہ کتابیں آپ کو اس سلسلے میں رہنمائی دیں گی میں نے کہا یا حیرت یہ کیا تماشہ ہے پھر آگے پیچھے سے پیغامات کی بھرمار ہو گئی۔ نئی سلطان باہو نے بھی بندہ بھیج دیا، داتا صاحب کے ہر کارے بھی پہنچ گئے، ناچار میں نے سوچا صرف کتاب لکھنے کی پابندی ہے معیاری کتاب لکھنے کی تو نہیں چنانچہ ”تلاش“ کے نام سے ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ بیس پچیس قسطوں کے بعد تنگ آ کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ پھر پیغام آیا جب تک یہ مکمل نہیں ہوگی آپ کو چھٹی نہیں مل سکتی ناچار دوبارہ شروع کر دی۔ امید ہے چھ مہینے بعد یہ کتاب مکمل ہو جائے گی اس کے بعد انشاء اللہ میں فوت ہو جاؤں گا میری میرے اللہ سے ملاقات ہوگی اب تو اس ملاقات کے شوق میں زندہ ہوں۔ پتہ نہیں کب یہ شوق پورا ہوگا۔

یہ مفتی صاحب کا اثر دہو تھا۔

اب آتے ہیں مفتی صاحب کی شخصیت کی طرف۔

(مفتی صاحب کی شخصیت ایک طویل داستان ہے۔ یہ داستان کہنے کے لیے بے تحاشہ وقت اور یک سوئی درکار ہے۔ میں یہ داستان کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ یا زندہ صحبت باقی)

• • •

عطاء الحق قاسمی

.....

روایت کے مطابق ہمارے آباؤ اجداد عرب سے برصغیر پاک و ہند آئے تھے جبکہ عرب میں ہمارا شجرہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ عرب سے ہمارا خاندان پہلے آگرہ آیا اور پھر کشمیر منتقل ہو گیا۔ جہاں تقریباً آٹھ سو برس مقیم رہنے کے بعد یہ خاندان امرتسر جا بسا۔ میری پیدائش امرتسر ہی میں یکم فروری ۱۹۳۳ء کو ہوئی۔

ہمارا خاندان بنیادی طور پر ایک علمی و مذہبی خانوادہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے کئی معروف علماء و مشائخ ہمارے بزرگ اساتذہ کے شاگرد تھے جن میں شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا مفتی محمد حسن (جامعہ اشرفیہ دالے) میرے دادا مفتی غلام مصطفی قاسمی کے شاگرد تھے۔ میرے دادا کا پیری مریدی کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے چلتا رہا پھر میرے والد مولانا بہاء الحق قاسمی نے اس سلسلے کو ختم کر دیا۔ انہوں نے پوری زندگی امام مسجد اور استاد کی حیثیت سے معاشرے کی خدمت کی۔

ہم کل آٹھ بھائی بہن ہیں چھ بہنیں اور دو بھائی۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے اس لحاظ سے میرا نمبر ساتواں ہے۔ ہم بھائیوں کی پیدائش کے حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اباجی کو مزید اولاد کی خواہش تھی مگر جب بنیاں پیدا ہوتی گئیں تو وہ ایک بزرگ سے ملے اور ان سے کہا وہ دعا کریں کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ چنانچہ بزرگ نے انہیں ایک تعویذ دیا۔ اس کے بعد میرے بڑے بھائی ضیاء الحق قاسمی پیدا ہوئے اس کے بعد پھر کئی بیٹیوں کی پیدائش کے بعد دوبارہ تعویذ لیا تو میری پیدائش ہوئی۔ یوں ہم دونوں بھائیوں کی پیدائش ایک تعویذ کی برکت اور بزرگ کی دعاؤں سے ہوئی بعد ازاں بزرگ نے اباجی کو اجازت دے دی وہ ضرورت مندوں کو یہ تعویذ

میں زندگی میں جن لوگوں سے متاثر ہوا عطاء الحق قاسمی صاحب کا شمار ان میں پہلے نمبر پر ہوتا ہے۔ وہ محض ادیب شاعر دانشور اور کالم نگار نہیں ہیں۔ وہ ایک شاندار انسان بھی ہیں۔ وہ مجھے اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل رکھتے ہیں۔ یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ میں نے ان سے یہ انٹرویو ۱۹۹۷ء میں لیا تھا۔ یہ انٹرویو کم اور انشائیہ زیادہ ہے۔ آپ اس انٹرویو میں ایک ایسے عطاء الحق قاسمی سے ملیں گے جس سے آپ پہلے واقف نہیں تھے۔ یہ انٹرویو بھی آپ جی کے سائل میں لکھا گیا۔

دے سکتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے جس جس کو یہ تعویذ دیا اس کے ہاں نرینہ اولاد ہی پیدا ہوئی۔

ابھی میں نے ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ اس موقع جب برصغیر فسادات کی لپیٹ میں تھا ہم لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ اباجی نے وزیر آباد کا شہر منتخب کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں میری مانی جان رہتی تھیں جو یہ تھیں اور بچوں کو قرآن کریم پڑھا کر گزارا کرتی تھیں۔ یہ فطری بات ہے کہ جس جگہ انسان کے پہلے سے کوئی عزیز رشتہ دار موجود ہوں وہ وہاں جا کر بسٹل ہونے میں آسانی محسوس کرتا ہے چنانچہ ہم لوگ وزیر آباد آ گئے اس وقت میری عمر چار برس کے قریب تھی جب فسادات شروع ہوئے اور ہم نے جرات کی تو اس سے کچھ عرصہ پیشتر ہی امرتسر میں نیا مکان بنایا تھا۔ ہجرت کرتے وقت ہم نے سامان اسی مکان میں رہنے دیا اور تالے لگا کر چلے آئے۔ اباجی کا خیال تھا کہ یہ وقتی فساد ہے اور جب یہ جنگ سے ختم ہوں گے تو واپس جا کر اطمینان سے سامان لے آئیں گے لیکن ہنگامے جلد ختم ہونے میں نہ آئے اور جب عرصے بعد سکون ہوا تو وہ دونوں ملکوں کے درمیان سرحدیں بن چکی تھیں جن کو پار کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد یہاں وزیر آباد میں ایک مکان لے لیا جو خالی تھا لیکن رفتہ رفتہ معمول کا ساز و سامان بھی بنتا گیا، اگرچہ ایسے کئی مکان موجود تھے جو سامان سے بھرے ہوئے تھے اور ہندو سکھ جلدی میں انہیں چھوڑ گئے تھے اور ہم ان میں سے جو چاہتے لے سکتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ تھانیدار اباجی کا مرنے کا یہ تھا۔ اس نے انہیں کئی مکان دکھائے اور کہا کہ جو پسند آئے لے لیں۔ اباجی ایک مکان میں گئے جسے غالباً سائیکلوں کا گودام بنا رکھا تھا اور اس میں نیچے سے اوپر تک سائیکلیں ہی سائیکلیں بھری تھیں اباجی نے کہا یہ حرام کا مال ہے جو میں نہیں لے سکتا۔ وہ اسے حرام کا مال اس لئے کہہ رہے تھے جو سامان وہ امرتسر چھوڑ کر آئے تھے وہ بہر کیف اتنا نہ تھا۔ دوسرا مکان تین چار منزلہ تھا اور ساری منزل سامان سے پُر تھیں اسی طرح سامان اور مال سے بھرے کئی مکان دکھائے گئے مگر اباجی کا بتی نہ مانا۔ آخر خالی مکان لیا گیا کیونکہ اباجی کا خیال تھا کہ وہ یہ مکان تو اپنے امرتسر والے مکان کے بدلے میں لے رہے ہیں جبکہ سامان وہاں موجود ہے جو کسی وقت بھی جا کر لے آئیں گے۔ چنانچہ انہیں صرف خالی مکان لینا چاہئے۔ اگر ساتھ سامان لیں تو حرام ہوگا۔ تاہم امرتسر سے سامان نہ لایا جا سکا اور نہ ہی واپسی کا راستہ رہا تھا۔

مجھے یہ یاد ہے کہ ہمارے نام جو مکان الاٹ ہوا تھا وہ غالباً سکھوں کا تھا کیونکہ اس میں

دیواروں پر سکھوں کی تصاویر لگی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں ایک سکھ پڑا تھا اتنی چھوٹی عمر کا ہونے کے باوجود مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ اسی طرح یہ بھی یاد ہے کہ ایک دن روشن نام کا ایک تیلی کسی ہندو کو لوٹ کر بھاگ رہا تھا اور پولیس اس کا پیچھا کر رہی تھی ہمارے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے جب اس نے دیکھا کہ پکڑا جائے گا تو زیورات کی تھیلی جو اس کے ہاتھ میں تھی وہ اس نے فضا میں اچھال دی جو ہمارے گھر کے اندر آ کر گرئی۔ اباجی چاہتے تو یہ تھیلی اٹھا کر رکھ لیتے مگر انہوں نے اسی طرح وہ تھیلی اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دی۔ اسی طرح ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے۔ ہمارے گھر سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ایک "گورو کوٹھا" تھا جہاں ہندو سکھ پناہ لےتے ہوئے تھے۔ ایک روز مسلمانوں نے اسے آگ لگا دی جب شور بلند ہوا تو سب گھر والے چھت پر چڑھ کر دیکھنے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ دور گورو کوٹھے سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر امی اور میری بہنیں رونے لگیں۔ مجھے یہ ٹھیک سے یاد نہیں کہ ان بے چارے ہندو سکھوں کا کیا ہوا ہوگا لیکن ظاہر ہے وہ اس میں جل مرے ہوں گے۔ دراصل ایسا سرحد کے دونوں طرف ہوا اور ایک دوسرے کے رد عمل کے طور پر ہوا۔

وزیر آباد آنے سے پہلے اباجی امرتسر میں ایم اے اسکول اور پھر ایم اے او کالج میں پڑھاتے تھے یہاں آ کر بھی وہی پیشہ اختیار کیا۔ اور ایم بی ہائی سکول وزیر آباد میں اسلامیات کے استاد مقرر ہوئے اس کے ساتھ وہ مسجد میں امامت بھی کراتے تھے۔ مجھے ٹھیک سے علم نہیں کہ انہیں کتنی تنخواہ ملتی تھی، غالباً سو روپے تھی۔ کئی برس کے بعد ڈیڑھ سو روپے تک ہو گئی اور اس کے بعد دو سو روپے۔ اس زمانے کے حساب سے بھی دیکھیں تو یہ آمدنی بہت زیادہ نہیں تھی۔ گھر کے افراد کی تعداد دس تھی۔ اس لحاظ سے گزربس غربت ہی میں ہوتی تھی لیکن یہ غربت تکنیوں اور محرومیوں سے بالکل پاک تھی بلکہ میرے لئے یہ بہت سہانا اور دلکش زمانہ تھا۔ مجھے اس زمانے کے حوالے سے غربت کی وجہ سے محرومی یاد رکھ کا کوئی ایک واقعہ بھی یاد نہیں۔ اس دور کی تمام یادیں بہت خوشگوار ہیں اس حیرت انگیز حقیقت کی کئی وجوہات ہیں ایک تو ہمارے گھر کا ماحول اور والدین کی تربیت تھی دوسرے ہم سب کا آپس میں پیار بہت تھا۔ خصوصاً مجھے میری بہنوں نے بہت پیار دیا۔ میرا نام نیم شہزادہ تھا اور وہ میرے ساتھ شہزادوں ہی کی طرح سلوک کرتی تھیں۔ پھر والدین نے ہمیں ایک احساس تھا خردے دیا تھا جس کے سامنے غربت اور دوسری مادی تکالیف کی کچھ اہمیت نہیں رہی تھی۔ اول تو انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ جو کچھ تم لوگوں کو کھلایا جا رہا ہے یہ رزقِ حلال ہے اور اس

کے اندر وہ کرگزار کرتا ہے۔ کسی دوسرے کی جھوٹری کی طرف نظر نہیں کرنی بلکہ اپنی روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمارا خاندان ایک ہزار برس سے علمی خاندان ہے اور ہمارا فخر اور عزت پیسہ اور جاہ و جلال نہیں، علم ہے۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جس نے نہ تو ہم میں احساس کمتری پیدا ہونے دیا اور نہ کوئی محرومی محرومی رہی۔ اصل میں ہمیں جو تعلیم دی گئی تھی اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔ اگر کسی کو کسی پر برتری حاصل ہے بھی تو صرف پرہیزگاری، علم اور شرافت کی بناء پر اور پھر اس پر غرور کرنا بھی درست نہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گھر کے سامنے ملک عطاء اللہ کی دکان تھی۔ وہاں سے صبح صبح نان اور دہی لائے جاتے۔ یہ ہمارا ناشتہ ہوتا تھا۔ دوپہر کو ہمارے ہاں اکثر روٹی نہیں پکتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں ایک روپے کے خر بوز لائے جاتے جو عام طور پر پانچ چھ آنے سیر کے حساب سے ملنے یعنی ایک روپے میں دو تین سیر مل جاتے۔ یہ ہمارا لٹچ ہوتا تھا۔ اگر کسی کا روٹی کھانے کو بھی چاہتا تو امی جی آئے میں نمک ڈال کر روٹی پکا دیتیں جو وہ خر بوزوں کے ساتھ کھا لیتا۔ گھر میں روزانہ ڈیڑھ پاؤ گوشت آتا تھا اس میں کوئی سبزی ڈال کر پکایا جاتا۔ یہ ہمارا "ڈنر" ہوتا۔ سردیوں میں نمکین کشمیری چائے پکتی جو سارا میں ڈال کر نیچے کوٹکے جلا دیے جاتے۔ ہم یہ چائے دقتے دقتے سے پیتے رہتے۔ یہ ہمارا روزانہ کامیو تھا اور جولنت ہمیں اس وقت ان کھانوں میں ملی بعد میں قانچوٹار ہوٹلز کے کھانوں یا چائینز کھانے کھا کر بھی نہیں مل پاتی۔

دراصل اس زمانے میں اگر ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا تو بیشتر دوسرے لوگوں کے پاس بھی نہیں تھا اور جن کے پاس تھا وہ اس کی اس طرح نمائش نہیں کرتے تھے جس طرح آج کی جارہی ہے۔ امیر اور غریب کی زندگی میں فرق تو تھا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا آج پیدا ہو گیا ہے۔ پھر وزیر آباد بھی جگہ پر کار، بنگلے اور اس طرح کی پر تعیش چیزوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی نہ اسکی محرومی دکھ کا باعث بنتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن، سکول، بازار ہر جگہ اتنی نزدیک تھی کہ وہاں پیدل پہنچا جاسکتا تھا۔ رہے فی وی وی وی آ تو کم از کم پاکستان میں ابھی یہ پہنچے بھی نہیں تھے۔ البتہ ہمارے گھر میں ایک ریڈیو موجود تھا جس پر پھول کاڑھے، سائے کپڑے کا غلاف چڑھایا ہوتا تھا اور بہت سجا کر رکھا ہوتا تھا۔ اباجی کی طرف سے اس پر صرف خبریں سننے کی اجازت تھی تاہم جب وہ گھر پر نہ ہوتے تو ہم اس پر گیت اور دوسرے پروگرام بھی سن لیتے۔

بچپن میں مجھے دو کاموں کا بہت شوق تھا۔ ایک پٹنگ بازی، دوسرا گولیاں (بٹنے)

کھیلنا۔ اور اباجی کو یہ دونوں کام ناپسند تھے۔ چنانچہ جب میں ان میں سے کوئی کام کرتا پٹائی ہوتی لازمی تھی۔ پٹنگ بازی کا شوق اس قدر زیادہ تھا کہ گرمیوں میں جب سخت گرمی پڑ رہی تھی، بیڑھیوں میں ذرا سی چھاؤں ہوتی تھی اور میں وہاں کھڑے ہو کر پٹنگ اڑاتا تھا۔ پٹنگ اڑاتے ہوئے میری ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ کوئی میرے ساتھ بیچ نہ لڑائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پٹنگ ڈور بنا کر، مانجھا لگا کر پٹنگ بازی نہیں کرتا تھا۔ میں تو دوسروں کی کئی ہوئی پٹنگوں کو لوثتا تھا۔ ان کے ساتھ جو تھوڑی سی ڈور ہوتی تھی وہ میں کاغذ کے بڑے سے گولے پہ لپیٹ لیتا۔ مزید ڈور ملتی تو کچھ لگا کر اس کے ساتھ جوڑ لیتا۔ یوں میری ڈور کا پٹنگ بڑگی اور کاتھ دار ڈوروں پر مشتمل ہوتا۔ اس کے ساتھ بیچ لڑائے کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ میری پٹنگ کٹ جائے چنانچہ جب میں پٹنگ اڑاتا تو کسی کے ساتھ بیچ ڈالنے سے بچتا۔ مگر بہت دفعہ دوسرے میرے نہ چاہنے کے باوجود بیچ ڈال دیتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میری پٹنگ کٹ کر گر پڑتی اور ہاتھ میں صرف کاغذ کا خالی گولہ رہ جاتا۔

ہماری گلی کے کونے میں ایک خالی پلاٹ تھا جسے ہم کھولا کہتے تھے۔ اس کھولے میں میں اپنے دوستوں کے ساتھ گولیاں اور آخرت کھیلتا اس کے علاوہ گلی ڈنڈا بھی کھیلتا جو اباجی کو اتنا ہی ناپسند تھا جتنا آخرت اور گولیاں کھیلنا۔ جب میں گھر میں ہوتا تو ہم بہن بھائی مل کر لڈ کھیلتے۔ یہ عام طور پر سردیوں میں ہوتا تھا۔ جب ہم سارے بہن بھائی لحاف میں بیٹھ جاتے، کونوں والی کاکڑی بیروں میں جھالیٹے اور لڈ کھیلنے لگتے۔ یہ کام بھی اباجی سے نظر بچا کر کرتے کیونکہ اس کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ اباجی کی طرف سے ہمیں کسی قسم کے کھیل کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گورو کوٹھے میں مجیدے پہلوان کا اکھاڑا تھا جہاں پہلوان زور کرتے یا کشتیاں ہوتیں۔ یہ دیکھنے کی اجازت تھی۔ فٹ بال کھیلنے کی اجازت بھی تھی۔ لیکن میں اپنی افتاد طبع سے اپنے پسندیدہ کھیلوں سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے اس کے علاوہ کوئی اور کھیل کھیلتا تو مار پڑنا لازمی تھی اور خوب پٹتا تھا۔ ویسے تو کئی چائیاں یا وچیں مگر ایک پٹائی بہت اچھی طرح یاد ہے۔ تب ہم ایک اور کھیل بھی کھیلا کرتے تھے جو اس زمانے کے بچوں میں بہت مقبول بھی تھا۔ لوہے کے ایک چھوٹے سے چکر کو لوہے کی چھڑی کے ساتھ منسلک کر کے سڑکوں پر دوڑایا جاتا تھا۔ اسے معلوم نہیں کیوں ریڑھا کہتے تھے حالانکہ یہ کسی لحاظ سے بھی ریڑھا نہیں تھا۔ میں اور میرے دوست یہ ریڑھے چلاتے ہوئے بعض دفعہ کرم آباد تک چلے جاتے جو مولانا ظفر علی

خان کا گاؤں ہے اور وزیر آباد سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ایک مزار پر ہیریاں لگی ہوئی تھیں جن پر چڑھ کر ہم بیر کھایا کرتے تھے۔ ایک بار ہم چار دوستوں نے وہاں چل کر بیر کھانے کا پروگرام بنایا اور ریزے گھماتے پیدا چل پڑے۔ سڑک پر بسیں گزر رہی تھیں۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ بسوں کو روڑے مارے جائیں۔ چنانچہ ہم چاروں بچے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ایک بس قریب آئی ہم نے اس پر پتھر پھینکے۔ ان میں سے کئی پتھر مسافروں کو لگے۔ ڈرائیور نے بس کو بریک لگا کر روک لیا۔ یہ دیکھ کر ہم کھیتوں کی طرف بھاگے مگر ان لوگوں نے ہمیں تھوڑی دور جا کر پکڑا لیا۔ اس کے بعد سب کی چٹائی شروع ہو گئی۔ باقی تینوں کی تو چٹائی ہوئی مگر ایک مسافر نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے دوسرے مسافروں کو مجھے مارنے سے روکا اور کہا ”میں اسے جانتا ہوں یہ ہمارے مولوی صاحب کا بیٹا ہے۔ میں ان سے اس کی شکایت کر دوں گا۔“ چنانچہ مجھے وہاں تو مار نہ پڑی لیکن جب باقی کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے اس قدر مارا کہ اس کے مقابلے میں دوسرے بچوں کو مسافروں کے ہاتھوں پڑنے والی مار کی کچھ حیثیت نہ رہی۔

جیب خرچ کے حوالے سے بتاتا ہوں کہ مجھے روزانہ دو پیسے ملتے تھے۔ سکول میں جب آدمی چھٹی ہوتی تو میں محمد حسین بے کی ریڑھی سے ان کے آلو چھو لے کھا لیتا تھا۔ میرے پاس کپڑوں کے دو تین جوڑے ہوتے تھے ایک جوڑا تین دن پہننا ہوتا تھا تاہم یہ اگر جلد گندا ہو جاتا تو امی جی دو دن بعد ہی دھلا ہوا جوڑا پہنا دیتیں۔ سرویوں میں ایک مونا سویٹر بھی پہننے کو ملتا مگر یہ سردی سے پوری طرح بچا نہیں پاتا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں عید پر نئے کپڑے اور جوتے لے کر دیے جاتے مگر یہ ضروری نہیں تھا۔ بیشتر عیدوں پر پرانے ہی کپڑے پہن کر گزارا کر لیتے لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں ہمیں عید کی آمد کی جو خوشی اور اشتیاق ہوتا تھا اس کا تو اب تصور ہی ممکن نہیں۔ تب تو ہم ایک ایک دن گن کر گزارتے اور چاند رات کو خوشی اور جوش و خروش اپنی انتہا پر ہوتا۔ ہم سر شام ہی گھر کی چھت پر چڑھ جاتے اور مغرب کی طرف چاند تلاش کرنا شروع کر دیتے جب نظر آ جاتا تو ہم خوشی سے نعرے لگانے لگتے۔

ابا جی سال میں ایک بار موسم گرما میں پکنک کا پروگرام بھی بناتے تھے۔ اس روز چار پانچ تانگے منگوائے جاتے اور ہم سب اہل خانہ کے علاوہ ہمارے پھوپھی زاد اور خالہ زاد بھی ان تانگوں پر بیٹھ کر دریائے چناب پر جاتے۔ یہ دریا وزیر آباد سے دو تین میل کے فاصلے پر ہے۔

ہم سارا راستہ تانگے کی سواری سے لطف اندوز ہوتے دریا پر پہنچ جاتے، ساتھ تر بوڑے لے جاتے تھے جو وہاں پہنچتے ہی دریا میں ڈال دیئے جاتے تاکہ ٹھنڈے ہو جائیں۔ ابا جی اس زمانے میں بہت تنومند جوان تھے۔ وہ باری باری ہمیں اپنی کمر پہ بٹھاتے اور دریا میں تیرتے تیرتے دور نکل جاتے یوں تیراکی نہ جاننے کے باوجود ہم دریا کی سیر کر لیتے۔ جب سب لوگ تھک جاتے تو کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈے پانی تر بوڑ کاٹ کاٹ کر کھاتے۔ یہ اس زمانے میں ہماری عیاشی کی انتہا تھی۔

اس زمانے کے وزیر آباد کی یادوں میں ایک اہم یاد وزیر آباد کی راجا فیملی ہے جو اس شہر کے امیر ترین لوگوں میں سے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ باقاعدہ حکمران خاندان تھا مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں تب ان کی حکمرانی کا دور ختم ہو چکا تھا اگرچہ اس کے کئی افراد بعد میں وزیر مشیر مقرر ہوئے۔ اس خاندان کی ایک بہت بڑی حویلی تھی جسے ٹمن کہتے تھے۔ اس کی چھتوں پر مورچے بنے ہوئے تھے اور اندر تہہ خانوں میں پرانے عقوبت خانے موجود تھے۔ یہاں ایک چھانسی گھر بھی تھا۔ حویلی کے مین گیٹ میں داخل ہوتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ گیٹ یا تو ہاتھیوں کے لئے بنایا گیا ہے یا ہاتھی والوں کے گزرنے کے لئے۔ میری نانی جان راجا خاندان کے بچوں کو قرآن کریم پڑھاتی تھیں اور اس خاندان کے چھوٹے بڑے سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ نانی جان مجھے دو تین مرتبہ اس حویلی میں لے گئیں مگر مجھے وہاں جانا زیادہ پسند نہیں تھا۔ اس لئے کہ حویلی کا جو نقشہ میں نے بتایا ہے اسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

اسکول کے زمانے میں مجھے ایک بھی ایسا استاد نہیں ملا جس کی شخصیت متاثر کن ہو۔ اسکول کی تو بات ہی کچھ اور تھی کالج اور یونیورسٹی میں بھی جو استاد ملے ان میں سے بھی اکثر متاثر نہ کر سکے۔ ہاں جب میں انجی میٹرک میں تھا تو ایک روز اسکول میں ایک نیا استاد آیا۔ مجھے آج بھی اس کی شکل و صورت اچھی طرح یاد ہے، وہ دبلے پتلے جسم کا مالک تھا اور اس کی سفید موٹھیں تھیں۔ اس نے ۱۸۸۷ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے لیکچر دیا، اس کا بیان اس قدر خوبصورت اور متاثر کن تھا کہ بے اختیار ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ اسکول میں بس ایک ہی روز رہا اس کے بعد ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے سوا باقی اساتذہ میں سے ہر ایک الگ قسم کا نمونہ تھا، مثلاً میٹرک میں ہمارے ایک ماسٹر خدا بخش تھے۔ ان کی ذاتی زندگی دکھوں بھری تھی اور وہ ان سارے ذاتی دکھوں کو اپنے چہرے پر سجائے اور لہجے میں سمیٹے اسکول آتے

تھے۔ نہ صرف یہ کہ خود کبھی ہنستے ہنساتے نہیں تھے بلکہ اگر کسی کو ہنستا دیکھ لیتے تو ان کا پارہ چڑھ جاتا۔ ان کی آواز بہت باریک سی تھی اور وہ یہ فقرہ اکثر دہراتے تھے کہ جب تم ہنستے ہو تو جی چاہتا ہے کہ تمہیں گولی مار دوں۔ یہ بھی کہتے کہ اگر سکندر مرزا کی جگہ میں صدر ہوں تو قانون بنادوں کہ جو ہنستا نظر آئے اس کی گردن مار دی جائے۔ معمولی باتوں پر بھی کڑی سے کڑی سزا دیتے، اکثر لڑکوں کی اظہیوں کے درمیان پھسل رکھ کر اسے دہاتے جس پر لڑکوں کی چٹخیں نکل جاتیں۔

اسی طرح ایک ماسٹر دین محمد تھے۔ یہ خوبی بواہر کے مریض تھے چنانچہ اسکول آتے تو اکثر ان کی شلو اور خون سے سرخ ہوتی۔ جب کلاس روم میں داخل ہوتے تو شور اور ہنگامہ مچا ہوتا، داخل ہوتے ہی سامنے جولا کا نظر آتا اس سے کہتے "مجھے تم پر شک ہے کہ شور مچا رہے تھے۔" اس کے بعد ڈنڈے سے اس کی پٹائی شروع کر دیتے ایسے میں صورت حال بہت دلچسپ ہو جاتی۔ جب لڑکا اطمینان سے مار کھاتا رہتا اور جب وہ مارتے مارتے تھک جاتے تو ہنستا کہ اسے تو یونہی غلط فہمی میں مارا گیا ہے وہ بے گناہ تھا اور اصل میں شور تو یہ ساتھ والا لڑکا مچا رہا تھا۔ اب ماسٹر صاحب پھر یہ کہہ کر پل پڑتے کہ مجھے تو پہلے ہی تم پر شک تھا۔ دوسرا لڑکا بھی اطمینان سے پوری مار کھانے کے بعد بتاتا کہ وہ بھی بے گناہ تھا اور نہ اصل میں شور تو وہ لڑکا مچا رہا تھا۔ جس پر "مجھے پہلے ہی تم پر شک تھا" کے فقرے کے ساتھ اس کی باری آ جاتی۔ یوں باری باری کلاس کے تمام لڑکے مار کھاتے۔ تو اس طرح کے تو ہمارے اساتذہ تھے ان سے کیا متاثر ہوتے؟ جہاں تک کالج کے اساتذہ کا تعلق ہے تو اسکول کے استادوں کی طرح تو بہر کیف نہیں تھے مگر ان میں بھی کوئی غیر معمولی صلاحیتوں، قابلیت یا علم کا مالک نہیں تھا۔ سب بس مارل تھے۔ اوسط درجے کے۔ ان میں سے کوئی متاثر کرنے کی اہلیت کا حامل نہیں تھا۔ البتہ یونیورسٹی میں ہمارے اساتذہ میں سید وقار عظیم، جبار باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا تھے۔ ان میں ہر ایک انتہائی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ میں ان پر بعد میں گفتگو کروں گا۔ اس وقت ہم دوبارہ کالج لائف کی طرف چلتے ہیں۔

میں ابھی ایف اے ہی میں تھا جب "شہاب" میں کالم نگاری شروع کر دی تھی۔ ایم اے تک آتے آتے اور بھی کئی پریچوں میں چیزیں چھپنے لگیں۔ اس دوران میں نوائے وقت کے سٹوڈنٹس ایڈیشن کے لئے بھی لکھتا تھا۔ اس لحاظ سے کالج کے اندر بطور لکھاری اور صحافی میری شہرت تھی۔ ایک روز سید وقار عظیم نے مجھے بلایا اور کہا کہ ہم تمہیں "محور" کا چیف ایڈیٹر بنانا چاہ

رہے ہیں۔ میں نے کہا "سر! اس میں تو انگریز کا حصہ بھی شامل ہے اور میری انگریزی اتنی اچھی نہیں ہے۔ اب اگر میں چیف ایڈیٹر بننا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں انگلش سیکشن کے مدیر کا بھی انچارج ہوں گا۔ یعنی اس شخص کا جس کی انگریزی مجھ سے اچھی ہے۔ یوں میرے خیال میں یہ مناسب نہیں کہ وہ عہدے لے لوں جس کا میں اہل ہی نہیں۔ ہاں یہ ہے کہ آپ مجھے اردو حصے کا مدیر بنادیں۔" انہوں نے کہا "مجیب آدمی ہو۔ لوگ تو ایسی چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں جبکہ تمہیں بن مانگے مل رہی ہے اور تم انکار کر رہے ہو" تاہم جب میرا انکار جاری رہا تو انہوں نے مجھے چیف ایڈیٹر شپ کے بجائے اردو سیکشن کی ادارت دے دی۔ جبکہ چیف ایڈیٹر رفیع الدین ہاشمی کو بنادیا گیا جس کی انگریزی مجھ سے بھی کمزور تھی۔

نوائے وقت سے میری دانشگری یا قاعدہ ملازمت کے بجائے کٹری بیوٹر کے طور پر تھی اور میں طلباء کی سرکرمیوں کا احوال لکھ کر دیتا۔ کبھی کبھی کسی ہونہار سٹوڈنٹس کا انٹرویو بھی کرتا جو نوائے وقت میں پچھتا ان دنوں ایک مزے کا قاعدہ ہوا۔ ایک لڑکا (جس کا نام میں بیان نہیں کروں گا) ایم اے فارسی کے امتحان میں اول آیا اور اسے گولڈ میڈل ملا۔ اس نے مجھ سے کہا "میرا حق بنتا ہے کہ نوائے وقت میں میرا انٹرویو شائع کیا جائے۔" میں نے کہا ضرور۔ تم ایسا کرو کہ اپنے بارے میں اچھے بنیادی باتیں لکھ دو میں فپر بنا کر چھاپ دوں گا۔ اس نے اس میں ایسی ایسی "مالماتہ" باتیں لکھیں کہ پڑھ کر ہنسی آتی تھی اور اپنے تعلیمی نظام پر رونا آتا تھا۔ ان میں گرائمر، زبان اور بیان شیوے کی غلطیاں موجود تھیں۔ ایک فقرہ جو مجھے یاد رہ گیا ہے۔ اس نے یوں لکھا تھا "جب میں اسکول میں پڑھتا تو وہاں ماسٹر صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے اور میری کمر پر اکثر دست شفقت پھیرا کرتے تھے۔" میں حیران ہوا کہ ہمارا تعلیمی معیار ایسا ہو چکا ہے کہ اس جیسے لڑکے نے ناپ کیا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس تحریر کو اسی طرح چھاپ دوں اور ساتھ نوٹ لکھ دوں کہ یہ ہمارے فارسی کی کلاس میں فرسٹ آنے والے طالب علم کا حال ہے۔ پھر سوچا کہ غریب آدمی ہے بے چارے کو مصیبت پڑ جائے گی اور نوکری کا مسئلہ بن جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسے شائع نہیں کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ لڑکا مجھے ملا اور بولا "قاسمی صاحب! غریب سمجھ کر میرا انٹرویو نہیں چھاپا؟" میں نے کہا "ہاں یار! غریب ہی سمجھ کر نہیں چھاپا۔"

اس عرصے کے دوران میرے جو دوست بنے انہیں چار پانچ کمیٹیگریز میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو وزیر آباد میں قیام کے دوران تھے، دوسرے وہ جو ماڈل ٹاؤن آنے کے

بعد بنے پھر وہ جن سے ادب کے حوالے سے تعلق تھا۔ ان میں میرے ہم عمر بھی ہیں، بزرگ بھی اور مجھ سے چھوٹے بھی۔

وزیر آباد میں میرے جو دوست تھے ان میں قابل ذکر تین ہیں، سمیع، پھیکا موچی اور منور، ان میں پھیکا اور منور دونوں بہت غریب تھے۔ منور کو تو بعد میں ٹی بی ہو گئی اور غربت کی وجہ سے اس کا علاج نہ ہو پایا چنانچہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ جبکہ پھیکا بعد میں ڈاک خانے میں ملازم ہوا اور ایک بڑے بلیک حادثے میں انتقال کر گیا۔ سمیع کا باپ یوں تو محض ایک گڈز کلرک تھا اور اس کی تنخواہ معمولی تھی مگر اس پوسٹ پر ”فضل ربی“ بہت تھا۔ چنانچہ اس کے ہاں بچوں کے نوکرے کے نوکرے آتے جنہیں وہ خود بھی کھاتے اور محلے داروں میں بھی تقسیم کرتے۔ بلکہ بچوں کو باقاعدہ آواز لگا کر بلایا جاتا کہ پھل بٹ رہے ہیں آکر لے جاؤ۔ سمیع کا باپ بہت دل چسپ آدمی تھا، کبھی کبھی وہ یوں کرتا کہ آواز لگائے جانے کے بعد جب محلے دار جمع ہوتے تو بالائی میں پانی بھرتا اور اوپر کی منزل پر جا کر ان پر بھیج دیتا۔ میرا یہ دوست آج کل کراچی میں ہے۔

جہاں تک ماڈل ٹاؤن کے دوستوں کا تعلق ہے تو یہ بہت سے ہیں اور سب میرے جگر مرئی یاد اور مخلص دوست ہیں۔ ان میں خالدی (فصیح الدین خالدی) اکی (اکبر شیخ) مالک، مسعود اللہ خان، طارق بخاری، منیر شاہ اور عارف ہیں۔ عارف مذہبی آدمی تھا جبکہ باقی تمام دوست آزاد خیال اور لیبرل بلکہ بہت حد تک مذہب کے باغی تھے۔ ان دوستوں کی صحبت میں وہ کمران سے بحث مباحثہ کرنے، دلائل سننے اور جوابی دلائل دینے کے نتیجے میں جہاں ایک طرف میں مشرور مذہبی اور جنونی ذہن ہاں دوسری طرف میں نے مذہب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا اور جستجو کی، جس کے بعد میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنی عقل اور سمجھ کے ذریعے سے مسلمان بنا۔ میری شخصیت کی تعمیر میں ان دوستوں کا بھی بہت حصہ ہے، ان سے میں نے روا داری اور مروت سیکھی۔

ہم دوستوں کا معمول تھا کہ کوئی دوست گاڑی لے کر آ جاتا اور ہم گھبرگ یا مال کی طرف چلے جاتے، مال پر ہماری پسندیدہ جگہ ”گوگو“ ہوتی تھی جہاں ہم سب بیٹھ کر چائے پیتے یا آئس کریم کھاتے، کبھی گوجرانوالہ جانے کا پروگرام بن جاتا جہاں جا کر ہم نئے کھاتے، اسی طرح یوں بھی ہوتا کہ بیٹھے بٹھائے اچانک پشاور جانے کا پروگرام بنا لیتے اور اسی وقت روانہ ہو جاتے، میرے دوست گاڑی بہت تیز چلاتے تھے اور ایک بار ہم پشاور سے واپس لاہور سڑک پر چار گھنٹے

میں پہنچے۔ بس اسی قسم کی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ ہم شرارتیں بھی خوب کرتے بلکہ بعض اوقات تو یہ شرارتیں بڑھ کر شیطانیاں بن جاتی تھیں۔ مثلاً میں جب رات کو دیر سے گھر پہنچتا تو اباجی کی جھڑکیوں کا سامنا کرنا پڑتا، ان کا تکیہ کلام تھا ”آ گیا ہے دین۔“ دھوئی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا“ اور یہ رہیمار کس وہ دروازہ کھولنے کے ساتھ ہی دینا شروع کر دیتے جس سے شام کی ساری سیر اور تفریح کا مزہ غارت ہو جاتا۔ اس سے بچنے کی میں نے ترکیب یہ نکالی کہ گھر کی بیرونی دیوار پھیلاٹ کر اندر داخل ہو جایا کروں تاکہ نہ دروازہ کھٹکھٹاؤں، نہ اباجی کا سامنا ہو اور نہ ان کی جھڑکیاں سننا پڑیں، ہمارے گھر کی بیرونی دیوار ڈرائی تھی، اسے پھیلا ٹکنے کا میرا طریقہ یہ تھا کہ مالک چاروں ہاتھوں پیروں کے بل جھکتا اور میں اس کی کمر پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھ جاتا اور پھر دوسری طرف پھیلاٹک لگا دیتا جس کے بعد اباجی کو خبر ہوئے بغیر سیدھا اندر چلا جاتا اور جا کر سو جاتا۔ ایک روز اسی طرح میں اس کی کمر پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا ہی تھا کہ مالک نے زور سے آواز لگا دی۔

”جبرے! پہلے زیور لوٹنا پھر کپڑا اور ڈرائی نہیں۔ کوئی جاگ جائے تو بے دھڑک گولی چلا دینا۔“

اندر میری ہمیشہ جاگ رہی تھیں، وہ اندھیرے میں مجھے پہچان نہ سکی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جب ایک آدمی کو دیوار پر چڑھتے دیکھا اور اس کے ساتھ اس کے ساتھی کی یہ ہدایات سنیں تو ظاہر ہے وہ اسے چور یا ڈاکو سمجھیں۔ چنانچہ مارنے لگیں، جس کے بعد اباجی بھی جاگ گئے اور جب میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ یہ میں ہوں تو ان کی جان میں جان آئی مگر خود میری شامت آگئی۔

مالک، خطرناک سے خطرناک کام کرنے پر بھی تیار ہو جاتا اور بعض اوقات تو جس حد تک کرنے کی پابندی ہوتی یا جس حد تک کرنے کو چیلنج کیا جاتا اس سے بھی بڑھ کر کام کر دکھاتا۔ مثلاً میرے دوست اکی کی کوٹھی بہت بڑی تھی جو گولائی میں تھی اور اس کے دو گیٹ تھے، کوٹھی کے اندر ہی سوئمنگ پول تھا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر ہم سب اس میں نہا رہے تھے۔ اسی دوران مالک کی مسعود سے شرط لگ گئی کہ مالک اگر بالکل برہنہ ہو کر کوٹھی کے مین گیٹ سے نکل کر دوسرے گیٹ سے باہر نکل گیا جبکہ ہم سب دوست گیٹ پر کھڑے اسے دیکھنے لگے۔ اب شرط تو صرف اس قدر تھی کہ وہ دوسرے گیٹ سے اندر آ جائے مگر مالک جب باہر نکلا تو دیکھا کہ سامنے سے ایک

بیدھا سا دھا آدی جو غالباً دیہاتی تھا، سر جھوکائے چلا آ رہا تھا۔ دیہاتی نے مالک کو یا ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ مالک کی شیطانی حس پھڑکی، دوسرے گیٹ کی طرف آنے کے، وہ دیہاتی کی طرف بڑھا اور اس سے کہا ”بھائی آپ کے پاس ماچس ہوگی؟“ دیہاتی نے دوپہر کے وقت جب ہر طرف ہو کا عالم تھا اپنے سامنے جب ایک بالکل دھڑنگ آدمی دیکھا تو غالباً اسے کوئی جن جوت یا پاگل سمجھا، چنانچہ چٹنی مار کر ایک طرف بھاگ نکل جبکہ مالک اطمینان سے چلتا ہوا کوٹھی کے دوسرے گیٹ سے اندر داخل ہوا اور مسعود سے شرط کے ۵ روپے وصول کر لئے۔

شرارتیں اور شیطانیایں اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ سب لوگ علم و دست اور پڑھنے والے تھے۔ خاص طور پر خالدی کو تو پڑھنے کا ذوق تھا، اس کے والد اعم ٹیکس کسٹمر تھے جو اب بنارس چکے تھے۔ یہ اپنی بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور ہمیشہ سب شادی شدہ تھیں۔ چنانچہ اپنی بہن جیسی کوٹھی میں اپنے والد کے ساتھ رہتا، ان کے علاوہ اس کی ایک خال بھی ان لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ خالہ ہندو زبان بولتی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں یہ لوگ ماڈرن بلکہ انر ماڈرن تھے وہاں وہ اتنی تشدد و روایت پسند کہ برقعہ اور پچرہ بھی شل کاک والا برقعہ پہنتی۔ بہر حال یہ اتھارہویں اور بیسویں صدی دونوں ایک ہی کوٹھی میں اکٹھی رہی تھیں۔ خالدی رات کو معلوم نہیں کتنے بجے سوتا کہ صبح ہم دس گیارہ بجے بھی جاتے تو اسے سویا ہوا پاتے۔ ہماری آمد پر وہ بیدار ہوتا اور پھر مکمل کے اندر ہی باریک آواز میں اپنے ملازم کو پکارتا ”خان! چائے پرائے“

ہمارا یہ دوست بہت وسیع المطالعہ تھا۔ کتابوں کو جیسے چٹ کر جاتا اور پھر یہ نہیں کہ کسی ایک خاص موضوع کی کتابیں پڑھتا۔ نہیں بلکہ ہر موضوع پر ہر کتاب پڑھتا۔ رات کو پڑھنے کے دوران اگر بجلی چلی جاتی تو موم بتی جلا کر اس کی روشنی میں پڑھتا رہتا۔ چنانچہ وہ پڑھنے کے لئے چھ سے جو کتابیں ادھر لے جاتا جب واپس دیتا تو ان کے کئی صفحات پر موم جمی ہوتی۔ اس کے علاوہ اس پر کئی اور کیفیتیں یا جنون بھی طاری ہوتے۔ مثلاً ایک زمانے میں اس نے گلاس پر رو جیسے بلانے کا شغل اپنایا اور دن رات اسی میں لگا رہتا۔ پھر اس پر مصوری کا جنون سوار ہوتا تو کمرہ بند کر کے دن رات تصویریں بنانے میں لگا رہتا۔ ایک روز میں اس کے ہاں گیا تو چونکہ ان دنوں بھی اس پر مصوری کا بھوت سوار تھا اس لئے دروازہ اندر سے بند تھا۔ میری دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ اندر اندر حیران ہے اور ماحول عجیب سا ہو رہا ہے۔ خود خالدی کا لہجہ اور

رو بہ بھی عجیب تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی۔ ہاتھ میں برش۔ عجیب اور سرد لہجے میں مجھ سے کہا ”اندرا جاؤ“ میں اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ ہر چیز سیاہ ہے۔ کھڑکیوں اور روشن دانوں کے شیشے کالے کئے گئے تھے۔ کالے ہی رنگ کے پردے تھے حتیٰ کہ دیواروں پر بھی سیاہ رنگ کیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا ”خالدی! یہ سب کیا ہے؟“ اس نے اسی سرد لہجے میں جواب دیا ”میں موت کی تصویر بنا رہا ہوں۔“

ایک نوکیٹوس کا رخ دوسری طرف تھا اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے دیکھ نہیں سکتا تھا کہ وہ اس پر کیا بنا رہا ہے اور دیکھ بھی سکتا تو اس وقت اس کی خواہش کس تھی؟ اس لئے کہ کمرے کا ماحول اور اس پر مستزاد اس کی سرد اور اجنبی لہجہ پھٹی ہوئی آنکھیں، سپاٹ چہرہ، یہ سب دیکھ کر میرے روتے کھڑے ہو گئے اور خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ”عظا اتمہیں تمہاری موت کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔ بس آج بچ کر واپس جانا ممکن نہیں۔“ میں اسی طرح کھڑا تھا جب خالدی نے اسی سرد لہجے میں کہا ”کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ“ میں بیٹھ گیا۔ خالدی اٹھ کر صوفے تک گیا اور اس کے نیچے کہیں سے ایک گراری والا چاقو نکال لیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کیا کرتا چاہ رہا ہے کہ یکا یک کمرے میں گڑ بڑ کی آواز کوئی۔ میں نے خالدی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس نے چاقو کھول لیا تھا اور اب انگلی سے اس کی دھار چیک کر رہا تھا۔ میرے حواس گم ہو گئے۔ خالدی اگر مجھ پر حملہ کرتا تو اول تو میرے لئے آواز نکالنا ہی ممکن نہیں تھا اور چونکہ بھی تو دور دور تک کوئی سننے والا نہیں تھا۔ ملازم خالہ سب دور کمروں میں تھے۔ جبکہ خالدی کی جو حالت تھی اس میں وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ خیر میں نے ہمت کر کے پوچھا ”خالدی! یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے سرسری سے لہجے میں کہا ”کچھ نہیں۔ دھار چیک کر رہا ہوں“ میں نے پوچھا ”مگر کیوں؟“ اس پر اس نے جواب دیا۔ ”بس ایسے ہی“ ماحول اتنا بنجیدہ اور سنگین ہو گیا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اس پر ضرور کوئی جنون سوار ہو گیا ہے چنانچہ میں نے کہا ”خالدی! میں ایک منٹ میں آیا۔“ یہ کہا اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گیا اور باہر آ کر میں نے دوڑ لگا دی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے کسی بہانے ٹالنا چاہ رہا تھا تا کہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے۔ اور اسی لئے اس نے یہ ڈرامہ کیا تھا لیکن اس وقت میرے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہ ڈرامہ کر رہا ہے یا واقعی سیریس ہے۔

اس طرح ہم دوستوں میں بحثیں بھی خوب ہوتیں۔ ویسے تو ہر موضوع پر بات ہوتی تھی

مگر زیادہ مذہب کے حوالے سے گفتگو کرتے۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ وسیع المطالعہ اور پھر سوچنے والا آدمی تھا لیکن وہ بے مذہب ہو چکا تھا۔ وہ چونکہ با علم بھی تھا تو اس کے پاس دلائل بھی بہت تھے۔ جبکہ میں ٹھہرا ہوا مذہبی۔ اس وقت تک میں نے زیادہ تر کتابیں صرف مذہب ہی کے بارے میں پڑھ رکھی تھیں چنانچہ جب وہ مذہب کے حوالے سے کوئی بات کرتا تو اگرچہ وہ مجھے بری لگتی مگر میں اس کا جواب نہ دے پاتا۔ تنگ آ کر میں نے اباجی سے بات کی انہیں تمام صورت حال کے بارے میں بتایا اور اپنا مسئلہ بھی بیان کیا کہ میں اس کے اعتراضات کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ اباجی کے دوستوں میں علامہ خالد محمود تھے جو منطق اور علم کلام کے بہت ماہر تھے۔ اباجی نے ان سے بات کی۔ طے یہ ہوا کہ ایک مینٹل رکھی جائے جس میں سارے دوست اپنے اعتراض بیان کریں جبکہ علامہ صاحب ان کے جواب دیں۔ چنانچہ مینٹل ہوئی۔ علامہ صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کچھ دیر کے لئے یہ بھول جائیں کہ میں کیا ہوں اور آپ لوگ کیا۔ آپ مجھے بالکل اپنے جیسا سمجھیں۔ اتنا ہی آزاد خیال اور بے دین جتنے آپ خود ہیں۔ میرا حلیہ بھی بھول جائیں۔ جن سوالوں یا ریمارکس کو آپ بہت گستاخانہ سمجھتے ہیں وہ بھی بے تکلفی سے بیان کریں۔ اس کے بعد خالدی اور دوسرے دوستوں نے اپنے سوال اور اعتراضات بیان کئے۔ علامہ نے سب باتیں قتل سے سیں اور پھر کہا کہ میں آپ کی ان تمام باتوں کا جواب دوں گا مگر اس سے پہلے آپ میرے ان سات سوالوں کا جواب دے دیں۔ علامہ نے جو سات سوال کئے ان میں ان تمام اعتراضات کا جواب موجود تھا۔ یہ یونانی منطق اور علم کلام کا دار تھا جو علامہ نے کیا تھا اور لڑکے یہ وار نہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے خود کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پایا اور کچھ سمجھ نہ پائے کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے پوچھا کہ کوئی بات یا اعتراض رہ گیا ہو تو بتائیں۔ لڑکوں نے کہا کہ نہیں اور یہ کہ وہ بالکل کلیئر (Clear) ہو گئے۔ جس کے بعد علامہ نے اجازت چاہی اور چلے گئے۔

امریکا کی سیر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سارا امریکا ایک سا ہے۔ یوں لگتا ہے ایک ہی فلم کا سیٹ ہے جو مختلف جگہوں پر لگا ہے۔ ہر شہر میں ایک سی سڑکیں، ہوٹل کی ایک ہی چین، ایک ہی کمپنی کے ڈیپارٹمنٹل سٹورز، شکاگو اور نیویارک اس لحاظ سے مختلف ہیں یہاں اونچی اونچی عمارتیں ہیں جو دوسرے شہروں میں نہیں ہیں۔ نیویارک کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے شہروں سے بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ بقول شخصے اسے دو بار نیویارک نیویارک لکھنا پڑتا ہے۔ جہاں

تک سینٹ لوئیس کا تعلق ہے تو اس کے وسط میں ایک مخراب بنی ہے جو اس کی الگ پہچان بناتی ہے۔ سینٹ لوئیس سینٹ میزوری میں واقع ہے۔ اور اس کا ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں کی ایک خصوصیت یہ ہے لوگ بڑے طمسار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر بڑے شہروں سے دور ہے۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے یہاں غیر ملکیتوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ کم از کم جس زمانے میں وہاں تھا یہی صورت حال تھی اب ۹/۱۱ کے بعد کیا حالات ہیں معلوم نہیں۔

ہماری اور وہاں کی تہذیبی اقدار میں فرق جاننے کے لئے میں یہاں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک روز میری ایک پڑوسن میرے پاس آئی اور کچھ کہنے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ پوچھا ذرا کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ بولی: مسٹر کامی! میں بے حد دکھی عورت ہوں اور میرا دکھ سننے والا بھی کوئی نہیں۔ تمہارے پاس اس لئے چلی آئی کہ تم مشرقی لوگ حساس دل رکھتے ہو اور دوسروں کے دکھوں میں شریک ہوتے ہو، میں نے پوچھا۔ کچھ بتاؤ تو سہی تم پر کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے؟ بولی: مسٹر کامی، میری بد نصیبی کی داستان بڑی المناک ہے۔ میری بیٹی بیس برس کی ہو گئی ہے اور ابھی تک اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے اور نہ ہی شام کو وہ طلب جاتی ہے نہ ڈانس کرتی ہے بس چپ چاپ گھر پر پڑی رہتی ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل جلتا ہے۔

میں نے اسے تسلی دے کر رخصت کیا کہ یہ معمولی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اب ہمارے ہاں یہ بات عجیب خیال کی جائے گی کہ ماں اس بات پہ پریشان ہو جائے کہ اس کی بیٹی کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں اور وہ رات کو کلب نہیں جاتی لیکن نئی بات یہی ہے کہ اس سوسائٹی کے حوالے سے اس ماں کی یہ پریشانی سو فی صد درست تھی۔ اس لئے کہ وہاں اس بات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ لڑکی لڑکا جوان ہو اور اس کا کوئی بوائے یا گرل فرینڈ نہ ہو۔ اگر ایسا کوئی واقعہ ہو جائے تو اس واقعے کو غیر معمولی یعنی اینارمل سمجھا جائے گا۔ بالکل ہمارے ہاں اس لڑکی کی طرح جس کے لئے کوئی رشتہ نہ آ رہا ہو تو یہ پریشانی کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے ہاں کوئی لڑکی کھلے بندوں کسی لڑکے سے تعلق بنائے اور اس کا چہرہ چاہو تو یہ بات غیر معمولی خیال کی جاتی ہے اسی طرح وہاں اگر کسی لڑکے یا لڑکی کا کسی سے تعلق نہ بنے تو اسے اینارمل سمجھا جاتا ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ امریکا جا کر میں نے کیا پایا تو جہاں تک روپے پیسے کا تعلق ہے تو کمایا میں نے خاصا تھا لیکن مجھے جمع کرنے کی عادت نہیں۔ وہاں میں نے اچھا کھایا اور اچھا

پہنا۔ گھر میں نے اتنے ہی پیسے جیسے جتنے قرض لئے تھے اور جب پاکستان واپس آیا تو میرے پاس نقد صرف پانچ سو روپے تھے۔ یہ رقم میں نے ابائی گودے دی لیکن کچھ دنوں بعد جب ضرورت پڑی تو واپس لے لی۔ امریکا میں کمائی ہوئی رقم کا بیشتر حصہ میں نے اس طرح خرچ کیا۔ جب مناسب پیسے جمع ہو جاتے تو کسی شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ واپس پر بعد میں، میں نے وہ رقم جو خرچ کی تھی یورپ کی سیاحت پر خرچ کر دی اور جہاں تک شعور اور آگہی کا تعلق ہے تو مجھے اعتراف ہے کہ امریکا جانے سے پیشتر اپنے تمام تر مطالعے اور مشاہدے کے باوجود میں خاصا کمزور تھا۔ امریکا میں قیام کے بعد جب میں واپس آیا تو بظاہر مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، نہ حیلے میں نہ بول چال میں، نہ رویے میں لیکن میرے اندر ایک انقلاب آچکا تھا۔ وہاں جا کر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں کتنی ترقی کر چکی ہے بلکہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور ہم کہاں کھڑے رہ گئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دیگر فوائد کے علاوہ امریکی اور یورپی لوگوں کی سوچ سا غفلت ہے اور وہ اسی حوالے سے چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں خیال اور خواب کی دنیا میں رہنے کے بجائے وہ حقائق کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ جبکہ ہم اپنی خیالی دنیا میں بس رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو ہمارے ایشور ہونے چاہئیں ان پر ہم توجہ نہیں دیتے اور جو باتیں غیر اہم ہیں وہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

میں نے اپنے اندر اس تبدیلی کا اظہار ایک دم نہیں کیا بلکہ بہت آہستہ آہستہ کیا۔ وہ بھی اپنی تحریروں میں۔ اس زمانے میں، میں نے ایک سفر نامہ لکھا جو "شوق آوارگی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں میرے ان خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں کی خرابیوں کی اصلاح نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس خرابی کی نشاندہی کرنے والے کی بات ہی نہیں سنتے۔ بلکہ ایسے حالات بنا دیتے ہیں کہ اس کے لئے بات کرنا یا اپنے خیالات کا اظہار کرنا ممکن نہ رہے۔ اگرچہ ایک شعور لکھنے والے صحافی پر حکومت کی طرف سے بھی دباؤ ہوتا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں اور میرا تجربہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے دباؤ عوام کے دباؤ اور جبر کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا بہت جرات کی بات ہے لیکن اس دور میں یہ اتنی زیادہ مشکل بات نہیں اور کہنے والے کو اس کی اتنی زیادہ قیمت ادا نہیں کرنا پڑتی جس قدر وہ بات کہہ کر کرنا پڑتی ہے جو عوام کے مزاج کے خلاف ہو۔ بلکہ ایک لحاظ سے دیکھتے تو آج جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والا تو ہر صورت میں فائدے میں رہتا ہے۔ مثلاً جب کوئی یہ کام کرتا ہے تو

اس کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں۔ حاکم کو یہ بات پسند نہیں آتی تو وہ ہار کر رشوت کی پیش کش کرے گا تاکہ وہ اپنے اس کام سے باز رہے۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتا ہے تو بھی وقتی طور پر فائدے میں رہتا ہے جبکہ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اسے ٹھیل میں ڈال دے۔ اس صورت میں جب ٹھیل سے باہر آئے گا تو عوام کا ہیر و بن جائے گا۔ گویا دونوں صورتوں میں فائدہ ہے لیکن اگر آپ عوام کے نظریات کے خلاف بات کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ سخت بھگتنا پڑتا ہے اور آپ حکومت اور معاشرہ دونوں کی طرف سے راند و رنگہ بن جاتے ہیں چنانچہ میرے نزدیک جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی نسبت جابر عوام کے سامنے کلمہ حق کہنا زیادہ مشکل ہے۔

امریکا جانے سے پہلے میں اپنے اخبار کے لئے ایم اے او کالج کے پرنسپل کرامت حسین جعفری صاحب کا انٹرویو کر لیا تھا۔ باتوں میں لاجی کا ذکر چل اٹھا۔ انہوں نے کہا "معمولاً بہاء الحق قاضی کے بیٹے ہوتے تو اس لحاظ سے میرے نتیجے ہوتے۔ یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں یہاں کالج میں پچھرا شپ مل جائے تو کیا ہے؟" میں نے کہا "یہ بھی اچھا ہے۔" انہوں نے کہا "تو بس یہ سمجھ لو کہ آج سے تمہاری یہاں نوکری چکی۔ صبح آ کر جوائن کر لو۔" میں نے بتایا کہ میں امریکا جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہوں نے کہا "ٹھیک ہے امریکا جاؤ لیکن جب واپس آؤ تو اسی کالج آؤ گے۔ جب تک تم نہیں آؤ گے تمہارے لئے یہ سیٹ خالی رہے گی۔" چنانچہ یہ سیٹ دو سال تک خالی رہی یعنی جب میں واپس آیا اس وقت تک۔ اسی قسم کی آخر مجید نظامی صاحب کی طرف سے بھی موجود تھی جنہوں نے میرے امریکا جانے سے پہلے کہا تھا کہ تم جب بھی واپس آؤ گے میرے اخبار کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہوں گے۔ گویا میرے پاس دو ملازمتیں تھیں اور میں ان میں سے صرف ایک کر سکتا تھا۔ اس مسئلے کے حل کے لئے میں نظامی صاحب سے ملا اور انہیں ساری صورت حال بتادی۔ انہوں نے پوچھا کہ میری کیا خواہش ہے؟ میں نے بتایا کہ مجھے نیچنگ کی جاب زیادہ پسند ہے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تو پھر جوائن کر لیں مگر اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ میرے اخبار کے لئے کالم لکھتے رہیں گے۔ مجھے یہ صورت حال بہت پسند آئی چنانچہ میں نے ہاں کر دی۔ یوں روزگار کے حصول کا مسئلہ تسکین و خوبی حل ہو گیا۔

اس کے بعد شادی کا مرحلہ آیا تو گھر والوں نے میری پسند کے متعلق پوچھا میں نے بتایا کہ میری کوئی پسند نہیں۔ آپ لوگ جہاں مناسب سمجھتے ہیں کر دیں۔ اس کے بعد رشتوں کی تلاش شروع ہوئی۔ کچھ رشتے پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک رشتہ ہمارے جاننے والوں کا

تھا۔ لڑکی کا باپ ایک بہت بڑی فرم کا مینجنگ ڈائریکٹر تھا۔ جبکہ لڑکی خود کنیر ڈکی پڑھی ہوئی تھی۔ کار خود ڈرائیو کرتی تھی۔ لڑکی کی ماں ہمارے ہاں آئی اور اس نے خود اس معاملے میں بات کی اور خواہش ظاہر کی کہ رشتہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ اس نے باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ انہوں نے اپنے بڑے داماد کو کوٹھی بنا کر دی ہے جبکہ کار اس کے پاس پہلے سے موجود تھی اس لئے کار کی قیمت کے برابر پیسے نقد دے دیئے اور ظاہر ہے کہ یہ سب بتانے سے مقصود یہ تھا کہ شادی کی صورت میں مجھے بھی یہ سب کچھ دیا جاسکتا ہے۔ مجھے جب یہ باتیں بتائی گئیں تو میں نے کہا شادی کے ذریعے لڑکی کو میں نے بیاہ کر لانا ہے لیکن جو صورت حال بیان کی جارہی ہے اس میں یوں لگتا ہے لڑکی مجھے بیاہ کر لے جائے گی۔ اس وجہ سے میں نے انکار کر دیا۔ اسی طرح ایک اور رشتہ آیا۔ لڑکی میٹرکولیٹ تھی مگر خاندان بہت امیر تھا۔ وہ لوگ اس زمانے میں کروڑ پتی تھے۔ اسی طرح کئی اور رشتے آئے اور جب میں مسلسل انکار کرتا رہا تو گھر والوں نے پوچھا کہ میری شراٹا کیا ہیں تاکہ ان کے مطابق رشتہ تلاش کیا جائے۔ میں نے کہا ”بس اس قدر کہ لڑکی قبول صورت ہو۔ تعلیم یافتہ ہو اور اتھے خاندان سے ہو۔“ اس میں بھی میں نے وضاحت کر دی کہ تعلیم یافتہ سے مراد ڈگری ہولڈر نہیں ہے۔ ڈگری بے شک نہ ہو مگر با علم ہو۔ اسی طرح اچھے خاندان سے مراد امیر لوگ نہیں ہیں بلکہ شریف اور مہذب لوگ ہیں۔ اس کے بعد کئی رشتے دیکھے ان میں جو رشتہ مجھ سمیت سب کو پسند آیا وہاں شادی کر لی۔

شادی کے حوالے سے میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ شادی ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کے بارے میں پہلے سے پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ یہ کامیاب رہے گی یا نہیں۔ میں نے بہت سی ایسی شادیاں دیکھی ہیں جو محبت کی تھیں مگر ناکام رہیں۔ اسی طرح بہت سی ایسی جو اسخجذ تھیں مگر کامیاب رہیں۔ یہی صورت حال اس کے الٹ بھی ہے۔ یہ ایک لائری ہے جو جس کی قسمت ہو اس کی نکل آتی ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ یہ اسخجذ ہے یا لو میرج۔ اگر تو میاں بیوی دونوں سمجھ داری سے کام لیں گے تو یہ کامیاب رہے گی ورنہ ناکام۔ اور اللہ کا شکر ہے میری شادی انتہائی کامیاب رہی۔ دراصل میرے اندر لچک بہت ہے اور میں ہر قسم کے حالات سے کھجھوٹہ کر لیتا ہوں۔ مثلاً میں امریکا سے واپس آیا تو سیدھی بات ہے ایک صاف ستھرے شاندار معاشرے اور اچھی بھلی ملازمت چھوڑ کر آیا تھا اور یہاں ہمیں ہر روز اس طرح کے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو تکلیف دہ ہوتے ہیں مگر میں اس پر کبھی حرف شکایت لب پہ

نہیں لایا۔ اسی معاشرے سے گیا تھا اسی میں واپس آ گیا۔ اس طرح میں آداری میں کھانا کھا رہا ہوں یا ماسی برکتے کے تنور پر دونوں حالتوں میں خوش رہتا ہوں۔ شکایت نہیں کرتا۔ یہی رویہ میں نے ازدواجی زندگی میں بھی رکھا اور یوں ایڈجسٹمنٹ میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

میں سمجھتا ہوں کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کا راز صرف ایک چیز ہے وہ ہے Tolerance یعنی برداشت کی قوت عادت۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز اسے نہیں بچا سکتی۔ نہ محبت نہ دولت نہ کچھ اور۔ یہ برداشت دونوں اطراف سے ہونا ضروری ہے ورنہ کام نہیں چل سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ موقع محل کی مناسبت سے کبھی ایک فریق برداشت کر جائے تو کبھی دوسرا۔

اپنے تخلیقی سفر کے متعلق میں بتاتا چلوں کہ ابھی میٹرک میں پڑھتا تھا کہ لکھنا شروع کر دیا۔ ایف اے کے دوران ہفت روزہ ”شہاب“ میں میرا کالم چھپنے لگا۔ ایم اے تک پہنچتے پہنچتے کوئی اخبار باقاعدہ طور پر تو جو ان نہیں کیا گیا مگر میں بتا چکا ہوں کہ ”نوائے وقت“ میں طالب علموں کے ایڈیشن کے لئے لکھتا تھا۔ بعد ازاں باقاعدہ طور پر بھی جو ان کر لیا اور اس کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی باقاعدہ ہو گیا ہے۔

اس فیلڈ میں آنے کی وجہ ایک تو گھر کا ماحول علمی تھا اور دیکھنے کو ہر طرف کتابیں اور سننے کو پڑھنے لکھنے کی باتیں ملتی تھیں۔ اس چیز کا بھی بہت اثر ہوا تاہم میرا خیال ہے کہ آدمی کی شخصیت کی تعمیر اور اس کا رجحان متعین کرنے میں جینز کا بہت دخل ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے چاہے اسے موزوں ماحول مل جائے اس کے باوجود اس میں اس شعبے کے لئے رجحان موجود ہوتا ہے۔ بس اسے ذرا تحریک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا خاندان ایک ہزار برس سے علمی خاندان ہے اور اس میں کسی نسل کے درمیان کوئی گپ نہیں۔ ایک باپ عالم تھا تو بیٹا بھی عالم۔ اسی طرح اس کا بیٹا بھی۔ میں عالم دین نہیں بنا یعنی علم کا وہ شعبہ اختیار نہیں کیا جو میرے آباؤ اجداد کا تھا مگر میں علم ہی کی کسی اور شاخ سے منسلک ہوں۔ میری تین پھوپھیاں ہیں ان میں سے دو شعر کہتی تھیں۔ اسی طرح میرے ایک ہمشیرہ جب جج پر گئیں تو انہوں نے وہاں نعت کہی۔ یہ زندگی میں ان کی پہلی نعت تھی مگر موزوں اور بحر میں تھی۔ میری سب سے بڑی باجی بھی شاعرہ ہیں مگر وہ اپنا کلام چھپواتی نہیں ہیں۔ اسی طرح میرے بھائی ضیاء الحق قاسمی بزنس مین ہیں اور ان کی لائن ہی الگ ہے۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا کبھی تذکرہ سننے میں نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے یک دم شاعری شروع کر دی اور آج متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ کراچی کا کوئی قابل ذکر مشاعرہ

ان کے بغیر نہیں ہو پاتا اور آج جناح کے قارئین ان کو اب ایک کالم نگار کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں۔

خیر میں اپنے متعلق یہ بتا رہا تھا کہ یہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ دوران تعلیم ہی شروع ہو گیا تھا اس کی وجہ ہمارا خاندانی علمی پس منظر تھا۔ جب ایم اے او کالج میں تھا تو شعر کہتا تھا اور کالج کے یائین الکلیاتی مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ جب یونیورسٹی آیا تو یہاں میرے دوستوں میں امجد اسلام امجد، گلزار وفا چوہدری اور سرفراز سید وغیرہ تھے۔ ان دنوں ہم بیشتر غزل یا نظم کہنے کی بجائے جھوگوئی کرتے تھے اور کبھی کسی کی جھو کہتے تو کبھی کسی کی۔ اور نٹنل کالج میں ہم پینل کے درخت کے نیچے بیٹھتے اور جھوگوئی شروع ہو جاتی ان دنوں کی کئی کئی جھویں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ مثلاً میں نے یونیورسٹی کی ایک لڑکی پر جھو کہی۔ جو میں آپ کو سناتا ہوں تاہم اس میں سے اس لڑکی کا نام حذف کر رہا ہوں۔ اس کے بجائے اے بی سی لگا دیا ہے۔ وہ جھویوں تھی۔

ہر اک کو ہے لفٹ کرائے اے بی سی  
لیکن میرے پاس نہ آئے اے بی سی  
کالج میں یوں چلتی ہے وہ اکڑ اکڑ کے  
جیسے ہو اک اڑیں گائے اے بی سی  
کون ہے اپنی بھونڈی شکل پہ اتنا نازاں؟  
سب کی ہے مجموعی رائے اے بی سی  
اس کے پیچھے پھرے ہے احقر مونچھوں والا  
رو رو کر یہ کہتا جائے اے بی سی

آخری شعر میں احقر دراصل احقر نظامی ہے جو ہمارا کلاس فیلو اور دوست تھا۔ یہ جھوگوئی بس یونیورسٹی تک ہی رہی۔ البتہ مزاحیہ نظم کبھی کبھی ہو جاتی تھی مثلاً ایک زمانے میں ”نوائے وقت کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ ننھواہیں، کالموں کا معاوضہ یک مشت ملنے کے بجائے قسطوں میں ملتا تھا اور جتنے پیسے ملتے ان سے بمشکل سگریٹ کا ایک پیکٹ آتا۔ اس زمانے میں میں نے ایک نظم کہی۔ جس کے آغاز میں اپنی مالی مشکلات کا رونا رویا۔ بتایا کہ کس طرح بل ادا نہیں ہو رہے۔ قرض خواہ تنگ کرتے ہیں۔ دفتر جا کر کیشیئر سے کہتے ہیں کہ وہ بتائے ہمارا کیا حساب ہے اور سارے پیسے نہیں تو کم از کم آدھے ادا کرے۔ اس پر کیشیئر حساب لگاتا اور پھر کہتا ہے۔

بہتے ہیں چار سو۔۔۔ ترے، فی الحال چار رکھ  
”بیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ“

دراصل میں تخلیقی حوالے سے جو بھی لکھتا ہوں اس میں مزاح کا عنصر ضرور ہوتا ہے اور مجھے یہ چیز کسی حد تک ورثے میں ملی ہے۔ ابا جی امرتسر سے پندرہ روزہ ”ضیاء الاسلام“ نکالتے تھے۔ جس میں ان کا فکاہیہ کالم ہوتا تھا۔ یہ طنز کا بہت خوبصورت نمونہ ہوتا تھا۔ اس وقت تو میں ابھی چھوٹا تھا۔ اس لئے پڑھ نہیں سکتا تھا۔ تاہم گھر میں اس کی فائل موجود ہے جو بڑے ہوئے پر میں نے پڑھی۔ ان کالموں کے کئی ایسے فقرے مجھے اب تک یاد ہیں جو اپنے انداز خوبصورت طنز اور ہکا پھکا مزاح لئے ہوئے تھے۔ مثلاً عرب پر جب نجد والوں کا قبضہ ہوا اور انہوں نے یہ کہہ کر مزاروں کو ڈھانا شروع کر دیا کہ یہ شرک ہے تو اس پر ابا جی نے جو فکاہیہ کالم لکھا اس میں انہوں نے لکھا ”یہ تو حید نہیں، تو حید کا ہیضہ ہے۔“ اسی طرح ایک اور موقع پر انہوں نے یہ فقرہ بھی کہا تھا کہ ”پہلے زمانے کے نوجوانوں کو دیکھ کر دہشت طاری ہوتی تھی جبکہ آج کل کے نوجوان کو دیکھ کر ”شبوت“ طاری ہوتی ہے۔ چنانچہ کچھ تو وراثت کا اثر تھا“ کچھ حسن مزاح میری طبیعت میں شامل تھی۔ مجھے تو یاد نہیں مگر میرے بہن بھائی اور دوست بتاتے ہیں کہ میں بچپن میں بہت ”روٹھی“ ہوتا تھا اور اپنی باتوں سے سب کو ہنساتا تھا۔

میری پہلی تصنیف ”روزانہ دیوار سے“ تھی جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی اور اسی برس کا آدم جی ایوارڈ بھی اسے ملا۔ البتہ ذاتی طور پر مجھے اپنا سفر نامہ ”شوق آوارگی“ بہت عزیز ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی تھی تو جب سفر ناموں کا ذکر ہوتا تو اس میں ”شوق آوارگی“ کا ذکر ضرور کیا جاتا۔ یوں غالباً یہ واحد کتاب ہے جس کی شہرت اور تذکرہ اس کی اشاعت سے بھی پہلے شروع ہو گیا تھا۔ میری اب تک متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً عطائے، خند مکر، جرم ظریفی، سرگوشیاں، ملاقاتیں ادھوری ہیں، گوروں کے دیس میں، جس معمول، کالم دالم اور تجاہل کالمات۔

ڈرامہ نگاری کی طرف میرے رجحان کا سبب میرے دوست بنے۔ انہوں نے مجھ سے کئی مرتبہ پوچھا کہ میں ڈرامہ کیوں نہیں لکھتا اور اصرار کیا کہ لکھوں۔ اس کے علاوہ ٹی وی کے کئی لوگوں مثلاً ضیاء جالندھری، آغا ناصر، کنور آفتاب احمد، ظہور بھائی وغیرہ نے بھی بار بار اصرار کیا۔ میرا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا یہ کہ مجھے ڈرامہ لکھنا نہیں آتا جبکہ ان کا اصرار ہوتا تھا کہ مجھے ڈرامہ

لکھنا آتا ہے اور بہت اچھا آتا ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ میرے ہی کالموں کا حوالہ دے کر کہتے کہ ان میں سے ہر کالم میں مکمل ڈرامہ موجود ہے۔ خیر میں کسی نہ کسی طرح ناتواں رہا۔ اسی دوران ایوب خاور کو اس شرط پر سیریل الاٹ ہوا کہ رائٹر عطاء الحق قاسمی۔ ایوب نے مجھ سے بات کی تو میں نے وہی جواب دیا کہ مجھے ڈرامہ لکھنا نہیں آتا۔ اس پر ایوب نے کہا ”تم لکھنا تو شروع کرو۔ نہ لکھ پائے تو نہ سہی۔“ خیر میں نے لکھنا شروع کیا یہ ”اپنے پرانے“ تھا جو میری ہی نہیں ایوب خاور کی بھی پہلی سیریل تھی۔ شروع میں ڈرامہ شکل پیش آئی۔ مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوتا گیا اور مجھے خود اس کام میں مزہ آنے لگا۔ جب میں نے چار قسطیں لکھ لیں اور یہ ریکارڈ بھی ہو گئیں تو انہیں دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا یہ دوسروں کی کیا خود میری توقع سے بھی زیادہ شاندار تھیں۔ سب کو یقین تھا کہ یہ ڈرامہ سپر ہٹ ہوگا اور شاندار ایسا ہی ہوتا لیکن انہی دنوں ایک بڑا مس ہیپ ہو گیا۔ جن دنوں میرا ڈرامہ ریکارڈ ہو رہا تھا انہی دنوں کراچی میں انور مقصود کے ڈرامے کی ریکارڈنگ بھی ہو رہی تھی۔ جب دونوں کی چار چار قسطیں ریکارڈ ہو گئیں تو پی ٹی وی کے ایم ڈی ضیاء جالندھری نے کراچی جا کر انور کے ڈرامے کی چاروں قسطیں دیکھیں۔ اس ڈرامے میں ایک ہیجڑے کا کردار تھا جو سلیم ناصر کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ضیاء جالندھری ناراض ہوئے اور جھاڑ بھی پلا دی کہ یہ ہیجڑے کا کریکٹر کیوں رکھا گیا ہے لیکن کراچی ٹی وی والے دلیر لوگ ہیں انہوں نے کہا کہ چونکہ اس سیریل کی چار قسطیں ریکارڈ ہو چکی ہیں اس لئے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کاٹ چھانٹ کی تو ڈرامہ تباہ ہو جائے گا۔ ہاں یہ کر سکتے ہیں کہ اگلی قسطوں میں آہستہ آہستہ اس میں ایک کریکٹر کو بدل دیں۔ خیر ان کا معاملہ یوں ٹپٹ گیا۔ اس کے بعد ضیاء جالندھری لاہور آئے یہاں میرے ڈرامے کی قسطیں انہیں دکھائی گئیں۔ اس میں ایک کریکٹر تھا جو بات کرتے ہوئے اپنے چچا کا ہاتھ کھینچتا تھا۔ ضیاء صاحب نے ٹی وی کی پالیسی یا اپنی پسند کے مطابق کہا کہ یہ غلط بات ہے لہذا اسے بدل دیا جائے بجائے اس کے کہ لاہور ٹی وی کراچی ٹی وی والوں کی طرح دلیری دکھاتا ایم ڈی سے بحث کرتا اور اسے قائل کرتا، اس کے بجائے جی ایم نے پروڈیوسر کو بلا کر کہا کہ اس میں سے یہ سب سین کاٹ دو۔ اس پر پروڈیوسر، ایکٹر اور میں، سب لوگ بہت دل برداشتہ ہوئے۔ تاہم ایوب خاور کو اس کی بات ماننا پڑی چنانچہ وہ سین کاٹ دیئے گئے جس کے نتیجے میں چار قسطیں دو بن کر رہ گئیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد تسلسل بھی نہ رہا اور ناظرین کو دیکھنے میں اس طرح مزہ بھی نہیں آ سکتا تھا۔ غرض لاہور ٹی وی نے اس سیریل کا بیڑہ غرق کرنے اور اسے ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ حیرت ہے کہ یہ

اس کے باوجود فلاپ ہونے سے بچ گئی لیکن اس تلخ تجربے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ٹی وی کے لئے کچھ نہیں لکھوں گا۔ لیکن پھر ایوب خاور نے اصرار کیا اور اس کا یہ اصرار اس قدر بڑھا کہ مجھے پھر ایک ڈرامہ لکھنا پڑا۔ یہ ”خولہ اینڈ سن“ تھا اور یہ عوام کو جس قدر پسند آیا وہ تو سب جانتے ہی ہیں۔ میرے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ ایک روز پروین شاکر کا فون آیا اس نے بتایا کہ دہلی سے آئی ہے اور ایئر پورٹ سے بول رہی ہے کیونکہ اسے سیدھے اسلام آباد جانا ہے۔ فون اس غرض سے کیا ہے کہ بھارت میں قرۃ العین حیدر سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ پورے پندرہ منٹ ”خولہ اینڈ سن“ کی تعریف کرتی رہی تھیں۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا۔ اس لئے کہ میں تو خود قرۃ العین حیدر کا مداح اور ان سے مرعوب تھا۔

میرے ڈراموں کی پسندیدگی کی ایک بڑی وجہ میرا یہ تجزیہ ہے کہ ہمارے بیشتر ٹی وی ڈرامے گھبر کے بل پہ چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان میں ماحول اور کردار دونوں دولت مند طبقے کے ہوتے ہیں۔ ۲۰، ۲۰ کنال کی کوٹھیاں، سیلون کاریں، منہ میٹھا کر کے بولنے والے انٹرمیڈیٹ لڑکے لڑکیاں۔ بے شک یہ لوگ ہمارے ہی ملک میں بستے ہیں لیکن اول تو وہ جس کلچر کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں وہ ہمارا کلچر نہیں۔ دوسرا یہ لوگ ایک فی صد سے بھی کم ہیں جو ایسی پر آسائش زندگی گزار رہے ہیں۔ باقی ننانوے فی صد منڈل کلاس کے یا لوئر کلاس کے لوگ ہیں۔ یعنی غریب۔ ان کے گھر چھوٹے چھوٹے۔ خوشیاں چھوٹی چھوٹی۔ معمولی چیزوں کو ترستے ہوئے یہ لوگ پہلے ہی احساس محرومی کا شکار اور فرسٹرینڈ ہیں۔ جب انہیں ۲۰ کنال کی کوٹھیاں، ڈرائنگ روم، وسیع لان، سیلون کاریں دکھائی جاتی ہیں تو ان کی محرومیاں فزوں تر ہوتی جاتی ہیں اور وہ ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چاہے لگتے ہیں کہ کسی طرح پیسہ کمائیں اور اس طبقے میں شامل ہو جائیں لیکن جب ایسا نہیں ہو پاتا تو پھر یہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ پیسہ کمانے کے ناجائز ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔ قتل کرتے، ڈاکے ڈالتے اور ناجائز دھندے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ صورت حال قابل رشک نہیں۔ انہیں اس سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے ماحول اور ایسے کردار دکھائے جائیں جو انہی کے ارد گرد کے ماحول اور لوگوں جیسے ہوں تاکہ ان پر ایک تو اس نوع کا ڈیپریشن طاری نہ ہو دوسرے یہ کہ بجائے غیر ملکی کلچر دکھانے کے انہیں اپنا کلچر دکھایا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے ڈراموں میں اندرون شہر کا ماحول دکھایا کیونکہ جب یہ طے ہے کہ اپنا کلچر اور پھر ننانوے فی صد آبادی کی معاشی حالت والا ماحول دکھانا ہے تو پھر یہ ماحول اندرون شہر کا بھی ہو سکتا

ہے۔ کسی گاؤں کا بھی یا کسی اور علاقے کا بھی۔ اب سوال یہ ہوا کہ اندرون شہر ہی کا کیوں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انتخاب کے لئے مختلف چیزیں ہوں تو ان میں سے کوئی ایک منتخب کر لی جاتی ہے اور میں نے اندرون شہر کا انتخاب کر لیا۔ اس کے بجائے کوئی دوسرا ماحول منتخب کرتا تو اس پر بھی اسی طرح کا اعتراض ہو سکتا تھا ویسے ذاتی طور پر مجھے یہ ماحول بہت Fascinate کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ لوگ اور بچل ہیں۔ کھلے ڈالے ہیں۔ ان کے ظاہر بالین میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں تصنع نہیں۔ منافق نہیں۔ زندگی مصنوعی نہیں۔ جس طرح گزارنا چاہتے ہیں اسی طرح گزارتے ہیں اور اس پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ اپنی دھرتی اپنے کچھ سے وابستہ۔ ڈراموں کے علاوہ میں نے شاعری میں بھی یہ بات بیان کی ہے۔

ولیم، پنیر، ڈکس، تھامسن، ہیری سے کیا لینا؟

ہمیں تو اپنے مانجھے گائے اچھے لگتے ہیں

اس کی وجہ ان کی اور بچلٹی ہے اور اور بچلٹی مجھے اس قدر عزیز ہے کہ مجھے تو وہ لوگ بھی پسند نہیں جن کی مادری زبان پنجابی ہو مگر وہ آپس میں بھی اس کے بجائے اردو میں بات کر رہے ہوں۔ صاف ظاہر ہے وہ تصنع سے کام لے رہے ہیں۔ یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ میں اردو کے خلاف نہیں ہوں۔ یہ ہماری قومی زبان ہے اور مجھے بے حد عزیز ہے لیکن میری مادری زبان پنجابی ہے اور مجھے جب کوئی دوسرا پنجابی ملتا تو میں اس سے پنجابی کے بجائے اردو میں بات کیوں کروں؟ ایسا کیا جائے تو صاف ظاہر ہے تصنع ہوگا۔

میں ۱۹۷۱ء میں امریکہ سے واپس آیا تھا۔ اس کے بعد دس بارہ برس وطن ہی میں رہا۔ اسی کے عشرے میں بیرون ملک سفر کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اور میں دنیا کے بہت سے ممالک گیا۔ ان میں یورپ، امریکہ، خلیج کے ممالک اور چین، انڈونیشیا، سنگاپور اور بھارت وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ایک مزرے کی بات یہ ہوئی کہ مشہور پامسٹ، ایم اے ملک نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تم بہت سفر کرو گے۔ میں نے کہا ”ملک صاحب! یہ آپ نے کون سی انوکھی بات بتائی ہے؟ یہ تو ایسا بڑا ہے جو بچہ بھی لگا سکتا ہے۔ اس لئے کہ میں تو پہلے ہی بہت سفر کر چکا ہوں اور کر بھی رہا ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ جتنے سفر پہلے کئے ہیں وہ ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس کے بعد اتنے مختلف ممالک میں سفر کرنا پڑا جسے کہ تم تنگ آ جاؤ گے۔ چنانچہ اس کے بعد واقعی میں نے بہت سفر کئے اور اب تک مسلسل سفر کی حالت میں ہوں۔ ۸۷ء میں امریکہ گیا، ۹۲ء میں پھر

وہیں، اس کے علاوہ دو دفعہ چین، خلیج کے ممالک میں، اس کے علاوہ عمرہ بھی گیا۔

خلیج کے ممالک میں مجھے متحدہ عرب امارات، قطر، مسقط اور سعودی عرب جانے کا موقع ملا ان ممالک میں مشاعروں کی غرض سے جانا ہوا لیکن سعودی عرب میں مشاعروں کے ساتھ ساتھ عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ جس برس عمرہ کرنے گیا، وہاں ایک عجیب واقعہ ہوا میرے ساتھ کراچی کے ایک دوست شاعر بھی تھے۔ جب ہم جدو ایئر پورٹ پر اترے تو عربی لباس میں لمبوس ایک پاکستانی شخص ہمیں آکر ملا اور دعائے سلام کے بعد چھوٹے ہی کہنے لگا ہمیں آپ لوگوں کی آمد کا علم ہوا تھا چنانچہ حاضر ہو گیا۔ گزارش یہ ہے کہ جدو میں ایک مشاعرہ ہے آپ سے درخواست ہے کہ سیدھے وہیں تشریف لے چلیں، سب انتظام مکمل ہے۔ ہم نے بتایا کہ ہم مشاعرہ پڑھنے نہیں عمرہ ادا کرنے آئے ہیں اور بس ابھی احرام باندھنے ہی والے ہیں، وہ بولا ”عمرہ تو بعد میں بھی ہو جائے گا آپ پہلے مشاعرے میں چلیں۔ آپ کو اس کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے خوب سنائیں، چنانچہ وہ چپ چاپ واپس چلا گیا جبکہ ہم نے احرام باندھے اور عمرے کی ادائیگی کے لئے چل پڑے۔

خانہ کعبہ پہنچ کر میری عجیب کیفیت تھی، یہ ایک بالکل انوکھا تجربہ تھا جس کی لذت سے میں پہلے بالکل نا آشنا تھا۔ نئی بات یہ ہے میرا خیال تھا کہ ہم آزاد خیال لوگ ہیں گناہوں سے ہمارے دل سیاہ ہو چکے ہیں لہذا کیفیت کیا طاری ہوگی؟ لیکن جب احرام باندھا اور حرم شریف کی طرف چلے تو عجیب بات یہ ہوئی کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنا شروع ہو گئے اس قدر زیادہ کہ رکے کا نام لیتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اپنے گنہگار ہونے پر ندامت تھی، خدا کے گھر پہنچنے کی خوشی تھی، اپنی کمائیگی کا احساس تھا یا یہ سب کچھ تھا بہر حال آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آتے تھے۔

ایک اور بات ایسی ہوئی کہ جو اگر میرے تجربے میں نہ آتی تو میں کبھی بھی اس پر یقین نہ کرتا، کراچی میں میری ایک بھانجی رہتی ہے۔ جن دنوں میں عمرے پہ جا رہا تھا وہ بیمار تھی۔ بیماری عجیب تھی کہ ایک بازو سوج گیا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ بازو کاٹ دیا جائے اور اگر ایک ہفتے کے اندر اندر آپریشن نہ کرایا تو ہر جسم میں داخل ہو جائے گا اور پھر موت واقع ہو سکتی ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ حرم شریف کو دیکھ کر جو پہلی دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں آنکھیں بند کر کے چل رہا تھا اور ساتھی سے کہا تھا کہ جب خانہ کعبہ سامنے آ جائے تو مجھے بتا دینا، اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر کعبہ شریف دیکھا اور دو دعائیں

ماتیں، ایک اپنی بھانجی شاہدہ کے لئے اور دوسری اپنے دوست احمد حسن حامد کی ٹائیٹا میٹی کے لئے، عمرے کی ادائیگی سے فارغ ہو کر جب میں کراچی پہنچا اور اپنی بھانجی کے گھر گیا تو دیکھا وہ بالکل صحت مند ہے۔ میں نے پوچھا کیسے ٹھیک ہوئیں؟ اس نے بتایا کہ چند دن پہلے پھوڑے کا منہ بن گیا اور پھر اس میں سے گندامو اوٹکنے لگا، مواد اتنا بدبودار تھا کہ نو دھیری برداشت سے بھی باہر تھا۔ اتنا مواد نکلا کہ بالٹی بھر گئی اور اس کے بعد میں بھلی چٹکی ہوئی۔ میں نے پوچھا 'یہ کب کی بات ہے؟' جواب میں اس نے جو دن اور وقت بتایا وہ وہی تھا جب میں نے حرم شریف کو دیکھ کر دعا مانگی تھی تاہم میں نے اپنے دوست کی بیٹی کے لئے دعا مانگی تھی وہ قبول نہ ہو پائی۔

بطور سیاح سعودی عرب کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ یہ ایک خوبصورت ملک ہے۔ خصوصاً جدہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی، وہاں پاکستانیوں نے اتنی رونق لگا رکھی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب شام کو کسی جگہ موسیقی کی محفل یا مشاعرہ نہ ہو رہا ہو۔ غرض کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی ہے۔ یہاں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے بھی ہوئی جو ہے تو عرب مگر اردو شاعری کرتا ہے۔ اس کا نام عمر العیلا اس ہے۔ اردو کا ایک اور عرب شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق ہے جو دہلی میں ہے، مجھے اس کا ایک شعر جو بہت اچھا لگا، یاد ہے۔

دشمن دلیر ہوتا تو آتا مزہ مجھے

فاروق ڈر رہا ہوں کہ بزدل کی زد میں ہوں

چینی ممالک کے حوالے سے بتاتا چلوں کہ وہاں کے حکمرانوں کا عالمی سیاست میں جو کردار ہے اس سے بادشاہت و آمریت کو نکال دیں تو یہ ملک بہت اچھے ہیں۔ بہت پرسکون زندگی ہے، رزق کی فراوانی ہے، یہاں کوئی مقامی باشندہ غریب نہیں ہے، قانون کی پابندی ہے، لڑیلک کے قوانین، سخت کے قوانین پر پوری طرح عمل ہو رہا ہے، وہ تمام سہولتیں موجود ہیں جو یورپ کے لوگوں کو حاصل ہیں۔ اس معاملے میں وہاں کی انتظامیہ نے طور طریقے بھی انہیں لوگوں کے اپنائے ہیں۔

چین دو مرتبہ گیا ہوں، پہلی مرتبہ ہمارا نور پندرہ روز کا تھا جبکہ دوسری مرتبہ محض ایک ہفتے کا، دونوں مرتبہ جا کر بے حد خوشی ہوئی۔ چینی کچھ بہت رچا ہے اور کئی باتوں پر سیاح کو بے حد حیرت ہوتی ہے مثلاً وہاں کے جس شہر کے بارے میں دریافت کیا معلوم ہوا کہ کم از کم پانچ ہزار سال پرانا ہے۔ ہر شہر اسی قدر یا اس سے بھی زیادہ قدیم نکلا، نتیجہ یہ کہ جگہ آ کر ہم نے شہروں کی

تاریخ کے بارے میں پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ ہزاروں برس پرانے بادشاہوں کے مقابلہ بھی دیکھے، ایک شہنشاہ کا مقبرہ دیکھنے گئے تو وہاں بادشاہ کی قبر کے ساتھ ایک صندوق دھرا تھا اور ساتھ ایک قبر اور بھی تھی، پوچھا یہ کیا ہے؟ گائیڈ نے بتایا کہ صندوق میں سونا چاندی اور جواہرات ہیں کہ مردے کو اگلی دنیا میں ان کی ضرورت پیش آجائے جبکہ دوسری قبر میں ایک کنیر کو دفن کیا گیا تھا مقصد اس کا بھی وہی تھا کہ اگلے جہان یاد و بارہ زندہ ہونے کی صورت میں بادشاہ کی خدمت کر سکے۔

چین کے سفر کے دوران میں ماؤ کے مقبرے پر گیا اور وہاں ہاتھ اٹھا کر تین دفعہ الحمد للہ اور قل شریف پڑھا اور ماؤ کے لئے دعا کی۔ چینی اب بھی ماؤ کو پسند تو کرتے ہیں مگر پسندیدگی کا لیول اب وہ نہیں جو ستر کے عشرے تک تھا، حالانکہ یہ بہت عجیب بات ہے۔ اس کے ساتھ دوسری بات یہ ہوئی کہ وہ جوان کی مطمئن، پرسکون اور قناعت سے پر زندگی تھی وہ اب رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی جا رہی ہے اور اسے ختم کرنے میں مغرب کا بہت ہاتھ ہے، اس کے ٹورسٹ وہاں جا رہے ہیں۔ مصنوعات درآمد کی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی فلمیں، یہ سب چیزیں مل کر ان سے ان کا اطمینان چھین رہی ہیں۔ نئی نسل مطمئن نہیں، فرسٹریشن بڑھ رہی ہے، چینی عوام بہت تیزی سے مغربی کلچر کے اثرات قبول کر رہے ہیں۔ مغرب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنا اثر و نفوذ اپنے کلچر کے ذریعے کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی باری آتی ہے جو انسان سے قناعت چھین لیتا ہے۔ سادہ زندگی کو پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ خواہشوں میں اضافہ کر دیتا ہے اور انسان کو مشینوں کا غلام بنا کر رکھ دیتا ہے اور چین میں بھی یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔

چینیوں کی مساوات کے حوالے سے بتاتا چلوں کہ اب وہ ان میں پہلے کی سی مساوات نہیں رہی، ۱۹۸۰ء میں شنگھائی میں ہمیں ایک ارسٹو کریٹ چینی ادیب سے ملوایا گیا، جو تھری ڈیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ اس کے پاس موٹر سائیکل بھی ہے اور کتا بھی، چونکہ عام چینی بائیکل یا بس پر سفر کرتے ہیں اس لئے موٹر سائیکل کا ہونا امارت کی نشانی ہے جبکہ کتے کے بارے میں بتانے سے مقصد یہ تھا کہ وہ اتنا امیر ہے کہ اس نے کتا پکا کر کھا نہیں لیا بلکہ اسے پال رکھا ہے۔

یوں تو چینیوں کی بہت سی باتیں اور چیزیں ایسی تھیں جن پر رشک آسکتا تھا اور آیا بھی مثلاً صفائی نظم و ضبط وغیرہ۔ تاہم چین میں جس شخص پر سب سے زیادہ رشک آیا وہ کوئی چینی نہیں ایک پاکستانی تھا جو ہمارے ساتھ وفد میں شامل تھا۔ 'نیشن' کے نصرت جاوید تھے جن کی بہت

کھنی ڈاڑھی ہے اور جب چین میں انہوں نے اس کے ساتھ شہروانی پہنی تو وہ شرعی ڈاڑھی کی حیثیت اختیار کر گئی اور وہ صحافی کے بجائے اسلامی جمعیت طلباء کے ناظم نظر آنے لگے۔ چونکہ چینی لوگوں کے چہرے پر بال بہت کم آتے ہیں اور وہاں کھنی ڈاڑھی ایک نئی اور خاص چیز تھی لہذا ان کی ڈاڑھی کو سب غور سے دیکھتے اور اسے بہت پزیرائی حاصل ہوتی۔ اس پر فطری بات ہے ہمیں رشک آتا، تاہم اس وقت تو انتہا ہو گئی جب ایک چینی حسینہ نے ان کی ڈاڑھی کو باقاعدہ منوال کر دیکھا اور خاصی دیر اپنی نرم و نازک انگلیوں سے اسے سہلاتی رہی۔ اس پر مجھے رشک کیا باقاعدہ حسد محسوس ہوا اور صرف مجھے ہی نہیں بلکہ وفد کے دوسرے ارکان کو بھی، حالانکہ ان میں بھی کئی مثلاً محمد صلاح الدین مرحوم اور لیاقت بلوچ شامل تھے اور ان کی ڈاڑھیاں بھی تھیں مگر جو بات نصرت کی ڈاڑھی میں تھی وہ ان کی ڈاڑھیوں میں کہاں؟ خود مجھ پر اس سانے کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد میں جتنے روز چین میں رہا سفتی ریز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

اردو کو ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے چین میں بہت مناسب مقام حاصل ہے۔ یونیورسٹی لیول تک پڑھائی جاتی ہے اور بہت سے چینی پڑھتے اور بولتے ہیں، ان میں کئی شاعر بھی ہیں مثلاً چانگ شی شیوان جو اردو میں اپنا تخلص انتخاب عالم کرتے ہیں۔ یہ اتنا خوب صورت اور حیران کن حد تک شاعر شاعر ہے کہ اس کا شمار اردو کے اچھے شعراء میں ہو سکتا ہے یعنی ان میں نہیں جو غیر ملکی ہیں مگر اتنے اردو شعر کہتے ہیں بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے اچھے شاعروں میں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

خزاں گزیدہ چمن میں بہار باقی

کہ تخم گل پہ مرا اعتبار باقی ہے

تخم گل کا اس قدر خوب صورت استعمال میں نے اردو شاعری میں اس سے پہلے نہیں

نہیں دیکھا۔

دیوار چین کی سیر کے متعلق بتانا چلوں کہ وہ بہت شاندار ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمارے علاوہ ہزاروں دوسرے سیاح بھی موجود تھے۔ موسم اتنا خوب صورت، لوگ خوب صورت، ہر طرف اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیر بن پینے خوب صورت چہرے گھوم پھر رہے تھے، ایک خوب صورت پروں والی قلی نے ہمارے آگے اڑنا شروع کر دیا، نیچے قلی کے پیچھے لپکے جبکہ بڑے

بھی اسے خوشی اور اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ تب ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک چینی مزدور جس نے بند گلے کا کوٹ اور ماؤ کیپ پہن رکھی تھی۔ اس خبیث نے کوٹ اتارا اور اسے جھلا کر قلی پر دے مارا، قلی زخمی ہو کر نیچے گر گئی۔ یہ اتنا افسوس ناک واقعہ تھا کہ تمام سیاح جمع ہو گئے اور انہوں نے قلی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ ایک بچے نے قلی کو اٹھایا اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے سانسوں کی گرمی پہنچائی اس سے قلی کو کچھ افادہ ہوا اور اس کے حواس قائم ہوئے۔ چنانچہ اس نے پر ہلائے اور فضا میں اڑ گئی۔ یہ دیکھ کر چھوٹے بڑے سب بچوں کی طرح خوش ہوئے اور انہوں نے ایک بھر پور فخر و لگاؤ لگایا۔ اس منظر نے دیوار چین کی سیر کو یادگار بنا دیا۔ یہ واقعہ ہوتا تو یہ سیر ایک عجیب سی بات کے حوالے سے یاد رہتی۔ وہ یہ کہ ہمیں دیوار چین پر ٹائلٹ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی تو دیکھا کہ ان کے دروازے ہی نہیں ہیں، یعنی بنائے ہی نہیں گئے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے جو ایک پرائیویٹ اور پروے کی ضرورت ہوتی ہے وہ پوری نہیں ہوتی تھی اور آدمی کو اسی طرح کی بہادری دکھانے پڑتی ہے جو ہمارے دیہات میں یا کبھی کبھار شہروں میں تنگ آمد جنگ آمد قسم کی صورت حال میں نظر آتی ہے۔

انڈونیشیا کی سیاحت کا حال بھی بہت دلچسپ ہے۔ وہاں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ مذہبی ہیں۔ مگر سرکاری اور عوامی دونوں سطح پر مذہبی رواداری موجود ہے۔ چکارتہ کی سب سے بڑی مسجد استقلال کے ساتھ ایک مندر اور ایک گر جا گھر بھی بنایا گیا ہے جو رواداری اور تائرنس (Tolerance) کا مظہر ہے۔ مجھے جس بات نے سب سے زیادہ حیران کیا وہ یہ کہ نماز کے وقت مسجدوں میں بہت رش ہوتا ہے اور پھر مردوں کے علاوہ خواتین بھی کچھلی صفوں میں نماز ادا کرتی ہیں۔ ایک روز عشاء کی نماز ادا کرنے مسجد گیا ہوا تھا۔ کچھلی صف میں منی سکرنوں میں لیبوں و عورتیں بھی نماز کے لئے کھڑی تھیں، کولہوں سے نیچے ٹائلیں بالکل ننگی تھیں، جب نماز شروع ہوئی تو انہوں نے ٹانگوں پر کپڑا لپیٹ لیا تاہم سلام پھیرنے کے بعد اسے اتار دیا، اس سے ہم دو نتیجے نکال سکتے ہیں، ایک یہ کہ مغرب کی پیروی کے باوجود لوگوں کی مذہب سے وابستگی موجود ہے۔ انہوں نے اسے ترک نہیں کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذہب کی انہوں نے اپنا ایک تشریح کی ہے۔ ہماری طرح وہ پروے وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔

میں نے دنیا کے مختلف ممالک میں مذہب کے حوالے سے اور بھی بہت سی عجیب باتیں دیکھی ہیں۔ مثلاً امریکا سے واپس آتے ہوئے ترکی کے قصبہ ارض روم میں گھومتے ہوئے میں نے

ایک گراؤنڈ میں والی بال کھیلنے لگو جو انوں سے مسجد کا پتا پوچھا تو وہ کھیل چھوڑ چھارز کرتا فلے کی صورت میں میرے ساتھ مجھے مسجد دکھانے چل پڑے۔ ان میں ایک تیرہ چودہ سال لڑکا بھی تھا جس نے مجھ سے پوچھا ”پاکستان“ یعنی پاکستان سے آئے ہو؟ میں نے کہا ہاں، پھر اس نے پوچھا ”مسلمان؟“ میں نے پھر ہاں میں جواب دیا اب اس نے ایک اور سوال کیا۔ ”حنفی؟“ میرے لئے یہ عجیب سوال تھا تاہم میں نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ اس پر اس نے خوش ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا ”الحمد للہ۔ الحمد للہ۔“ اس کے بعد ہم سب نے وضو کیا مگر جب میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو دیکھا کہ وہ سب جو وضو تک میرے ساتھ شریک تھے اب غائب ہو چکے ہیں۔ وہ بچہ بھی جس نے میرے صرف مسلمان ہونے کو کافی خیال نہیں کیا تھا بلکہ میرے حنفی ہونے کی تصدیق بھی چاہتی تھی۔

ایسا ہی ایک واقعہ ہالینڈ میں ایمسٹرڈیم میں پیش آیا بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ عجیب۔ وہاں ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے اس کا منیجر مصری تھا اور مسلمان بھی جب اسے معلوم ہوا کہ ہم بھی مسلمان ہیں تو بہت خوش ہوا اور ہمارے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی، سب سے دل چسپ ”سہولت“ وہ تھی جو اس نے اگلے روز ناشتے پر مہیا کی۔ ہم نے فرائی انڈوں اور توس کا آرڈر دیا تھا۔ اس نے ناشتے کے ساتھ ایک پلیٹ بھی پیش کی جس میں گوشت کے ٹکڑے بے ہوئے تھے۔ مجھے اس گوشت کی سرخ رنگت سے کچھ شبہ سا ہوا۔ اس سے پوچھا ”یہ بکرے کا گوشت ہے یا گائے کا؟“ جواب اس نے لہجے میں ممکن حد تک خلوص بھر کر کہا۔ ”یا خنی! یہ سور کا گوشت ہے جو میں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے خصوصی طور پر تیار کرایا۔“ اسی طرح جب میں امریکا میں تھا تو ایک روز رات گئے میرا ایک دوست میرے فلیٹ پر آیا جہاں میں سو رہا تھا، دوستک پر اٹھا تو دیکھا اس کی بغل میں ایک امریکی لڑکی ہے۔ دونوں کے منہ سے شراب کے بھلے اٹھ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا ”خیریت تو ہے؟ اتنی رات گئے کیوں جگایا؟“ اس پر اس دوست نے لڑکھاتی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہ بھوک سے بے حال ہو رہا ہے مگر کہیں کھانا نہیں کھا سکتا۔ اس لئے کہ اس بات کا اعتبار نہیں کہ وہاں ذبیحہ ملتا ہوگا۔ اپنی داستان غم سنا کر اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر مجھے ایسے کسی ریستوران کا علم ہو جہاں حلال گوشت ملتا ہو تو براہ کرم اس کا پتہ بتاؤں۔

میں جب ۱۹۷۱ء میں امریکا سے لوٹا تو میری لمبی لمبی قلمیں اور لمبے لمبے بال تھے اور میں نے جینز پہن رکھی تھی۔ ترکی میں مجھے ایک ترک نے اسی طرح پوچھا۔

”پاکستان؟“

میں نے کہا ”ہاں“ اس نے پھر پوچھا

”مسلمان؟“

میں نے پھر اثبات میں جواب دیا، اس پر اس نے زور زور سے سر ہلا کر کہا ”نہ نہ“ اور ساتھ ہی میرے حلیے کی طرف اشارہ کیا کہ مسلمانوں کا حلیہ ایسا ہوتا ہے؟ مجھے دل میں بہت ہنسی آئی اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں اور اپنے مسلمان ہونے کا کس طرح یقین دلاؤں کہ اچانک مجھے ایک ترک لڑکی نظر آئی جس نے ”نئی سکرٹ اور چھوٹا جاکٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ”مسلمان؟“ اس نے کہا ”ہاں“

میں نے اس کے لباس کی طرف اشارہ کر کے کہا ”نہ نہ“ کہ یہ بھی مسلمانوں والا لباس کہاں ہے، اس پر وہ ترک بہت ہنس۔ آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بولا ”مسلمان کا روش کاروش“ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مجھے ایسے کئی تجربات ہوتے رہتے ہیں۔

انڈونیشیا کے دورے سے واپسی پر ہم سنگاپور میں ٹھہرے، یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ ہمارے ایک شہر کراچی جتنا بڑا تاہم صاف ستھرا اور خوشحال ہے۔ اس کی ترقی انسان کو بہت متاثر کرتی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی چند سال پہلے تک یہ ہم سے بہت پیچھے تھا۔ جبکہ اب یہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ اس ترقی کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ان میں ایک تو تعلیم ہے دوسری قیادت مخلص ہے مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مذہب سیاست سے بالکل جدا اور الگ ہے۔ اسے دو سیکولر علمی فضا حاصل ہے جو علوم و فنون کی پرورش اور ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے یہی اس کی ترقی کا راز ہے۔

سیاحت کے اس تذکرے کے بعد میں واپس زندگی کے شب و روز کی طرف آتا ہوں۔ میں نے جیسا کہ بتایا کہ امریکا سے آنے کے بعد میں نے بیچنگ اختیار کی اور نو اے وقت کی کالم نگاری بھی چلاتی رہی۔ یہ سلسلہ تب تک چلتا رہا جب تک میں تاروے میں بطور سفیر کے نہیں گیا اور جب میں پرویز مشرف صاحب کے آنے پر تاروے سے واپس آیا تو حکومت نے مجھے آٹھ ماہ تک جوائننگ نہیں دی۔ میں او ایس ڈی کے طور پر رہا۔ پھر FC کالج میں میری پوسٹنگ ہوئی۔ وہاں میرا خیال ہے میں نے ایک سال کام کیا۔ اس کے بعد میں نے Pre

Mature ریٹائرمنٹ لے لی۔ ایک واقعہ اس کا سبب بنا تھا وہ یہ کہ میں نجی دورے پر امریکا جا رہا تھا اس کے لئے بطور سرکاری ملازم مجھے N.O.C چاہئے تھا اور ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے چھٹیاں بھی چاہئے تھیں۔ اس وقت وزیر تعلیم اختر سعید صاحب تھے۔ وہ میرے بڑے پرانے دوست تھے۔ اب سرکاری کارروائی کے طور پر بہت نقل خرابی ہوتا تھی۔ باقاعدہ فائل بنی تھی۔ انہوں نے مہربانی یہ کی کہ کہا یہ فارمیٹ میں خود ہی کراؤں گا انہوں نے ایک متعلقہ آفیسر کی ڈیوٹی لگا دی۔ اس کا ایک دن مجھے فون آیا کہ قاضی صاحب باقی تو سارا کام ہو گیا ہے لیکن آپ کا N.O.C ضرور چاہئے۔ میں حیران تھا کہ مجھے N.O.C کی کبھی ضرورت نہیں پڑی مگر تازہ واقعات کے نتیجے میں اس کی مجھے ضرورت پڑ رہی تھی۔ یاد رہے یہ ۹/۱۱ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ایجوکیشن سیکرٹری کے ساتھ بات ہو گئی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ سب کچھ تیار پڑا ہے۔ N.O.C آجائے گا تو تیس بیرون ملک چھٹی Sign کر دوں گا۔ مجھے معلوم ہوا کہ N.O.C پر ایک ایس پی sign نہیں کر رہا اور وہ کہہ رہا ہے کہ میرا نام ECL میں شامل ہے۔ میں نے سوچا میں ایس پی کے پاس جانے سے پہلے بتاؤ کرلوں کہ ECL میں میرا نام ہے بھی کہ نہیں۔ میں نے اسلام آباد فون کیا۔ اس وقت خوش قسمتی سے میرے یونیورسٹی فیلو تسلیم نورانی صاحب وہاں لگے ہوئے تھے۔ وہ سیکرٹری داخلہ تھے۔ وہ مجھے فون پر نہ ملے کہیں گئے ہوئے تھے۔ ایڈیشنل سیکرٹری مجھے مل گیا۔ ان کو میں نے کہا کہ یہ میرا مسئلہ ہے اور میں یہ جانا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ آپ پانچ منٹ بعد فون کر لیں۔ میں نے دوبارہ فون کیا تو کہنے لگے نہیں آپ کا نام ECL میں شامل نہیں ہے۔ میں نے کہا پھر آپ مہربانی کریں، فیکس میرے گھر میں لگی ہے، میں ہوں تو اپنے گھر سے باہر ہی لیکن آپ فیکس کر دیں کہ میرا نام اس لسٹ میں شامل نہیں ہے۔ انہوں نے فیکس کر دی۔ میں نے گھر فون کر کے فیکس آنے کی تصدیق کی۔ پھر میں متعلقہ ایس پی صاحب کے پاس گیا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے صاحب تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے میرے داخل ہونے کا نوٹس ہی نہ لیا۔ میں چند سیکنڈ کھڑا رہا۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہا۔ میں خود ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مجھے کہنے لگے کہ میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں بھی کام ہی کے حوالے سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ کہنے لگے آپ باہر نہیں جاسکتے آپ کا نام ECL میں شامل ہے۔ میں نے کہا میرا نام ECL میں شامل نہیں ہے۔ کہنے لگے میرے پاس Lates information ہے۔ میں نے کہا میرے پاس آپ سے بھی زیادہ lates

information ہے۔ ابھی یہ بات ہوئی رہی تھی کہ میرے موبائل فون کی کھنٹی بجی۔ میں نے فون دیکھا تو تسلیم نورانی صاحب ہی کا فون تھا۔ وہ کہنے لگے کہ تمہارا فون آیا تھا میں اس وقت موجود نہیں تھا۔ بتاؤ مسئلہ کیا تھا؟ میں نے بتایا کہ یہ مسئلہ اور اس وقت "دور بار" میں میں حاضری دے رہا ہوں۔ کہنے لگے میری بات کراؤ۔ خدا جانے انہوں نے ان سے کیا بات کی۔ ساتھ ہی ایس پی صاحب نے بل دی تو چپے اسی اندر آیا۔ اس کو انہوں نے دو چار سنائیں اور پھر کہا کہ تمہیں چنانچہ کتنی بڑی شخصیت اس وقت میرے پاس بیٹھی ہے۔ بد بخت بھٹہ کہے چائے نہیں لے کر آتے ہیں۔ وہ بھاگ کر گیا اور چائے لے آیا۔ انہوں نے اسے پھر اچھی خاصی سنائیں اور کہا اے بیوقوف خالی چائے بسکٹ ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ چار پانچ بسکٹ پلیٹ میں لے آیا۔ انہوں نے اسے پھر سنائیں اور کہا بھائی اس طرح نہیں ہوتا۔ سلیقے کے ساتھ چائے پلاتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی دراز کھولی اس میں دو تین بسکٹوں کے پیکٹ تھے اور ان بسکٹوں کے ساتھ ہی میرا N.O.C تیار تھا۔ انہوں نے وہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کہنے لگے میں کسی دن گھر حاضر ہوں گا۔ میں نے کہا ضرور تشریف لائیں۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں نے اب گورنمنٹ سروس نہیں کرنی۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد میں نے کانٹنٹ سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

امریکا سے واپس آنے کے بعد پھر روٹین کی زندگی تھی۔ مجید نظامی صاحب کافی عرصے سے مجھے کہہ رہے تھے کہ آپ نل ٹائم کالسٹ کیوں نہیں بن جاتے۔ میں نے کہا جی ٹھیک ہے۔ انہوں نے مجھے اچھی معقول تنخواہ پر بطور کالسٹ رکھ لیا۔ اور میرا خیال ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک ایسی وجہ بنی جس کی تفصیلات میں جانا میں مناسب نہیں سمجھتا کہ مجھے "جنگ" جانا پڑ گیا۔ لیکن میں حتمی طور پر واضح کر دوں کہ میں ہرگز ہرگز پیسوں کی خاطر جنگ میں نہیں گیا تھا۔ اگر میں نے پیسوں کی خاطر جنگ میں جانا تھا تو ۲۵ برس پہلے جب نکلا تو ظلیل الرحمان صاحب کی آفر تھی کہ میں جنگ جوائن کر لوں اور اس وقت مجھے نو اے وقت سے بہت تھوڑے پیسے ملتے تھے اور وہ اس سے کئی گنا زیادہ آفر مجھے کر چکے تھے لیکن میں نہیں جانا چاہتا تھا اور اس دفعہ بھی میں نے نہیں جانا تھا لیکن اس بار میری انا کو انھیں پہنچی تھی اور میں جانے پر مجبور تھا۔ بات کی تفصیل اس لئے زبان پر نہیں لانا چاہتا کہ ادارے اور مجید نظامی صاحب کے ساتھ میری دلی وابستگی تھی اور ہے ابھی۔ اس کے علاوہ نظریاتی ہم آہنگی بہت زیادہ موجود ہے۔ اگر میں وہ بات بیان کروں تو یہ ایک طرح کی شکایت زبان پر لانے والی بات ہوگی جو کہ میں نہیں لانا چاہتا۔

اب کچھ "معاصر" کی بات ہو جائے۔ یہ میں ۷۹ء سے نکال رہا ہوں۔ معاصر ایک **literly** میگزین ہے۔ **Pure literly** اور سو فیصد نان کمرشل، بلکہ نان کمرشل بھی اس کے لئے **proper** لفظ نہیں ہے کیونکہ میں نے اگر ہزار پرچہ چھاپا ہے تو ہزار میں سے تین سو میں مارکیٹ میں دیتا ہوں اور سات سو میں مفت بھیجتا ہوں اور پوری دنیا کی لائبریریوں میں بھی بھیجتا ہوں۔ دراصل مجھے ادب سے عشق ہے چنانچہ یہ ادبی، جدید، معاصر، سماجی جو ۷۹ء سے نکل رہا ہے اور کم از کم ہر پرچے پر میرے تیس ہزار روپے جیب سے خرچ ہو جاتے ہیں۔ چالیس فی صد اس میں اشتہارات کی ادائیگی ہوتی ہے۔ ساٹھ فی صد کی ادائیگی نہیں ہوتی۔ جہاں تک معاصر کے ادبی مقام کا تعلق ہے تو آپ ادبی حلقوں سے پوچھیں وہ آپ کو بتائیں گے کہ ادبی پرچوں میں یہ کہاں اسٹینڈ کرتا ہے۔ یہ ایک سیکولر پرچہ ہے، البتہ اس میں، میں کوئی ایسی تحریر چھاپنے کے لئے تیار نہیں جو خواہ ادب کا کتنا ہی بڑا شاہکار ہو لیکن وہ پاکستان کے خلاف ہو، مزید یہ کہ بہت ساری چیزیں اس میں ایسی چھپی ہیں جن کے ساتھ مجھے اتفاق نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی نظم یا افسانہ پاکستان کے خلاف ہے تو وہاں میں "لبرل" نہیں ہو سکتا۔ میری اس سوچ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں بھارت دشمنی کو حب الوطنی خیال کرتا ہوں۔ البتہ مجھے تسلیم ہے کہ کسی زمانے میں، میں ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن اب میرا خیال یہی ہے کہ اختلافات کے ساتھ ساتھ بھارت کے ساتھ اچھے روابط ہونے چاہئیں اور اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک بنیادی مسئلہ موجود ہے اور جب تک وہ حل نہیں ہوتا تب تک اتنی یگانگت جس کا مظاہرہ اب کیا جا رہا ہے، مناسب نہیں ہے۔ یہ شادی سے پہلے بنی مون منانے والی بات ہے اور یہ رویہ غیرت و حیثیت کے خلاف ہے۔ دیکھیں نا جس طرح ہم دوستوں کے درمیان ہوتا ہے کہ اگر ہمیں دوسرے کی ذرا سی بھی بات بری لگے تو ہم ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، گفتگو چھوڑ دیتے ہیں لیکن بھارت کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ہم اس سے جنگیں لڑ چکے ہیں اور صورت حال یہ ہو کہ کشمیری اپنی عصمتوں، اپنی جانوں کی قربانیاں دے رہے ہیں اور بے پناہ دکھوں میں سے گزر رہے ہوں اور جہاں سات لاکھ انڈین فوجی بیٹھے ہوں اور کسی زمانے میں ان کشمیریوں کو ابھارنے والے بھی ہم ہوں، بھڑکانے والے بھی ہم خود ہی ہوں اور بعد میں ہم پیچھے ہٹ جائیں اور دوستی دوستی کا نعرہ لگانا شروع کر دیں تو میں اس چیز کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ اس دوستی میں کسی کے ساتھ بے وفائی شامل ہے۔

میں جب غالباً تھائی لینڈ میں تھا وہاں میری چینی سفیر سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے

یہ اچھی بات کہی تھی کہ تم لوگ مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھو مگر ساتھ ہی تعلقات کو کشیدہ نہ کرو۔ یہاں تک تو میں اس بات کا قائل ہوں کہ کشمیر کی اہمیت کو ہم اجاگر کرتے رہیں۔ کشمیر کے مسئلے کو ٹھنڈا نہ کریں، لیکن ساتھ ساتھ یہ جو ہم نے ناروا پابندیاں لگائی تھیں کہ طویل عرصے سے کتابیں نہیں آرہیں، رسالے نہیں، ادیب اور دانشور نہیں آجاسکتے، جن کے رشتے دار ہیں دونوں طرف، وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کو ترستے ہیں یہ ایک **Abnormal situation** تھی۔ اس حوالے سے **Normalization** کی ضرورت تھی، یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن آج یہ ہو رہا ہے کہ وہ اوجھڑاتے ہیں اور آکر لاہور میں ایک ڈرامہ سٹیج کرتے ہیں اور اس ڈرامے میں پاکستان کے خلاف بکواس کرتے ہیں۔ یہ بھلا دوستی کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس ڈرامے کا راکٹر اتنا معقول آدمی تھا کہ اس نے ڈرامہ سٹیج کرنے سے پہلے کہا کہ جناب اس ڈرامے میں یہ چیزیں موجود ہیں یہ ہمارے انڈین ناظرین کے لئے تھا اگر آپ کہیں تو ہم یہ نکال دیتے ہیں مگر ہمارے منتظمین نے کہا: نہیں نہیں، ہم بڑے لبرل لوگ ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں اس کے نکالنے کی۔ میرے خیال میں یہ لبرل ازم نہیں بے غیرتی ہے۔ اسی طرح ہمارے کچھ بے غیرت **Normalization** کے چکر میں وہاں جا کر پاکستان کے خلاف بکواس کرتے ہیں۔ یہ چیزیں میرے نزدیک "over" ہے۔ میری بات کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنے قومی مفاد اور قومی غیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حالات کو **normalize** کرنا چاہئے اور اسی کو میں حب الوطنی سمجھتا ہوں اور یہی حب الوطنی، معاصر کا رہنما اصول ہے۔ اس کے علاوہ یہ پرچہ سو فی صد سیکولر ہے۔ اب ڈرامہ میری صحافیانہ یادوں کا ذکر ہو جائے۔ پاکستان کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ہم صحافت کو مکمل طور پر آزاد کہہ سکتے ہوں۔ پہلا دور میں نے دیکھا ایوب صاحب کا، دوسرا دور میں نے دیکھا بھٹو صاحب کا پھر ضیاء الحق صاحب کا دور آیا اس کے بعد بے نظیر نواز شریف، دو دفعہ برسر اقتدار رہے۔ اور آج کل ماشاء اللہ جنرل صاحب کا دور دیکھ رہا ہوں۔ بظاہر کوئی دور ایسا نہیں جب یہ نہ کہا گیا ہو کہ لکھنے کی مکمل آزادی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مکمل آزادی دنیا میں کہیں بھی نہیں اس میں سب سے زیادہ جو پریشور ہوتا ہے وہ خود اخبار کے مالکان کا ہوتا ہے۔ اخبار کے مالکان کی بھی مجبوری ہوتی ہے۔ ایک حد تک ان کو **Advice** بھی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے اشتہاروں کے بل **Clear** کروانا ہوتے ہیں۔ ہمارے لکھنے والوں کا یہ معاملہ ہے کہ کھلم کھلا اپنا اظہار خیال کرتے ہیں۔ دراصل ہمارا اور مالکان کا معاملہ تو وہ گانے والا معاملہ ہوتا ہے کہ تمہاری دو

نکیا کی نوکری اور میرا لکھوں کا سامان جائے! چنانچہ اس میں قطع و برید ہر دور میں ہوتی رہی ہے اور پھر یہ دیکھ کر لکھنے والا خود بھی سمجھ جاتا ہے۔ یوں پچاس فی صد کچ بولا جاتا ہے۔

میں ۷۰ء سے لے کر ۷۷ء تک مسلسل بھٹو حکومت کے خلاف لکھتا رہا ہوں، لیکن سچی بات پوچھیں تو مجھے آج افسوس ہے کہ اتنا خلاف کیوں لکھا۔ اگر مجھے اس وقت شعور ہو جاتا کہ کچھ طاقتیں ذوالفقار علی بھٹو کو اس کے غلط کاموں کی سزا نہیں دے رہیں بلکہ اس کے اچھے کاموں کی سزا دے رہی ہیں تو میں ایک لفظ بھی خلاف نہ لکھتا بلکہ میں ان کی حمایت میں سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا لیکن اس وقت مخالف لوگ جذباتی ہو چکے تھے اور تحریک نظام مصطفیٰ کو ہم نے یہ سمجھا کہ شاید یہ ظلم اور جبر کے خلاف ایک تحریک ہے کیونکہ جب یہ سنتے کہ سلیمان ایم این اے کی بیٹی العوا ہو گئی ہے یا میاں طفیل محمد پر تشدد ہو رہا ہے تو میرا خون کھولتا تھا۔ یہ ہمیں چاہیے تھا کہ تحریک نظام مصطفیٰ کے پیچھے سی آئی اے ہے۔ اگر اس وقت اس بات کا شعور ہوتا تو میں جس مزاج کا آدمی ہوں اور جس حریت پرور خاندان کے ساتھ میرا تعلق ہے۔ میں کبھی بھی یہ کام نہ کرتا۔ خیر، اس دور میں وقار انباری صاحب نے مجھے ایک دن بلایا اور مجھے کہنے لگے کہ آپ نے... نہیں، بلکہ مجھے وہ تم کہا کرتے تھے، ہم بھی با بے (وقار انبالی) کو "تم" کہا کرتے تھے۔ بہت بے تکلفی ہوتی تھی۔ کہنے لگے تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔ میں نے پوچھا کس کا؟ کہنے لگے FSF کے سربراہ مسعود محمود کا۔ میں نے کہا: کیا پیغام ہے؟ کہنے لگے اس کا پیغام مختصر ہے اور یہ ہے کہ اسے کہہ دینا کہ زندگی خوبصورت ہے اور تم ابھی نو جوان ہو۔ سیدھی قتل کی دھمکی دی تھی۔ اس وقت میں بالکل جوان تھا۔ بہت گرم خون تھا میرا۔ میں نے جواب میں اسے گالیاں دیں اور کہا: وقار صاحب، جس طرح آپ نے یہ پیغام پہنچایا ہے؟ اسی طرح میرا پیغام بھی پہنچانا ہے، اسی زبان میں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سترہ دنوں کے بعد حکومت ختم ہو گئی ورنہ اس وقت میں یہ کہانی نہ سن رہا ہوتا۔

بھٹو صاحب کے دور کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے اور یہ واقعہ ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد پیش آیا۔ اسلام آباد میں ہوٹل میں کانفرنس تھی۔ وہاں مجھے ایک لمبا سا آدمی ملا۔ گہرا سانواں رنگ، سر پر ٹوپی اور سوٹ پہنا ہوا۔ میرے پاس آیا اور کہنے لگا: آپ نے مجھے پہچانا؟ میں آدمی

انٹیلی جنس میں سمجھتا تھا۔ میں نے کہا اچھا! مجھے آپ کے اس تعارف کا معلوم نہ تھا۔ کہنے لگا: میرے پاس آپ کا ایک عالم آیا تھا۔ اس کا عنوان تھا "ہیرو، کامیڈین اور ولن"۔ مجھے اس پر ریا کر س دینے کے لئے کہا گیا۔ میں نے اس پر لکھا کہ اس پر کارروائی کرنا "آئیل مجھے مار" کے مترادف ہوگا۔

یہ کالم میں نے قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران لکھا تھا اور بہت خوفناک کالم تھا۔ بھٹو صاحب پر تھا اور میں نے اس میں لکھا تھا کہ اداکار اسلم پرویز پہلے فلموں میں بطور ہیرو آتا تھا۔ لوگوں نے اسے ہیرو کے طور پر Reject کر دیا پھر اس نے ہلکے پھلکے کامیڈی کے کردار ادا کئے۔ لوگوں نے پھر بھی اسے قبول نہ کیا اور آج کل وہ فلموں میں بطور ولن آ رہا ہے۔ قتل عام کر رہا ہے، یہ کر رہا ہے، وہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ملک میں ہو رہا تھا، وہ میں نے سارا بیان کر دیا۔ نظام صاحب نے مزید احتیاط کی اور اس پر اسلم پرویز کی تصویر بھی لگا دی اور کوٹے پر لکھا دیا "قلمی دنیا" لیکن یہ محض ایک کارروائی تھی۔ اس زمانے میں لوگوں کے شعور کا یہ عالم تھا کہ جب کالم چھپا اور میں صبح باہر نکلا تو ہماری گلی میں ریڑھی پر تر بوز لگانے والا کہنے لگا: "قلمی صاحب! آج تو بھٹو صاحب کی خوب خبر لی ہے۔" میں نے کہا خدا سے ڈر رہائی وہ تو اسلم پرویز کے بارے میں تھا۔ کہنے لگا: "رہنے دیں، مجھے پتا ہے سب کچھ۔" اسلم پرویز کے ساتھ ملا تو بڑی گرمجوشی سے گلے ملا۔ میں نے کہا آپ ناراض تو نہیں؟ کہنے لگا میرے بارے میں ہوتا تو میں ناراض ہوتا۔

اس کے بعد ضیاء صاحب کا دور آیا۔ ضیاء صاحب کو میں نے ایک دن کے لئے بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ چنانچہ ۷۷ء میں وہ آئے تھے اور میرے کالم On the record موجود ہیں۔ ۷۹ء میں جب قومی اتحاد کی حکومت بنی تو جنرل صاحب نے آدمی ہاؤس راولپنڈی میں ایک افطار رُونڈ دیا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا۔ اس میں میرا خیال ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو آدمی ہوں گے۔ میں ضیاء جالندھری کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ضیاء جالندھری اس وقت ٹی وی کے ایم ڈی تھے۔ جنرل صاحب وردی میں داخل ہوئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اچانک ان کی نظر اس طرف پڑی جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ باقی سارے آدمی چھوڑ کر سیدھا میرے پاس آ گئے۔ میں سمجھا شاید ضیاء جالندھری صاحب کو ملنا چاہتے ہیں لیکن پھر مجھے اپنے خیال پر ہنسی آئی کہ ضیاء صاحب کی تو حیثیت ہی کوئی نہیں۔ یہ تو ایم ڈی ہیں اور وہ ایک چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر۔ پھر میں نے دیکھا کہ جنرل صاحب مسکراتے ہوئے میری طرف آ رہے ہیں تو میں نے آگے بڑھ

کر ہاتھ ملایا۔ انہوں نے ہاتھ ملانے کے بجائے معاف کر لیا اور ساتھ ہی جملہ چست کیا کہ قاضی صاحب، تصویر میں تو آپ ماشاء اللہ بڑے جوان نظر آتے ہیں۔ میں ہنس پڑا۔ میرے کندھے تھپتھا کر کہنے لگے کہ دل چھوٹا نہ کریں آپ ماشاء اللہ ویسے بھی جوان ہیں۔ ابھی میں کچھ کہنے کو سوچ ہی رہا تھا کہ ساتھ ہی انہوں نے اگلا جملہ کہا: قاضی صاحب، وہ آپ کا اسلام کیا ہوا؟ وہ آپ کا پاکستان کیا ہوا؟ مجھے سمجھ نہ آئی کہ ضیاء صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اگلے ہی لمحے خدا کا شکر ہے کہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ بھٹو کے تو تم اسلام اور پاکستان کی وجوہ کی بناء پر خلاف تھے اور میں اب محافظ اور محافظ پاکستان آ گیا ہوں اور تم میرے بھی اسی طرح خلاف ہو۔ میں نے کہا سر میں نے ماضی میں جو کچھ بھی لکھا اپنے خدا اور ضمیر کو حاضر و ناظر جان کر لکھا اور آئندہ بھی جو لکھوں گا وہ خدا اور ضمیر کو حاضر و ناظر جان کر لکھوں گا۔ ساتھ ہی مجھے کہنے لگے کہ آپ کھانا کھا کر جائیے گا نہیں، آپ سے باتیں کریں گے۔ جب سب لوگ چلے گئے تو ہم لان میں بیٹھ گئے۔ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ساتھ صدیق سالک مرحوم اور اس کے بروہی صاحب تھے، جنرل صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور لان میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ مختلف امور پر باتیں کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کوئی ۲۵ منٹ ہم نے لان میں چہل قدمی کی ہوگی۔ پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ قاضی صاحب میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ میں نے کہا: جی ایک ہے۔ دراصل ان دنوں میرے عزیز دوست سراج منیر کے والد مولانا متین ہاشمی کو دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ریسرچ سیل بند کر کے فارغ کر دیا گیا تھا۔ میں نے کہا لائبریری میں ایک ریسرچ سیل قائم تھا، علمی کام کر رہا تھا، آپ کی حکومت نے اسے بند کر دیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے بحال کر دیں۔ انہوں نے سالک صاحب کو بلایا اور کہا: ”سالک! یہ فوری کردہ اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے اس کی اطلاع دو۔“ چنانچہ جب ہم لاہور پہنچے تو مولانا متین ہاشمی کو وہ گھر سے آ کر لے گئے اور وہاں دوبارہ بٹھا دیا۔ میں نے بعد میں شکر یہ ادا کیا تو کہنے لگے آپ اور خدمت بتائیں۔ میں نے کہا میں نے بتا بھی دی اور آپ نے وہ کام کر بھی دیا۔ جواب میں بولے، نہ نہ، آپ نے میرے گناہوں میں کمی اور ایک نیکی میرے نامہ اعمال میں درج کی۔ اس کے لئے اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ مجھے کوئی خدمت بتائیں! میں نے پھر وہی جواب دیا اور جب انہوں نے تیسری دفعہ خدمت کا کہا اور میری طرف سے جب وہی جواب ملا تو وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً وہ سمجھ گئے کہ یہ ”پرندہ“ دانہ و دام کے چکر میں آنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ میں نے پوری زندگی کوئی سرکاری پلاٹ نہیں لیا۔ میں نے آدھی زندگی کرایے کے گھر میں گزار دی۔ باقی زندگی میں نے نو مرلے ۸۰ فٹ کے ایک گھر میں گزار دی اور اب جا کر مجھے ریٹائرمنٹ کے پیسے ملے اور ناروے سے جو کچھ بچت ہوئی اس سے ایک گھر بنایا ہے۔ حکومت سے نہ کوئی پلاٹ لیا، نہ کوئی مراعات، کچھ نہیں **Never in my life** لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ نے زندگی میں بڑی محنت کی ہے، بہت کام کیا ہے جس کے صلے میں اللہ نے آپ کو یہ سب کچھ دیا لیکن میں پوری دیانتداری سے محسوس کرتا ہوں کہ میں نے زندگی میں نہ کوئی ایسی محنت کی ہے اور نہ ایسی کامیابی حاصل کی اور یہ میں بوجہ انکسار نہیں کہہ رہا بلکہ امر واقعہ ہی یہی ہے۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے بڑی محنت کی ہے تو مجھے خیال آتا ہے کہ کہنے والے کا اشارہ ان حالات کی طرف ہوگا جب میں نوائے وقت میں سب ایڈیٹر تھا۔ سنڈے ایڈیشن اور دوسرے صفحات کے ایڈیشن میں نے جڑوانے ہوتے تھے۔ اس مقصد کے لئے میں ساری ساری رات جیٹو سر اور دوسرے عملے کے ساتھ کام کرتا اور جب میں تھک جاتا تو جس میز پر کاپی جڑواتا تھا اسی پر سو جاتا تھا اور کئی دفعہ صبح چار بجے شدید سردی میں، میں موٹر سائیکل پر ماڈل ٹاؤن اپنے گھر آتا تھا یا ان کا اشارہ اس محنت کی طرف ہو سکتا ہے جب میں نے کوئی کتاب لکھی تھی یا ساری ساری رات جاگ کر ڈرامے لکھے۔ لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ محنت تھی تو پھر یہ مجھے محسوس کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی وہ یہ کہ یہ سارے کام میری مرضی کے تھے۔ ان میں سے کوئی کام ایسا نہیں تھا جو مجھے ناگوار تھا، مجھ پر بوجھ تھا۔ میری سب سے بڑی خوش قسمتی یہی ہے کہ اگر میں پڑھتا رہا ہوں تو یہ بھی میرا شوق تھا۔ مجھے پڑھانے میں لطف آتا تھا۔ اگر میں کالم لکھتا ہوں تو مجھے کالم لکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اگر میں نے سفر نامہ لکھا ہے تو مجھے اس میں بھی لذت ملی ہے۔ ڈرامہ لکھنے بیٹھا تو اس میں گم ہو جاتا تھا۔ میں نے ان میں سے کوئی کام بھی چونکہ ڈیوٹی سمجھ کر نہیں کیا، اس لئے مجھے لگتا ہے کہ میں نے ساری عمر کچھ بھی نہیں کیا۔ کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کیا، اس کے لئے میں نے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ **Never in my life** میرا شدید احساس ہے کہ کوئی فیسی ہاتھ ہے جو میرے راستے کے کانٹے صاف کر دیتا ہے اور میرے لئے راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں جب میٹرک میں پڑھتا تھا تو اس وقت **Math** لازمی تھا اور میں اگر ساری عمر بھی لگا رہتا تو میں اس **Math** کی وجہ سے میٹرک پاس نہیں کر سکتا تھا۔ اب ہوا یہ کہ ایوب خان کی حکومت تھی،

مقررہ تعلیم نے ایک سال کے لئے Math کو اختیار کر دیا اور یوں میں میٹرک پاس کر گیا۔ اسی طرح میرا تعلیمی ریکارڈ کوئی اتنا اچھا نہیں تھا۔ میٹرک میں میری سیکنڈ کلاس، ایف اے میں غالباً تھرڈ کلاس، بی اے میں پھر سیکنڈ کلاس اور ایم اے بھی سیکنڈ کلاس نمبروں سے پاس کیا۔ میں اگر کالج کی نوکری کے لئے پبلک سروس کمیشن کے سامنے جاتا تو میں کبھی بھی ٹیکچرار کے لئے Select نہ ہو سکتا تھا۔ اب ہوا یہ کہ میں ایم اے اور کالج میں بطور ٹیکچرار گیا جو کہ ایک پرائیویٹ کالج تھا اور اس کی تفصیل میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی حکومت نے سارے کالج Nationalize کر دیئے اور یوں میں پبلک سروس کمیشن میں Appear ہوئے بغیر گورنمنٹ سرونٹ بن گیا۔ اسی طرح میں نے زندگی میں جو بھی ملازمتیں کیں، مجھے جو بھی کام ملے، چاہے کالم نگاری ہو یا ڈرامہ نگاری، ان میں سے کسی کے لئے میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ خود بخود راستے میرے لئے ہمارے ہوتے گئے اور میں یہ کام کرتا گیا۔ حتیٰ کہ جب مجھے ناروے میں سفیر مقرر کیا گیا تو اس میں بھی نہ میری کوئی خواہش تھی اور نہ میری کوئی پلاننگ۔ ہوا اس طرح کہ جب بے نظیر دور میں میاں نواز شریف صاحب اپوزیشن لیڈر تھے اور میں چونکہ شروع ہی سے اپوزیشن مائنڈ ڈر رہا ہوں، ایوب خان کے دور میں ایوب کی حکومت کے خلاف تھا۔ بھٹو کے دور میں بھٹو کی حکومت کا ناقد تھا۔ ضیاء الحق کے دور میں اس کی حکومت کے خلاف تھا۔ بے نظیر کی حکومت میں بے نظیر پر تنقید کی۔ اب جب نواز شریف صاحب اپوزیشن میں آئے تو میں اُس وقت اپوزیشن کا ساتھی تھا اور میں نے بہت کھل کر اپوزیشن کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جب بے نظیر کی حکومت ختم ہوئی اور دوبارہ الیکشن ہوئے اور اس کے رزلٹ آنا شروع ہوئے تو میں جس جماعت کو سپورٹ کر رہا تھا وہ جیت رہی تھی اور اس کی کامیابی کی خبریں سن کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی اور میرا دل چاہا کہ جس طرح ساری دنیا اس وقت ماڈل ٹاؤن چننی ہوئی ہے اور لوگ میاں نواز شریف کے ساتھ بیٹھ کر رزلٹ دیکھ رہے ہیں اور مبارک بادیں دے رہے ہیں، میں بھی جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ مناسب نہیں۔ اگلے دن الیکشن جیتنے پر تمام لوگ ماڈل ٹاؤن مبارک باد دینے جا رہے تھے۔ ایک بہت بڑا اجتماع نواز شریف صاحب کی کونٹری کے باہر تھا اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے ہمیشہ ان کی مخالفت کی تھی اور الیکشن میں بھی ان کے مخالف رہے تھے مگر میں مبارک باد دینے کے لئے نہ گیا۔ اس کے بعد جب میاں نواز شریف صاحب وزیراعظم بنے تو تقریب حلف و فاداری ہوئی۔ اس کا مجھے دعوت نامہ آیا لیکن میں اس میں بھی شامل نہ ہوا۔ اس کے کوئی ایک دو ہفتے بعد کی بات

ہے کہ میں شام کو گھر آیا تو میری خالہ ساس جو کہ راولپنڈی رہتی ہیں اور اس وقت لاہور آئی ہوئی تھیں، کہنے لگیں کہ بیٹے، میاں نواز شریف صاحب کا فون آیا تھا۔ میں نے کہا کس طرح فون آیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ جب میں نے فون اٹھایا تو بولنے والا کہہ رہا تھا کہ میں نواز شریف بول رہا ہوں۔ میں نے کہا، نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ جب وزیراعظم فون کرتا ہے تو پہلے چار پانچ سیکرٹری بات کرتے ہیں اور لائن Clear کر دیتے ہیں، بڑا لمبا چوڑا چکر ہوتا ہے۔ ابھی یہ بات ہوئی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو بالکل ویسے ہی کہا گیا کہ میں نواز شریف بول رہا ہوں اور قاضی صاحب سے بات کرنی ہے۔ میں نے کہا، میں عطاء الحق قاضی بول رہا ہوں۔ میاں صاحب ہنس کر کہنے لگے کہ قاضی صاحب میں نے سوچا کہ آپ مصروف آدمی ہیں، لہذا میں ہی آپ کو مبارک باد دے دوں۔ میں نے کہا میاں صاحب، آپ کا کیا خیال ہے، مجھے آپ کی کامیابی کی خوشی نہیں ہوئی؟ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے لیکن میرے اظہار کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ کہنے لگے کہ قاضی صاحب آپ کل مجھے کچھ وقت دے سکتے ہیں؟ میں ہنس پڑا اور کہا کہ میاں صاحب وقت تو اب آپ دیا کریں گے۔ آپ وزیراعظم ہیں۔ کہنے لگے نہیں آپ بتائیں کہ کل کس وقت آ سکتے ہیں؟ میں بولا: میاں صاحب آپ اس تکلف میں نہ پڑیں، آپ اپنا شیڈول دیکھ کر مجھے بتائیں کہ میں کس وقت آؤں۔ کہنے لگے کل گیارہ بجے آ جاؤ۔ میں وقت کے مطابق پہنچ گیا۔ اُس وقت بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ میاں صاحب مجھے بڑے تپاق سے ملے اور پھر سب کے سامنے وہی جملہ دہرایا جو انہوں نے فون پر کہا تھا کہ قاضی صاحب بڑے مصروف آدمی ہیں، میں نے سوچا خود ہی ان کو مبارک باد دے دیں۔ اس کے بعد مجھے ایک صوفے پر لے کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے کہ قاضی صاحب میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ذمہ داریوں میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ میں نے کہا میاں صاحب، آپ کو یاد ہوگا جب جنکارتہ میں غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس ہوئی اور جہاز میں، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے مجھے اپنے کیمین میں بلا کر یہی بات کہی تھی اور میں نے کہا تھا کہ میں نے پہلے ہی بہت ساری ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی ہیں اور مزید ذمہ داری سنبھالنے کی میں خواہش نہیں رکھتا۔ میاں صاحب کہنے لگے، میں اس وقت آپ کی باتوں میں آ گیا تھا، اس دفعہ میں نہیں آؤں گا۔ بتائیں آپ کی خدمات کس شعبے کے سپرد کی جائیں۔ میں نے کہا: میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اصرار کیا۔ میں نے بتایا کہ میرا یقین کریں میں بالکل خالی الذہن ہوں۔ میں نے کبھی ایسی بات سوچی ہوئی تو آپ کو بتاتا۔ میں نے تو کبھی اس بارے میں سوچا ہی

نہیں۔ کہنے لگے، ساتھ والے کمرے میں میری مینٹنگ ہے، میں مینٹنگ میں جا رہا ہوں اور پندرہ منٹ بعد میں واپس آؤں گا۔ آپ یہیں تشریف رکھیں اور سوچ کر رکھیں۔ وہ واپس آئے تو میرا ذہن اسی طرح خالی تھا۔ میں نے کہا میاں صاحب، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تب مجھے کہنے لگے آپ پی ٹی وی کا چیئرمین بننا پسند کریں گے؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا: یہ تو زراہارت ایک ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومت کو گارہتا ہے کہ ہماری کوریج نہیں ہو رہی۔ کہنے لگے، پھر آپ کچھ تو بتائیں، اندرون ملک یا بیرون ملک۔ جب انہوں نے بیرون ملک کہا تو میرے اندر کا سیاح جاگ اٹھا۔ میں نے کہا چلیں بیرون ملک ٹھیک ہے۔ کہنے لگے کہاں؟ میں ناروے اکثر جایا کرتا تھا۔ یہ ملک مجھے پسند تھا۔ میں نے کہا: ناروے۔ انہوں نے اسی وقت آرڈر کر دیا۔ یہ سارا کچھ مجبوری کے عالم میں ہوا یعنی اس میں میری خواہش کو کوئی دخل نہیں تھا۔ جب میں باہر نکلا تو میرے اندر شدید کشمکش ہو رہی تھی کہ میں نے یہ بات بھی کیوں مان لی۔ جب میں گھر گیا اور بتایا کہ اس طرح مجھے ناروے میں سفیر لگا رہے ہیں تو گھر میں بھی رونا دھونا شروع ہو گیا۔ گھر والوں نے کہا کہ باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم اپنے ملک ہی میں ٹھیک ہیں۔ اب مجھے سپورٹ مل گئی کیونکہ میں بھی اندر سے یہی چاہتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے دوست تسلیم نورانی سے مشورہ کروں۔ وہ اس وقت پنجاب کے ایجوکیشن سیکرٹری تھے۔ چنانچہ میں نورانی صاحب کے پاس گیا اور بتایا کہ مجھے یہ پیشکش کی گئی ہے۔ بتائیں کہ مجھے قبول کرنی چاہئے کہ نہیں؟ نورانی صاحب نے کہا میرے خیال میں آپ کو یہ قبول نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے کچھ وجوہات بتائیں۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ کے دلائل اور رائے سے پورا اتفاق ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اب پڑھنا پڑھا کر تنگ آ چکا ہوں اور اپنا کچھ ادبی کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ مجھے پنجاب میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں کسی کونے میں بٹھا دیں۔ جہاں ایک کرسی، میز اور ٹیلی فون ہو۔ جہاں بیٹھ کر میں کچھ عرصے کے لئے پڑھانے کے بجائے لکھنے پڑھنے کے کام کروں۔ کہنے لگے بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے اسی وقت میرے لئے ڈائریکٹر چلڈرن کپلیکس کے آرڈر کر دیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ بھابھی اب بھی پڑھاتی ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ تو کہنے لگے بھابھی کے نام پر میں ایک مکان بھی الاٹ کر دیتا ہوں۔ ایجوکیشن والوں کے پاس بہت سے گھر ہیں۔ انہوں نے قدانی سٹیڈیم کے پاس ۶ کنال کا گھر بھی الاٹ کر دیا۔ میں اس بندوبست پر بہت خوش ہوا۔ اس دوران میں گھر آیا

اور بتایا کہ میں سفارت کی پیشکش سے انکار کرنے لگا ہوں اور اس کے بجائے یہ ہو گیا ہے جو میری مرضی کے مطابق ہے۔ گھر والے بھی بڑے خوش تھے۔ میں گھر سے باہر کسی کام کے لئے نکلا تو مجھے راستے میں مجیب الرحمن شامی صاحب مل گئے۔ شامی صاحب کو میں نے ساری بات بتائی۔ کہنے لگے: آئیں کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ جب ہم بات کرنے لگے تو انہوں نے کہا کہ آپ اپنی زندگی کا بہت لحاظ فیصلہ کر رہے ہیں۔ آپ کو یہ نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے بڑے زبردست دلائل دیئے کہ آپ کو کیوں جوائن کرنا چاہیے۔ میں پھر کنفیوز ہو گیا۔ میں گھر آیا اور بتایا کہ شامی صاحب یہ کہہ رہے تھے۔ میری بیوی کہنے لگی کہ میں شامی صاحب سے متفق نہیں ہوں۔ میرا خیال یہی ہے کہ نورانی صاحب نے جو کہا، وہی ٹھیک ہے۔ میں نے کہا: اب میں یوں کرتا ہوں کہ مجید نظامی صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ وہ میرے بڑے محترم ہیں۔ میں ان سے مشورہ نہیں لیتا بلکہ ان کا فیصلہ سن لیتا ہوں۔ جو وہ کہیں گے، میں وہی کر لوں گا۔ چنانچہ میں نے نظامی صاحب سے وقت لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی اور کہا کہ میں آپ سے مشورہ طلب کرنے نہیں بلکہ آپ کا فیصلہ سننے آیا ہوں۔ اب بتائیں میں بطور سفیر جوائن کروں یہ نہ کروں؟ نظامی صاحب نے کہا: آپ جوائن نہ کریں۔ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے، میں ابھی میاں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔ میں نے فون اپنی طرف کیا اور ابھی تین نمبر ہی ڈائل کئے تھے کہ پتا نہیں نظامی صاحب کے ذہن میں کیا بات آئی، انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہنے لگے، ابھی رگ جائیں۔ میں رک گیا۔ غالباً نظامی صاحب فیصلے کے لئے کچھ وقت لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں واپس آ گیا۔ اگلی صبح کا جب اخبار آیا تو The News میں ذیل کالمی سرخی لگی ہوئی تھی کہ عطا، الحق قاسمی کو ناروے میں سفیر مقرر کر دیا گیا ہے۔ میں بڑا پرل ہوا کیونکہ لوگوں کے مبارک باد کے فون بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے پتا کیا کہ یہ خبر کس نے لگائی ہے۔ معلوم ہوا کہ فلاں صحافی نے یہ خبر دی ہے۔ میں نے اسے فون کیا اور پوچھا کہ یہ خبر آپ نے لگائی ہے؟ کہنے لگا: جی ہاں۔ میں نے پوچھا آپ کا Source کیا ہے؟ کہنے لگا: آپ کو تو پتا ہے کہ صحافی اپنا Source کبھی نہیں بتاتا۔ میں نے کہا یا تم میرے لئے صحافی تھوڑے ہو بلکہ دوست ہو۔ مجھے بتاؤ۔ کہنے لگا: پہلے آپ یہ بتائیں کہ کیا یہ خبر صحیح ہے یا غلط؟ میں نے کہا: میں بعد میں بتاؤں گا پہلے بتائیں کہ یہ خبر آپ نے کہاں سے لی ہے۔ اس نے بتایا کہ میرا سگا ماموں فارن آفس میں ڈائریکٹر ہے اور یہ خبر انہوں نے دی ہے۔ اب آپ بتائیں یہ خبر ٹھیک ہے؟ میں نے کہا: ہاں ٹھیک

ہے۔ اس کے بعد جب میں گھر آیا تو گھر میں لوگوں کے گلہ ستے آئے ہوئے تھے۔ لوگ خود مبارک باد دینے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی پیچاس لٹیس فون کی تھیں کہ ان لوگوں نے مبارک باد دی ہے۔ اس کے بعد اگر میں جوائن نہ کرتا تو اس مادہ پرست دور میں کسی نے یہ یقین نہیں کرنا تھا کہ ایک آدمی کو سفارت مل رہی ہے اور وہ انکار کر رہا ہے۔ لوگوں نے یہی کہنا تھا کہ حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔ ان حالات میں، میں نے وہ سفارت قبول کی اور اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں یہ سفارت قبول نہ کرتا تو یہ میری زندگی کا ایک Blunder ہوتا۔ اس کے لئے میں میاں نواز شریف صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک نئے تجربے سے دوچار کرایا اور میں نے ان کو سرخرو بھی کیا۔ میں نے اپنی سفارت کے دوران میں جو کام کئے فارن آفس بھی اس کا معترف ہے بلکہ None Career diplomats کوئی ایک دو ہی ہوں گے جن کی صلاحیتوں کا فارن آفس والوں نے اعتراف کیا ہو اور ان خوش قسمتوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اس طرح زندگی کے فیصلے خود بخود ہوتے رہے ہیں۔ غالباً نہ طور پر میرے راستے کے کانٹے دور ہوتے رہے اور میرے راستے میں پھول آتے رہے ہیں۔ اب اگر آپ پوچھیں کہ کیا میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں تو میں الحمد للہ، الحمد للہ سو فی صد مطمئن ہوں۔ مجھے سے اگر کوئی پوچھے کہ دوبارہ اگر آپ کو پیدا کیا جائے تو آپ کیا بننا پسند کریں گے تو میں کہوں گا کہ میں عطاء الحق قاسمی ہی بننا پسند کروں گا۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہوا اور اب بھی میرے دل میں کوئی خواہش نہیں اگر ہے تو بس یہ کہ جس ملک نے مجھے یہ سارا کچھ دیا ہے، اس ملک کی خاطر جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، وہ کروں۔

• • • • •

بیگم شفیقہ ضیاء الحق

میرے والد ڈاکٹر تھے، حصول روزگار کے لئے مشرقی افریقہ میں متعمم تھے۔ میں وہیں پیدا ہوئی جب ڈراسیائی ہوئی تو وہ مجھے جالندھر کے ایک اسلامی مدرسے میں چھوڑ گئے جہاں میں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک تک تعلیم پائی۔ دوسری تیسری جماعت میں پڑھتی تھی تو قائد اعظم صبر مہ فاطمہ جناح کے ساتھ ہمارے سکول آئے، میں نے چند سہیلیوں کے ساتھ مل کر ”تمہیں آنے والو ہمارا سلام“ کا ترانہ گایا جس کے بعد میں نے تقریر کی تو قائد اعظم بہت متاثر ہوئے انہوں نے مجھے شاہاش دی۔ میٹرک کے بعد میں دوبارہ مشرقی افریقہ چلی گئی وہاں چار برس رہنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں میری شادی ہو گئی۔ ضیاء صاحب کے خاندان سے ہمارا ملاقات زیادہ نہیں تھا۔ بچپن میں انہیں بس ایک آدمہ یاد دیکھا تھا۔ شادی میرے والد کی مرضی سے ہوئی، ضیاء صاحب مجھ سے آٹھ برس بڑے تھے۔ میرا سسرال بھارت سے لٹا کر پاکستان پہنچا تھا۔ میانوالی میں ان لوگوں کو کچھ زمین الاٹ ہوئی لیکن وہ بخر تھی اس سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی تھی لہذا ہم لوگوں کو تنخواہ پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ ہم کبوس نہیں تھے کھل کر خرچ کرتے تھے لیکن خدا کا شکر تھا کبھی پیسے کی تنگی نہیں آئی، ضیاء صاحب سائیکل پر دفتر جاتے تھے بعد ازاں انہوں نے قسطوں پر موٹر سائیکل خرید لی۔

ضیاء الحق جالندھر میں پیدا ہوئے، ان کے والد جی ایچ کیو میں ملازم تھے ان کی زیادہ تر تعلیم دہلی اور شملہ میں ہوئی، میٹرک کے بعد کراچی گئے مجھے اکثر بتایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ گزر رہے تھے تو انہوں نے دیوار پر ایک پوسٹر دیکھا جس پر نینک بنا ہوا تھا وہ پوسٹر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کر لیا، اپلائی کیا اور کامیاب ہوئے، دوسری جنگ عظیم کے دوران برما کے محاذ پر لڑتے رہے، تقسیم کے بعد آخری ”بیج“ میں پاکستان آئے جن

بیگم شفیقہ ضیاء کا انٹرویو ممتاز مفتی صاحب کے بعد میری دوسری کاوش تھا۔ یہ انٹرویو بھی معمول سے ہٹ کر تھا اور یہ بیگم صاحبہ کا آخری انٹرویو تھا یہ انٹرویو بعد ازاں بی بی سی لندن پر پڑھا گیا اور بے شمار کتابوں اور رسائل میں نقل ہوا۔

دنوں ہماری شادی ہوئی ان کی پوسٹنگ کوہاٹ میں تھی اس وقت وہ کیپٹن تھے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ نوشہرہ ہو گیا جہاں میں ان کے پاس شفٹ ہو گئی، دو سال بعد ہمارا پہلا بیٹا اعجاز الحق نوشہرہ ہی میں پیدا ہوا۔

ضیاء الحق کو ہر بچے کی پیدائش پر بہت خوشی ہوتی تھی۔ انہوں نے اعجاز الحق کی پیدائش پر سب دوستوں کو لڈو کھلائے بعد ازاں بچیوں کی پیدائش پر بھی انہوں نے اسی طرح خوشیاں منائیں۔ اکثر کہا کرتے تھے ”بیٹیاں اور بیٹے مجھے یکساں عزیز ہیں“ ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا تھا وہ گھر آ کر خوب باتیں کرتے بچوں کو روزانہ شاپنگ کے لئے لے کر جاتے، جب بچے سو جاتے تو پڑھنے بیٹھ جاتے انہیں مطالعے کا بہت شوق تھا ان کے پاس دنیا جہاں کی کتابوں کا ذخیرہ تھا، ہر موضوع پر کتاب پڑھ لیتے تھے۔ اب بھی ان کی لائبریری کتابوں سے بھری پڑی ہے، لوگوں کی ان کے بارے میں رائے ہے کہ وہ ”مولوی ناسپ“ تھے جبکہ ان میں مولویوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ انہوں نے ہمیں ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ کبھی کسی بات پر روکا ٹوکا نہیں بچوں کو پڑھاتے بھی تھے لیکن ان کی مصروفیات کی وجہ سے بچوں پر زیادہ محنت مجھے کرنا پڑی جسے میں نے الحمد للہ نبھایا۔

ضیاء الحق کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم لوگ دو مرتبہ لندن سے ”بائی روڈ“ پاکستان آئے۔ ایک مرتبہ وہ امریکہ سے لندن آئے اور میں لندن پہنچ گئی وہاں سے ہم کار پر نکل کھڑے ہوئے۔ دوسری مرتبہ جب وہ اردن میں ٹریننگ دے رہے تھے تو وہاں سول وار شروع ہو گئی۔ میں بچوں کے ساتھ لندن اپنے بھائی کے پاس چلی گئی وہ بھی وہیں آ گئے۔ ہم لندن سے جرمنی گئے جہاں ہم نے ”مرسڈیز“ گاڑی خریدی۔ بعد ازاں اسی گاڑی پر ہم لمبے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ اردن میں ہم نے بڑا شاندار وقت گزارا۔ شاہ حسین، ملکہ مونا اور پرنس حسن ہماری بہت عزت کرتے تھے۔ وہ لوگ ضیاء الحق کو بہت پسند کرتے تھے اکثر ہم لوگ ان کی طرف چلے جاتے۔ ملکہ مونا اور ملکہ نور دونوں بڑی شاندار خواتین تھیں۔ بڑی رواں اور خوبصورت عربی بولتی تھیں۔ پرنس حسن کی بیوی تو خیر تھی ہی پاکستانی اس سے گفتگو کر کے بڑا لطف آتا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں کوئٹہ میں تھی۔ ضیاء الحق لاہور آئے ہوئے تھے تو اچانک جنگ چھڑ گئی اس کے بعد ہمارا ان سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ پورے ۲۲ دن میں کوئٹہ میں پریشان رہی ہر وقت دل کو ایک دھڑکا لگا رہتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ۲۲ دن بعد ان سے

ملاقات ہو گئی جبکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کی اطلاع ہم لوگوں کو اردن میں ملی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس دن ہمارے گھر پر پرنس حسن کا کھانا تھا کھانے کے بعد اچانک مرد حضرات ایک طرف ہو گئے ان کی سرگوشیوں اور چہرے کے تے ہوئے اعصاب سے ہم خواتین کو تشویش ہوئی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے مجھے بتایا ”پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ شروع ہو گئی ہے مجھے فوراً پاکستان پہنچنا ہے اگر یہاں سے کوئی طیارہ اڑھرت گیا تو دمشق سے روانہ ہونا پڑے گا۔“ ضیاء صاحب جلدی پاکستان آ گئے اور مجھے اردن میں ٹھہرنا پڑا، پاکستان میں ان کی پوسٹنگ ملتان کر دی گئی۔ جنگ کے بعد وہ مستحقاً ملتان رہے پہلے ڈاکٹر بنے، پھر کورکمانڈر اور پھر پیپس سے چیف آف آرمی سٹاف بن کر راولپنڈی گئے۔

جنرل صاحب پیٹ کے بڑے بچے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر دفتر کی کوئی بات گھر نہیں بتائی شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ وہ اپنی ترقی تک کی خبر مجھے نہیں دیتے تھے۔ مجھے ان کی زیادہ تر ”پروموشنز“ کی خبریں مہارکباد کے ٹیلی فونز اور خطوط سے ملیں میں عموماً ایسے واقعات کے بعد ان سے لڑ پڑتی تھی لیکن وہ ہنس دیتے تھے۔ انہیں لالچ بالکل نہیں تھا وہ صدر بنے تو میں نے روپیٹ کر انہیں بار بار تنگ کر کے اسلام آباد میں اپنا گھر بنوایا کیونکہ اس وقت تک ہمارے پاس سر چھپانے کے لئے اپنی چھت تک نہیں تھی۔ وہ دراصل زمین جائیداد کے قائل نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے یہ سب کچھ بچے خود کر لیں گے۔ ان سب کو کون الگ الگ گھر بنا کر دے۔ افسوس ان کی شہادت کے بعد ان لوگوں نے پانچ گھروں کی تصاویر اخبارات میں شائع کر دیں جن میں ہمارا ذاتی گھر صرف ایک تھا باقی سب عزیز رشتے داروں کے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کو اچانک آرمی چیف بنادیا گیا۔ ان سے ۸ جرنیل سینئر تھے، آرمی میں یہ اصول نہیں ہے کہ چیف بناتے وقت سناریائی کا خیال رکھا جائے جرنیلوں سے کسی بھی شخص کو چنا جا سکتا تھا۔ موجودہ آرمی چیف جنرل عبدالوحید کا تقرر بھی اسی اصول کے تحت ہوا ہے ان پر بھی ۸ سینئر جرنیل موجود تھے جو چناؤ میں نہیں آئے تو پھر جنرل ضیاء کے تقرر کو پتہ نہیں ان لوگوں نے کیوں ہوا بنادیا۔ جب جنرل ضیاء آرمی چیف بنے تو کیا وہ سوچ سکتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ایسا ہوگا یا وہ ایسا کریں گے؟ بھٹو کے ساتھ جو کچھ ہوا عدالت کے ذریعے ہوا جنرل صاحب خود جا کر ان کا مقدمہ تو نہیں سنتے تھے اور نہ ہی فیصلہ کرتے تھے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے دن جب ملک میں مارشل لا لگایا گیا میں لندن میں تھی میری بیٹی

”زین“ کے دل کا آپریشن تھا امراض قلب کے ماہر جنرل ذوالفقار میر نے ساتھ تھے، ۳ جولائی کو زین کو اچانک بخار ہو گیا ہم لوگ بہت پریشان تھے بہر حال آپریشن ہو گیا۔ وہیں ہسپتال میں برطانیہ میں پاکستان کے سفیر مسٹر دولتانہ نے مجھے بتایا پاکستان میں اہم تبدیلیاں آئی ہیں پتہ نہیں کس نے ”فیک اوور“ کیا ہے اس وقت تک انہیں کچھ علم تھا اور نہ ہی مجھے ہاں البتہ میرے علم میں یہ بات ضرور تھی کہ نوابزادہ نصر اللہ، پروفیسر غفور، آرمی اور بھٹو آپس میں مذاکرات کرتے رہے ہیں۔ ان مذاکرات کا کیا نتیجہ نکلتا تھا مجھے اس وقت تک کچھ علم نہیں تھا، زین کے آپریشن کے بعد اسے نمونیا ہو گیا چنانچہ مجھے دو ماہ تک لندن رہنا پڑا اس دوران جنرل صاحب کا روزانہ فون آتا اگر کبھی فون نہ آیا تو خط ضرور ملتا تھا لیکن فون اور خط میں انہوں نے پاکستان میں آئے والی کسی تبدیلی کا ذکر تک نہیں کیا۔

مارشل لا لگانا آسان کام نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ کسی ایک بندے کے بس کی بات ہوتی ہے یہ ٹیم ورک ہوتا ہے۔ جنرل صاحب کے ساتھ آرمی کے بے شمار لوگ تھے کیونکہ اگر مارشل لا ناکام ہو جاتا تو وہ جان سے گئے تھے۔ پنڈی واپس آ کر میں آرمی چیف ہاؤس میں ٹھہر گئی جبکہ جنرل صاحب ایوان صدر میں اپنے دفتر رات کو وہ ایوان صدر سے آرمی چیف ہاؤس آ جاتے۔ میری واپسی پر خوشامد یوں کا تانا باندا ہ گیا۔ ان لوگوں کی تو آپ بات ہی نہ پوچھیں بعد ازاں بھٹو صاحب کے لئے بیرونی سربراہان کی طرف سے سفارشی شروع ہو گئیں۔ اردن کے شاہ حسین سے ہمارے تعلقات بڑے اچھے تھے انہوں نے اس حوالے سے بھٹو کی رہائی کی درخواست کی، لیبیا سمیت دوسرے عرب ممالک سے بھی ٹیلیفون اور خطوط موصول ہوئے۔

بھٹو صاحب بہت اچھے شخص تھے، بہت بڑے لیڈر تھے، پڑھے لکھے اور ذہین، بولنے اور ملنے میں بہت شاندار لیکن جو قسمت میں ہوتا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے جب پکڑ آ جاتی ہے تو۔۔۔ بیگم بھٹو بھی بڑی زبردست خاتون ہیں ضیاء الحق کے چیف بننے سے بہت پہلے راولپنڈی، کھاریاں اور ملتان میں میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، وہ اچھی تھیں بااخلاق تھیں۔ بھٹو کی پھانسی سے قبل ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا، کیا ہو رہا ہے ہاں البتہ اخبارات میں یہ ضرور پڑھتی تھی کہ فلاں بھٹو سے ملاقات کے لئے جا رہا ہے فلاں آ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں عموماً صبح فجر کی نماز کے بعد سو جاتی ہوں، جنرل صاحب جب دفتر جانے لگتے تو مجھے جگا کر بتاتے اور چلے جاتے، بھٹو کی پھانسی کے دن بھی وہ معمول کے مطابق دفتر گئے ان کے جانے کے بعد میں نے اخبارات پڑھے تو مجھے

معلوم ہوا، کچھ ماہیں بہت افسوس ہوا، بڑی طبیعت پریشان ہوئی یوں محسوس ہوا جیسے پورا ملک اُداس ہے۔ اس روز جنرل صاحب دیر تک دفتر رہے، یہ ان کے لئے بڑا مشکل دور تھا گھر واپس آئے تو نہ ہم نے ذکر کیا اور نہ انہوں نے کچھ کہا لیکن میرا خیال ہے انہیں افسوس تھا کیونکہ وہ انسان تھے ظالم تو نہیں تھے، اس سے قبل انہوں نے کبھی اشارنا بھی بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے بات نہ کی۔ جنرل ضیاء الحق، بھٹو اور ان کے خاندان کی بہت عزت کرتے تھے جب بے نظیر بھٹو انہیں گالیاں دیتیں اور بچے انہیں کہتے کہ ”ابودہ آپ کو گالیاں دے رہی ہیں“ تو وہ ہنس کر کہتے ”وہ میری بیٹی ہے جو چاہے کہے“ انہوں نے کبھی بھی بھٹو خاندان کو برے الفاظ سے یاد نہیں کیا، اسی لئے جب ڈاکٹر نے نصرت بھٹو کو ملک سے باہر بھیجنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے بڑے آرام سے اجازت دے دی۔

میں خود سمجھتی ہوں وہ نوے دن کے لئے آئے تھے لیکن عرصہ لمبا ہوتا چلا گیا یہ تو پتہ نہیں کہ ان پر کیا دباؤ تھا کیا بات تھی یا کیا مسائل تھے، مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے وہ عام آدمی کے لئے بڑے اچھے سربراہ تھے۔ عام آدمی انہیں روک سکتا تھا جب صدر تھے تو گزرتے ہوئے کوئی جنازہ دیکھتے تو رک کر اسے کندھا ضرور دیتے۔ ان میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں ان کے انتقال کے بعد امریکہ گئی تو لوگوں نے ان کے حوالے سے وہی عزت دی۔ لندن میں بھی لوگ مجھے سابقہ گرم جوشی سے ملتے ہیں، آرمی کے تمام لوگ ان سے محبت کرتے تھے عام سپاہی بھی انہیں ”باباجی، باباجی“ کہہ کر پکارتا تھا۔ ان کے دور میں سارا ماحول بدل گیا، بچیاں سر ڈھانپ کر سکول جاتی تھیں، اسلامی اقدار کو ترجیح ملی لیکن ان کی شہادت کے بعد دوبارہ شراب میں شروع ہو گئیں۔

جنرل صاحب بیک وقت صدر، وزیراعظم اور آرمی چیف رہے لہذا انہیں بہت کام کرنا پڑتا بعض اوقات پوری پوری رات کام کرتے رہتے، کم سوتے زیادہ جاگتے، عموماً ایک اور دو بچے کے دوران سوتے صبح سویرے جاگ جاتے۔ روزانہ خبرنامہ ضرور سنتے تھے اگر وقت نہ ملتا تو ٹی وی سے ان کے لئے خبرنامہ کی ٹیپ آ جاتی۔ نواز شریف کو بہت پسند کرتے تھے شاید انہوں نے دیکھا یہ اچھا پڑھنے والا بچہ ہے لہذا اسے سیاست میں لے آئے، نواز شریف سے تعارف جنرل جیلانی نے کرایا تھا۔

امریکہ جنرل ضیاء کے بہت خلاف تھا، جنرل صاحب اپنی مرضی کرتے تھے، سٹینڈ لے

لیتے تھے، امریکہ کو ان سے بہت فائدہ پہنچے، روس ٹوٹ گیا، افغانستان میں روس کو شکست دی، مقصد پورا ہونے کے بعد امریکیوں نے ان کو مروا دیا، امریکی ہمیشہ دوستوں کا گلا کاٹتے ہیں، جنرل صاحب اسلامی بلاک بنانا چاہتے تھے۔ طیارے کی تباہی کا پروگرام پہلے سے طے تھا بس وہ لوگ موقع کی تاک میں تھے خود جنرل صاحب کو بھی معلوم تھا کچھ نہ کچھ ہوگا۔ اسلم خٹک میرے پاس کئی مرتبہ آئے اور محتاط رہنے کی تلقین کی۔ کئی بزرگوں نے بھی آنے والے خطرات سے آگاہ کیا لیکن کسی سربراہ کے لئے ہوائی سفر سے پرہیز ممکن نہیں ہوتا، ان کے طیارے میں کوئی ایسی چیز رکھی گئی تھی جس نے سب کو مفلوج کر دیا، پہلے پائلٹ مفلوج ہوا پھر دوسرے تمام لوگ اور وہ بے چارے تو طیارہ تباہ ہونے سے پہلے ہی ختم ہو چکے تھے، اس روز وہ معمول کے مطابق مجھے جگا کر گئے سب کچھ نارمل تھا۔ کوئی بات عجیب یا خلاف معمول نہ تھی لیکن پھر ان سے کبھی ملاقات نہ ہوئی، ناشائش دیکھی، ان کا پوسٹ مارٹم تک تو ہونے نہیں دیا گیا، ان کا جنازہ بھی میں نے ٹی وی پر دیکھا، ان کی شہادت میں کوئی ایک شخص نہیں بہت سے لوگ ملوث ہیں اس میں ایئر فورس ہے، آرمی ہے اور بہت سے لوگ ہیں۔ صرف اسلم بیگ کا نام نہیں لیا جاسکتا، کس کس کو پکڑیں، فوج میں تو ایکسٹینٹ ہو جائے تو واقعے کا پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دیا جاتا ہے انکوائریاں شروع ہو جاتی ہیں لیکن اس سانحہ میں اتنے جرنل مر گئے پھر انکوائری کیوں نہیں ہوئی؟ میں نے احتجاج کیا تو مجھے جواب ملا "صدر کینڈی کے قاتل کا پتہ نہ چل سکا تو جنرل ضیا کا کیسے چلے گا" ہماری قسمت دیکھیں ان کی شہادت کے بعد بے نظیر کی حکومت آگئی اس نے انکوائری کرائی تھی؟ لیکن میرا ایمان ہے اللہ ضرور پوچھے گا کیونکہ انسان بھول بھی جائیں لیکن وہ نہیں بھولتا۔ بہت لوگوں کو حقائق کا علم تھا ایئر فورس کے کئی ایک آفیسر میرے پاس آئے انہوں نے بہت کچھ بتایا لیکن بعد ازاں ان کی دور دور پوسٹنگ کر دی گئی۔ اسحاق خان گیارہ برس تک شہید کے ساتھ رہے اچھی اچھی پوسٹوں پر کام کیا لیکن انہوں نے انکوائری کے لئے کیا کیا؟ میں اور میرے بچوں نے جب بھی ان سے بات کی انہوں نے جواب نہ دیا خاموش رہے، ہم نے حمید گل کو بھی خوب پکڑا لیکن انہوں نے بھی منہ نہ کھولا لیکن وہ منہ کیوں کھولیں؟ کیونکہ جس نے بھی منہ کھولا اسے موت آگھرے گی، لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میرے خاوند نے شہادت کا رتبہ پایا، مجھے کئی لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے مرحوم صدر کو مکہ مدینہ میں دیکھا ہے، ہر شخص نے انجام کو پہنچنا ہے جو یہاں نہیں بتاتے انہیں وہاں بتانا پڑے گا۔ نواز شریف نے بھی مرحوم کے لئے کچھ نہیں کیا جب ان کی حکومت آئی تو اعجاز نے بہت

شور مچایا خود میں نے کہا لیکن نواز شریف نے کہا ہندیاں صاحب انکوائری کر رہے ہیں، کسی نے کچھ نہیں کیا، کسی نے کچھ نہیں، ہمارے لئے ان کی شہادت ہی سب سے بڑا اعزاز ہے، ان کی قبر کتنی اچھی جگہ بنی، سب اللہ کی مہربانی ہے۔

مجھے سیاست بالکل پسند نہیں، اعجاز الحق کو لوگوں نے مجبور کیا یہ سیاست میں آ گیا، ٹھیک ہے اب آ گیا ہے تو سیاست کرے لیکن وہ چھوٹا انوار الحق، میں نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا تم اپنا کام کرو لیکن وہ بھی سیاست میں گھسا ہوا ہے۔ سیاست میں ایک اصول ضرور ہونا چاہیے۔ بندہ جس کے ساتھ ہو پھر اسی کے ساتھ رہے۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر، الی بات اچھی نہیں۔ جب اسحاق خان اور نواز شریف کا معاملہ شروع ہوا تھا تو میں نے اعجاز الحق سے کہہ دیا تھا کہ تم نے نواز شریف کے ساتھ رہنا ہے۔

لوگ اب بھی صدر کی بیوی کچھ کر میرے پاس آتے ہیں۔ ان بے چاروں کا خیال ہوتا ہے کہ میں پہلے کی طرح صاحب اختیار ہوں اور ان کی مدد کروں گی، مجھے بہت افسوس ہوتا ہے لیکن اب بھی خدا کا دیا بہت کچھ ہے میں ان لوگوں کی جس قدر ممکن ہمدرد کرتی ہوں۔ کچھ لوگ جو سرکاری عہدوں پر فائز ہیں حکومت کے خوف سے مجھے نہیں ملتے، کہتے ہیں ہماری گاڑیوں کے نمبر ٹوٹ گئے جاتے ہیں اور میں انس پڑتی ہوں... میں اپنا مقدمہ خدا کی عدالت میں پیش کرتی ہوں کیونکہ وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔

ایرمارشل ذوالفقار علی خان

میں ۱۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور میں پیدا ہوا میرے والد سول سروس میں تھے میرے بچپن کے دوران ان کی زیادہ تر پوسٹنگ مشرقی پنجاب میں رہی لہذا بچپن فیروز پور، کمرال اور روپڑ میں گزرا میں جب ۱۳ برس کا ہوا تو مجھے ملٹری کالج جہلم میں داخل کرا دیا گیا، جہاں میرے بے شمار کلاس فیلوز میں جنرل اقبال اور جنرل غلام محمد بھی شامل تھے۔ وہ دور بہت زبردست تھا۔ ہم ہندو مسلمان اور سکھ مل کر پڑھتے تھے ہمارے اساتذہ بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے ان میں کچھ سولین تھے اور کچھ یونی فارم میں۔ ہم روز صبح سویرے جاگتے تھے سردیاں ہوں یا گرمیاں! ٹھنڈے پانی سے نہاتے تھے۔ کلاس رومز بڑے شاندار تھے لائبریری زبردست تھی پڑھائی میں بہت دل لگتا تھا۔ ہر دوپہر کھانے کے بعد ایک کھنے کی ریسٹ ضروری تھی اور شام کو ہم لوگ ہوم ورک کے لئے کلاس رومز میں اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ جاتے تھے، جہاں استاد نہیں ہوتے تھے لیکن ہمیں ایمانداری سے ہوم ورک کرنا پڑتا تھا۔ بہت خوبصورت تھا بچپن ان مخصوص اور خوش قسمت لوگوں کی طرح جن کا بچپن واقعی شاندار ہوتا ہے۔

پاکستان بننے سے چند روز قبل میرے والد انبالہ کے ایس پی تھے وہاں سے ان کی پوسٹنگ گورداسپور ہو گئی وہ اپنی فیملی کو انبالہ چھوڑ کر چلے گئے۔ چند روز بعد ملک تقسیم ہو گیا اور مشرقی پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے۔ انبالہ میں والدہ اور چھوٹے بہن بھائی اکیلے تھے۔ میرے والد کے ایک دوست جو آری میں تھے ہماری فیملی کو کار میں اٹھا کر دہلی لے آئے، جہاں سے وہ لوگ رائل ایئر فورس کے طیارے پر لاہور آ گئے۔ میں ان دنوں جہلم میں تھا، وہاں ہمیں فسادات کی خبریں مل رہی تھی۔ بڑی پریشانی ہوئی بہر حال فیملی کے خیریت سے پہنچنے کے بعد حالات معمول پر آ گئے۔ ۱۳ اگست ۴۷ء سے قبل گورداسپور پاکستان میں شامل تھا لیکن اچانک اسے بھارت کے

ایئر مارشل ذوالفقار علی خان پاکستان فضائیہ کے سربراہ اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر رہے ان کی زندگی بھی ایک دلچسپ سیاسی افسانہ تھی یہ میری زندگی کا تیسرا اثر دیتا تھا۔

حوالے کر دیا گیا۔ میرے والد وہاں کے ایس پی تھے انہیں اس فیصلے سے بڑا جذباتی صدمہ پہنچا بعد ازاں وہ بارڈر کراس کر کے پاکستان آ گئے یہاں آ کر وہ ایس پی سیالکوٹ رہے پھر ایس پی جھنگ بنے اور ۵۴ء میں ریٹائر ہو گئے۔

میں نے ۴۸ء میں ایئر فورس جوائن کر لی۔ ٹریننگ کے بعد دسمبر ۵۰ء میں مجھے کمیشن ملا۔ پاکستان ایئر فورس کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے صرف ۱۲ لاکھ کے پاس آؤٹ ہوتے ان میں سے چند چھوٹے عہدوں پر ریٹائر ہو گئے۔ چند کا ایئر کرش ہو گیا اور صرف میں باقی رہے تک پہنچ سکا۔ میری پہلی پوسٹنگ فائٹر سکوڈرن ۹ میں ہوئی وہاں ڈیوٹی میں نوکری کے بعد میں فلائنگ انسٹرکٹر کے کورس پر چلا گیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد رسالہ پور میں فلائنگ انسٹرکٹر لگ گیا۔ اس دور میں پاکستان ایئر فورس کے پاس صرف چار سکوڈرن تھے، جن میں تین فائٹر اور ایک ٹرانسپورٹ سکوڈرن تھا۔ تینوں فائٹر سکوڈرن پشاور میں ہوتے تھے جبکہ ایک میران شاہ میں، اس کا نام "وائج اینڈ وارڈ" تھا اور اس کا کام قبائلی علاقوں میں کسی بھی گزیر کی صورت میں پولیٹیکل اتھارٹیز کی معاونت کرنا تھا۔ پھر جب جیٹ آ گئے تو میران شاہ کا سکوڈرن ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں مجھے ایف ۸۶ کی ایڈوائس فائٹر ٹریننگ کے لئے امریکہ بھیج دیا گیا۔ میرے ساتھ ایئر فورس کے چار اور آفیسر بھی تھے۔ ۵۵ء کے آخر میں ہم لوگ ٹریننگ لے کر واپس آ گئے اور ۵۶ء میں ہمیں امریکہ نے ایف ۸۶ طیارے اور دیگر دفاعی سامان دیا جس کے بعد پاکستان ایئر فورس مزید بہتر ہو گئی۔

۵۸ء کا مارشل لاء لگا تو میں سکوڈرن لیڈر تھا۔ اس دوران ہمیں آر می نے قطعاً اعتماد میں نہیں لیا۔ نیوی کی صورتحال بھی ہم لوگوں سے مختلف نہیں تھی بس ہمیں اتنی اطلاع ملی کہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور بس۔ اور ویسے بھی ہمیں مارشل لاء کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ ہمارا کام نہیں ہم لوگ صرف اور صرف اپنی پیشہ ورانہ مہارت تک محدود رہتے ہیں نہ ہمارے پاس ہتھیار ہوتے ہیں نہ ہتھیار لہذا ہم مارشل لاء ختم کی سرگرمیوں پر توجہ نہیں دے سکتے یہ آر می کا کام ہے، جن کے پاس افرادی قوت ہوتی ہے، ہتھیار ہوتے ہیں، خود جہاز بھی جب مارشل لاء لگا جا رہے ہیں تو ہمیں بے ضرر سمجھ کر اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کرتے۔

۱۹۶۳ء میں مجھے ایئر اسٹاشی بنا کر واپس بھیج دیا گیا۔ ۶۵ء کے وسط میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تناؤ کی صورتحال پیدا ہو گئی۔ سرحد کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ بھارتی

دارالحکومت میں رہ کر ہمیں صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پاکستان اور بھارت میں جلد جنگ ہوگی۔ مقبوضہ وادی میں ہمارا فوجی ڈویژن گھس چکا تھا۔ بھارتی وزیراعظم الال بہادر شاستری الال قلعے میں کھڑے ہو کر صاف کہہ رہے تھے کہ جنگ کے لئے جگہ اور وقت کا انتخاب ہم کریں گے۔ بھارتی تقریبات میں بھی ہر شخص کے منہ پر پاک بھارت تناؤ کے قصے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہم لوگ روزانہ دریائے جمنا کے کنارے کھڑے ہو جاتے اور ریلوے کراسنگ پر فرار لے بھرتی درجنوں ٹرینیں دیکھتے جن میں ٹینک، توپیں اور فوجی جوان لدے ہوتے تھے اور ان فریوں کا زرخ پاکستان بارڈر کی طرف ہوتا تھا اور ہم روزانہ ہی رپورٹ تیار کر کے پاکستان بھیجتے تھے۔ خود ہمارے ہائی کمشنر میاں ارشد محمود نے کئی خط لکھے جن میں بھارت کی جنگی تیاریوں اور بارڈر پر سرگرمیوں کا احوال تفصیلاً درج ہوتا تھا لیکن پاکستان میں ہماری رپورٹوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ ہماری حکومت نے جنگ کی مکمل تیاری کیوں نہیں کی؟ ہو سکتا ہے ہمارے اندازوں کے مطابق جنگ نہ ہوتی لیکن تیاری تو ہمارا فرض تھا۔ اب یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ہم لوگوں نے بالکل تیاری نہیں کی تھی کچھ تیاری تھی، لیکن اتنی نہیں تھی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ ان دنوں بھارتی حکومت ہمارے ہائی کمشنر کو تقریباً روزانہ بلا کر "پروٹسٹ نوٹس" دیا کرتی تھی جب وہ واپس آتے تو ہم ان کے منتظر ہوتے اور وہ ہماری بے چینی دیکھ کر آتے ہی تفصیلاً بات چیت شروع کر دیتے۔

۶ نومبر ۶۵ء کو بھارت نے ہم پر حملہ کر دیا، جس کے فوراً بعد ہم سب کو "ہاؤس ریٹ" کر دیا گیا۔ صرف ہمارے ہائی کمشنر میاں ارشد محمود کو پاکستان ہاؤس میں رہنے کی اجازت دی گئی، جبکہ ہم لوگوں کو ہائی کمشنر آفس میں محصور کر دیا گیا جہاں ہم ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک بند رہے۔ وہ دن ہماری زندگی کے مشکل اور بے چین دنوں میں سے چند تھے کیونکہ ہر وقت دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا ہمارے پاس ریڈیو کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا، جس سے ہمارا بیرونی دنیا سے رابطہ ہو سکتا، چنانچہ ان دنوں جو کچھ بی بی سی نے کہا، وائس آف امریکہ نے نشر کیا یا وائس آف جرمنی سے جو کچھ کہا گیا ہمارے پاس اسے تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار ریڈیو پاکستان کی نشریات بھی سننے کو مل جاتی تھیں، جس سے دل کو دھارس ہوتی تھی۔

آر می فورسز کی تمام تر کوششوں کے باوجود پاکستان جنگ نہیں جیت سکا۔ ہم اسے فتح نہیں کہہ سکتے، کیونکہ جنگ کے بعد حالات وہی رہے۔ دراصل ۶۵ء کی جنگ ہمارے غلط

اندازوں کی ایک طویل سیریز تھی۔ ہمارا پہلا اندازہ تھا کہ اگر ہم نے کشمیر میں کچھ لوگ بھیج دیئے تو کشمیری اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ہمارا دوسرا غلط اندازہ آپریشن جبرالٹر تھا۔ ہمارا خیال تھا ہم میجر جنرل اختر ملک کی قیادت میں جو فوجی ڈویژن مقبوضہ کشمیر بھیج رہے ہیں، اس کا رد عمل کشمیر تک محدود رہے گا اور بھارت اس کی بنیاد پر بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر ہرگز حملہ نہیں کرے گا، لیکن ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا اور بھارت نے حملہ کر دیا۔ جنگ شروع ہونے کے بعد بھی غلطیاں جاری رہیں مثلاً شروع کی پانچک میں ایئر فورس اور نیوی سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ نیوی کو ہو سکتا ہے کچھ علم ہو لیکن ہم لوگوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ یہ جنگ دراصل پاکستان کے اندازوں کی ناکامی ہے۔

معادہء عاشقندہ سے پاکستانی عوام کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی جذباتی انھیں پہنچی، لیکن اگر عقلی سطح پر پرکھا جائے تو اس وقت ہمارے پاس کوئی دوسری چوائس نہیں تھی اس جنگ میں صرف دو آپشن تھے ایک صلح دوسری لڑائی۔ ہم لڑائی زیادہ دیر تک افرو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بھارت میں لڑائی کا زیادہ دم نہیں تھا۔ وہ ہم سے بڑا ملک تھا اس کے پاس فوجی زیادہ تھے ہار واد اور اسلحہ زیادہ تھا۔ جبکہ ہمارے پاس ان دونوں چیزوں کی کمی تھی اور اگر ہم لڑائی کو کھول دیتے تو ہمارے پاس اسلحہ ختم ہو جاتا اور اس کے بعد ہم کس بنیاد پر صلح کی بات کرتے۔ اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ وہ آدمی آپس میں لڑتے ہیں ایک دوسرے کو زیر کر لیتا ہے تو وہ کہتا ہے آؤ صلح صفائی کی باتیں کریں تو کیا دوسرا یہ بات مان لے گا، لہذا صلح کے لئے برابری کی سطح ضروری تھی، لہذا ہم نے دوسری چوائس فوراً مان لی یہی اس وقت عقل مندی کا تقاضا تھا۔

۶۶ء کے آخر میں دہلی سے واپس پاکستان آ گیا۔ چند ماہ بعد مجھے ڈھاکہ میں بیس کمانڈر بنایا گیا۔ میں اپریل ۶۷ء میں ڈھاکہ پہنچا تو وہاں کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ میں پہلے پی اے ایف جیس کی بات کرتا ہوں۔ ڈھاکہ کے بیس مغربی پاکستان کے کسی بھی بیس سے مطابقت نہیں رکھتا تھا وہاں صرف ایک فائٹر سکواڈرن تھا۔ ملک کو بنے بیس برس ہو چکے تھے ان ۲۰ برسوں میں مغربی پاکستان کے بیسز نے جتنی ترقی کی ڈھاکہ میں اس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ سارے نظام فرسٹ ۱۰۰ تھے۔ معیار انتہائی پست تھا۔ ہزار افراد کے لئے صرف ۸ میریڈ کوائرڈ تھے۔ ڈیزل ۱۰۰ ایجنٹ کے لئے سسٹم بیک تھی۔ باقی سارا عملہ بیٹنوں میں رہتا تھا۔ مغربی پاکستان میں ہر بیس کے لئے جدید ترین انجن شاپ تھی اور ایئر فورس کے قانون کے مطابق جو شخص کھلی فضا میں جہاز کا

انجن کھولتا اس کا کورٹ مارشل ہو جاتا تھا لیکن مشرقی پاکستان میں انجن شاپ کا نام و نشان تک نہیں تھا لہذا چھوٹی موٹی خرابی کی صورت میں "بھاشاہٹ" میں انجن کھول لیا جاتا تھا جس کی قسمیں بدسات میں چلتی تھیں دوسرا پورے مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لئے ۲۰ یا ۲۲ طیارے تھے جبکہ بھارت کی ایئر فورس نے ہمیں تین اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر میرا دل بہت دکھا اور میں نے ۲۴ اگست ۶۷ء میں ابراہیم خان کو ایک تفصیلی خط لکھا جو بعد ازاں حمود الرحمن کمیشن میں پیش کیا گیا میں نے لکھا۔

There are secessionist tendencies existing in East Pakistan- India will try to take advantage of it, India has very strong defensive positions in West Pakistan, and goes out for all quick victory in East Pakistan. What will be our Military response? Our theory that defence of East Pakistan lies on West Pakistan is totally wrong. we have only one Air field and one Squadron in East Pakistan where as Indians have Air field to our East, to our North and they have Aircraft carrier so they can even attack in our South. We do not have any Raddar and early warning system. We can be struck from all the four directions without any warning. In stch an event our Air force will not Last more than 24 hours.

میرے اس خط کے پیچھے کسی قسم کی انٹیلی جنس رپورٹ نہیں تھی۔ یہ میرا ذاتی تجزیہ تھا اور میرے جیسا کوئی بھی شخص جو ۶۷ء میں ڈھاکہ ہوتا وہ ان حالات کی روشنی میں مستقبل کی پیشین گوئی کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ محبت وطن ہو اور اس میں کہنے کا حوصلہ ہو۔

ڈھاکہ میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے چند روز بعد میں ڈھاکہ آفیسرز کلب گیا، جہاں کوئی ڈنر تھا۔ وہاں ایک بنگالی خاتون میرے پاس آئی اور اس نے کہا "تم ایئر فورس کے نئے کمانڈر ہو" میں نے کہا ہاں تو وہ بڑی نفرت سے بولی "تم لوگ شہر پر جہاز اڑا کر ہمیں دھمکانا چاہتے ہو" اس کے یہ رویہ کس سن کر مجھے بڑا دکھ پہنچا اور میں نے اسے کہا ہم اپنے لوگوں کو کیوں دھمکائیں گے پھر میں نے اسے سمجھایا کہ ہمارے ایئر فیلڈز ڈھاکہ شہر کے اندر ہیں لہذا ہمیں مجبوری کی حالت میں شہر آنا پڑتا ہے یہ ایک واقعہ تھا جس میں عقل مندوں کے لئے بہت سے

اشارے مضمر ہیں۔ بنگالیوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے لئے نفرت بڑی حد تک بڑھ چکی تھی۔ مجھے ایک واقعہ بڑی اچھی طرح یاد ہے ہمارا ایک جہاز طوفان میں پھنس گیا اس کے دو پائلٹ تھے ایک پنجابی دوسرا بنگالی۔ دونوں کھیتوں میں گر گئے پنجابی کی پشت پر گہرا زخم آیا وہ یہاں بنگالی پائلٹ کو اٹھا کر لے گئے جبکہ پنجابی زخمی حالت میں کھیت میں پڑا اور کسی ایک شخص نے بھی اسے پانی تک نہیں پلایا یہاں تک کہ امدادی ہیلی کاپٹر وہاں پہنچ گیا۔ میرے دو رائے میں تین ارمینوں کو مار دیا گیا۔ ایک سینما کیلے کر رہا تھا اور بنگالیوں نے اسے چڑھ کر مارا۔

ہمارا بنگالیوں کے ساتھ رویہ بہت خراب تھا۔ آپ اس ملک میں رہتے ہیں اور میں روز آپ کی بے عزتی کروں تو آپ اس کو اپنا ملک نہیں گے؟ نہیں تو بنگالی پھر ہمارے ساتھ کیسے رہ سکتے تھے ہم نے وہاں جو حالات پیدا کر دیے تھے ان میں کئی عجیب الرحمان پیدا ہو جاتے تو بعید نہیں تھا۔ ہمارا رویہ اس قدر جنگ آمیز تھا کہ مغربی پاکستان کے کئی انصاف پرست آفیسریہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ "اگر ہم بنگالی ہوتے تو فوراً الگ ہو جاتے" ۶۷ء میں ہی حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ نچلے گریڈوں پر کام کرنے والے افسروں اور عملے کو علیحدگی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہم نے ان دنوں ایک ونگ کمانڈر کو فیرویل پارٹی دی تو اس نے رخصت ہوتے وقت کہا میں اگر اگلی مرتبہ یہاں آیا تو مجھے یقیناً پاسپورٹ کی ضرورت پڑے گی۔

بھارت نے نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تو کئی مشیروں نے اعلیٰ حکام کو مشورہ دیا مغربی پاکستان کو اس بنیاد پر جنگ میں نہیں کودنا چاہیے لیکن ہم لوگوں نے کہا کہ ہمارے ملک پر حملہ ہو چکا ہے لہذا ہمیں فوراً جواب دینا چاہیے اگر ایسا نہ کیا گیا تو کل کو سندھ پر حملہ ہوا تو پنجاب ساتھ نہیں دے گا اور اگر پنجاب پر چڑھائی کی گئی تو سرحد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا۔ اسی کشمکش میں دو ماہ گزر گئے۔ بالآخر دسمبر کے آخر میں مغربی پاکستان کی طرف سے بھارت پر حملے کا فیصلہ لیا گیا۔ میں ان دنوں ڈائریکٹر پریزنس تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پاک فضائیہ حملے کا آغاز کرے گی۔ ہمارا جہاز شام کو باؤڑ کر اس کر کے بھارتی علاقے میں ہم گرائے گا اور اس کے بعد آرمی حملہ کرے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارا اظہار بھارت پر حملے کے لئے تیار تھرا تھا۔ ہم لوگ پائلٹ کو ہدایات دے رہے تھے وہاں صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان تشریف لے آئے اور میں نے دیکھا وہ نشے میں بری طرح دھت تھے۔ میرا دل ڈوب گیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا دیکھو یہ وہ شخص ہے جو پاکستان کا سربراہ ہے یہی وہ شخص ہے جو افواج پاکستان کا سربراہ ہے اور اس

کے ایک شمارے پر ہمارے اکھوں جو ان جنگ میں کودنے والے ہیں اور یہ۔

۱۷ء کی جنگ میں بھارت کی دفاعی منصوبہ بندی بہت بہتر تھی کیونکہ انہوں نے بھرپور تیاری کے ساتھ یہ حملہ لیا تھا۔ ۶۵ء کی جنگ میں ہمارا دفاعی تناسب کم تھا لیکن ۱۷ء میں یہ "گیپ" بہت بڑھ گیا کیونکہ ان لوگوں نے ۶۵ء کے بعد ہنگامی سطح پر تیاریاں شروع کر دی تھیں، ان کے مقابلے میں ہمارے وسائل بہت کم تھے اگر ہم اپنا دفاعی بجٹ بھارت کے برابر کر دیتے تو پاکستان کی ساری معیشت تباہ ہو کر رہ جاتی ان کے جوان لاکھوں کی تعداد میں زیادہ تھے۔ ان کے پاس ایک ہزار ہزار کا جہاز تھے انہوں نے مشرقی پاکستان میں ۸ ڈویژن فوج اور فضائیہ کے ۱۰ اسکواڈرن لگا رکھے تھے جبکہ ان کے مقابلے میں ڈھاکہ میں ہمارا صرف ایک اسکواڈرن تھا۔ مغربی پاکستان کی طرف ان کی دفاعی پوزیشنز اس قدر مضبوط تھیں کہ ہمیں انہیں توڑنے کے لئے اکثر محاذوں پر ۳۳ اور بعض جگہوں پر ۳۳ کنا فورس کی ضرورت تھی۔ چھ ماہ میں لڑائی میں بھی وہ گروٹی تھی رہی کسی کر مشرقی پاکستان کی فوجی قیادت نے پوری کر دی۔ اگر ہم مشرقی پاکستان میں اپنی فوجی طاقت پھیلانے لے۔ جائے ڈھاکہ میں محصور ہو جاتے تو ہم زیادہ عرصہ تک لڑ بھی سکتے تھے اور ہماری شکست بھی اتنی بدترین نہ ہوتی، اگر آپ ڈھاکہ کا نقشہ دیکھیں تو اسے دریائے ڈھاکہ نے گھیر رکھا ہے اور یہ دریا بالکل سمندر جیسا ہے اسے عبور کرنا کسی بھی آرمی کے لئے ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں سرحد سے ڈھاکہ تک راستے میں بھی کئی روپا پڑتے ہیں جنہیں عبور کرنے کے لئے وقت اور مہارت کی ضرورت ہے، اگر ہم بھارت کو ان مسائل کا شکار کر دیتے تو ہمیں بہت سادگی مل جاتا لیکن انہوں نے سب یہ ٹھنک ہوسکا۔

بنگلہ دیش کی علیحدگی کا معاملہ "پوائنٹ آف نوریشن" تک پہنچ چکا تھا۔ یہ کسی ایک فرد کی غلطی نہیں تھی اس کے پیچھے غلطیوں اور منافقتوں کی ایک طویل قطار ہے اور اے دن تک پہنچتے پہنچتے یہ معاملہ بے قابو ہو چکا تھا اور اس وقت خود عجیب الرحمان بھی چاہتا تو ملک نہیں بچ سکتا تھا کیونکہ شدت پرستی اس کی مجبوری بن چکی تھی اور مغربی پاکستان میں سب کو علم تھا کہ بنگالی ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ہوتی نہیں سکتا تھا کہ بنگالی ۶ نکات پیش کرتے۔ یحییٰ خان وغیرہ انہیں پڑھتے اور کہتے اچھا تم الگ ہونا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ہو جاؤ کیونکہ اس صورت میں یہاں ان کی کھالیں اتر جاتیں کچھ ایسے ایسے ہوتے ہیں جن کے نتائج کا آپ کو علم ہوتا ہے لیکن آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ حالات کا ساتھ دینا آپ کی مجبوری بن جاتا ہے شاید

بھٹی خان کے لئے بھی۔

اے، جنگ کے حوالے سے مجھے ایک بات بہت تنگ کرتی ہے، ان دنوں ہمارے کچھ حکام اعلان کیا کرتے تھے کہ ہم پاک سرزمین کی ایک انچ زمین دشمن کو نہیں دیں گے لیکن جب انہوں نے ہتھیار ڈالے تو ڈھاکہ میں جنرل اروڑہ کا پرتیاک استقبال کیا گیا میں ان دنوں اپنے جنرلوں کے بیان سن کر حیران ہوتا تھا ٹھیک ہے ایک جوان کا مورال بلند ہونا چاہیے کہ دشمن کے دس فوجی بھی آگئے تو میں ان کی امانت لوں گا لیکن جب آپ اعلیٰ عہدے پر ہوتے ہیں جہاں لاکھوں افراد کی زندگیاں ایک شخص کے اشارہ چشم سے بندھی ہوتی ہیں تو آپ کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ پھر دشمن کی زبردست تیاری اور دفاعی بالادستی دیکھنے کے باوجود آپ خوابوں کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں کیوں؟ مجھے آج تک اس کی سمجھ نہیں آئی۔

مجھے آج بھی یاد ہے جی انجے کیو کے آپریشن سنٹر میں ہم لوگ بیٹھے تھے ہمارے کمانڈر چیف ایئر مارشل رحیم خان باہر آئے اور کہا "شوزاز اور" اور اس کے بعد پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہماری آدمی کا ایک بڑا حصہ جنگی قیدی بن گیا اور ایک قوم تاریخ کے اندھیروں میں گم ہو گئی۔

اس جنگ میں میرا چھوٹا بھائی کیپٹن نواز علی خان ڈھاکہ کے کسی محاذ پر ہمیشہ کے لئے ہمارا ساتھ چھوڑ گیا۔ والدہ کو اس کی شہادت کا سن کر بہت صدمہ ہوا ہم بڑی کوششوں کے باوجود اس کی لاش دریافت نہ کر سکے پھر کچھ عرصہ بعد کسی نے آکر والدہ سے کہہ دیا کہ اس نے ریلوے پر اس کا انٹرو پوسنا تھا اور وہ شہید نہیں ہوا، بلکہ جنگی قیدی ہو کر بھارت کے قبضے میں ہے تو دوبارہ آس سی لگ گئی۔ میرے بڑے بھائی جنرل سعادت علی خان نے بڑی دھوپ کی لیکن آخر میں یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی اے، کی جنگ جہاں پاکستان کی تاریخ پر امن نقش چھوڑ گئی وہاں اس نے ہماری زندگی کی کتاب پر بھی ایک گہراؤ کھنچ کر دیا۔

جنگ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھال لیا۔ وہ بہت ذہین تیز اور موقع شناس تھے۔ انہوں نے دیکھا تو قوم بالکل ہمت ہار چکی ہے تو انہوں نے دوبارہ اسے حوصلہ دیا۔ ملک میں اسلامی سربراہی کا ففرنس بلانی، یورپ اور امریکہ سے رابطہ منقطع کر کے اسلامی بلاک بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ پاکستانی دوبارہ باوقار قوم بننے لگے۔ پھر ۱۹۷۴ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر دیا تو پاکستانی مورال دوبارہ زمین پر آگرا۔ یہ دیکھ کر بھٹو نے ایٹمی طاقت بننے کا اعلان کر

دیا۔ ہم نے ایٹمی پلانٹ کے لئے دوز دھوپ شروع کر دی قوم ایک بار پھر پاؤں پر آکھڑی ہوئی۔ میں صرف اس وجہ سے بھٹو کی عزت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا کیونکہ میرا ذاتی خیال ہے، اگر اے کی جنگ کے بعد پاکستان کو کوئی کمزور لیڈر ملتا تو آج پاکستان جنوبی ایشیا میں سری لنکا، بھوٹان، مالدیپ، بنگلہ دیش اور نیپال جیسا ملک ہوتا صرف بھٹو کی وجہ سے آج پاکستان پر صغیر میں بھارتی دباؤ کا مقابلہ کرنے والا واحد ملک ہے۔

بھٹو سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں لاہور کے گورنر ہاؤس میں ہوئی۔ میں ان دنوں سرگودھا کا میں کمانڈر تھا۔ مصطفیٰ کھر گورنر پنجاب تھے تو انہوں نے سرگودھا کے افسران کو ڈنڈا دیا وہاں بھٹو سے تعارف ہوا انہوں نے سرگودھا میں کے بارے میں پوچھا بعد ازاں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۷۶ء میں جب امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر پاکستان آئے تو بھٹو نے مجھے کہا "تم بھی میرے ساتھ گورنر ہاؤس لاہور چلو اور کسنجر سے دفاعی ساز و سامان کے لئے بات کرو" بھٹو امریکہ سے کچھ دفاعی سامان خریدنا چاہتے تھے۔ میں ان کے ساتھ چلا گیا وہاں کسنجر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے دفاعی ضروریات کے بارے میں پوچھا میں نے بتا دیا ہمیں ایئر کرافٹز کے علاوہ ایٹمی شپنگ میزائلز، ایٹمی ٹینک میزائلز اور لیزر گائڈڈ بم چاہیے تو کسنجر نے کہا ٹھیک ہے تم یہ سب کچھ لے لو لیکن ایٹمی پلانٹ چھوڑ دو تو میں نے جواب دیا سر میں انٹر چیف ہوں میری معلومات صرف فضائیہ تک محدود ہیں۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم ہی فیصلہ کر سکتے ہیں تو ڈاکٹر ہنری کسنجر بھٹو کی طرف مڑے اور کہا۔

Prime Minister.

We Have Taken A Lenient View About Your Reprocessing Plant But We Did Not Know What Would Be The Attitude Of the Next Government

مجھے محسوس ہوا کہ ایٹمی پلانٹ کے حوالے سے بھٹو پر شدید دباؤ ہے۔ واپسی پر میں نے بھٹو کو خط لکھا کہ آپ ہتھیاروں کے بدلے ایٹمی پروگرام ترک نہ کیجئے گا، کیونکہ یہ ہماری بقاء کی ضمانت ہے۔

حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ تیار ہوئی تو آری اور نیوی نے بھٹو سے کہا کہ اسے نہیں چھپنا چاہیے لیکن میں نے زور دے کر کہا کہ رپورٹ عوام کے سامنے آنی چاہیے کیونکہ جب عام

جوان یا چھوٹے آفیسر کی غلطی پر اس کا کورٹ مارشل ہو جاتا ہے تو پھر ایسے جرنیلوں کے چہرے  
عوام کے سامنے کیوں نہیں لائے جاتے جنہوں نے پاکستانی تاریخ کی بدترین غلطیاں کیں۔ میں  
نے جب زور دیا تو بھٹو نے مجھے لاڑکانہ طلب کیا میں جلی کا پٹر پر وہاں گیا تو وہ لان میں ٹہل رہے  
تھے مجھے بھی ساتھ بلا لیا۔ وہاں بھٹو نے پوچھا تم حمود الزمان رپورٹ کی اشاعت پر زور کیوں دے  
رہے ہو۔ تو میں نے کہا سر رپورٹ شائع نہ ہوئی تو آرتھور سز میں کورٹ مارشل کی غیر جانبداری  
مشکوک ہو جائے گی تو انہوں نے کہا جب آر می اور نیوی رپورٹ خفیہ رکھنے پر زور دے رہی ہے تو  
میں کیا کر سکتا ہوں تم یہ معاملہ ختم کرو پھر جب میں مایوس ہو کر وہاں سے واپس آئے گا تو بھٹو نے  
کہا لیکن ایئر چیف مارشل میں تمہیں یہ بتا دوں میرے بعد لوگ کہیں گے بھٹو نے رپورٹ اس لئے  
شائع نہیں کرائی تھی کہ وہ خود اس میں ملوث تھا اور ہم دونوں نے قہقہہ لگایا۔

ایئر مارشل اصغر خان نے حکومت کے خلاف سرورسز چیف کو خط لکھے اور وہ بھٹو تک پہنچ  
گئے تو انہوں نے مجھے یاد کر حکم دیا تم فوراً اصغر خان کا کورٹ مارشل کرو۔ میں یہ سن کر حیران ہو گیا  
لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ اصغر خان ایئر فورس سے، بنا کر پہنچے ہیں ان کا اب لٹننٹ سے کولی  
تعلق نہیں اور اگر انہوں نے کوئی جرم کیا ہے تو ان کے خلاف عوامی عدالت میں مقدمہ چلایا  
جائے۔ جنرل ضیاء جو اس وقت وہاں تھے نے فوراً کہا۔ سر یہ نہیں ایئر چیف مارشل کورٹ مارشل  
سے کیوں ہٹا چکا ہے ہیں، جنرل اصغر خان کے خلاف ثبوت بھی موجود ہیں۔ مجھے جنرل ضیاء سے یہ  
دیکھا کہ کس بہت نرم سے گئے اور میں نے کہا آپ نے اب تک کتنے ریٹائرڈ جنرلوں کا کورٹ مارشل  
کیا ہے جبکہ بہت سے اس کے حقدار بھی تھے۔ بھٹو یہ سن کر مسکرائے اور کہا آپ اصغر خان کا کورٹ  
مارشل کیوں نہیں کرنا چاہتے؟ میں نے عرض کیا کہ اصغر خان ریٹائر ہو چکے ہیں۔ دوسرا ایئر فورس  
میں ان کی بہت عزت ہے میرے اس اقدام سے فضائیہ پر بُرے اثرات مرتب ہوں گے۔  
انہوں نے کہا ویل ایئر چیف مارشل اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ فضائیہ کے لئے برا ہوگا تو میں  
آپ کو اس کے لئے کبھی نہیں کہوں گا۔

۱۷ء کے شروع میں جب نسیم ولی خان نے پشاور سے پی این اے کی احتجاجی مہم  
شروع کی تو کابینہ کے اجلاس میں بھٹو نے کہا کراچی اور حیدرآباد کے بعد پشاور میں بھی مارشل لا  
لگا دینا چاہیے تو جنرل ضیاء نے فوراً مشورہ دیا وہاں ایئر چیف مارشل ذوالفقار یہاں موجود ہیں انہیں  
کہیں شہر میں مارشل لا لگا دیں تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مارشل لا لگانے والا ایئر کمانڈر بڑا

بے وقوف ہوگا کیونکہ ہمارے پاس جوان نہیں اسلحہ نہیں اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے انجینئرز  
ایئر میز اور ٹیکنیشنز کو بندوقیں پکڑا کر سڑکوں پر کھڑا کروں، بھٹو میری بات سمجھ گئے اور انہوں نے  
اس کے بعد اصرار نہیں کیا۔

بھٹو کی کابینہ کے ایک وزیر نے مجھے لکھا کہ میں اس کے بیٹے کو سعودی عرب جانے  
والے گروپ میں شامل کروں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے وزیراعظم سے بھی بات کر لی ہے اور وہ  
اس کی منظوری دے چکے ہیں۔ مجھے اس کے حکمانہ طرزِ انکم پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے سعودی عرب  
جانے والے گروپ کی فہرست منگوائی وزیر کا بیٹا فضائیہ کے قواعد کے مطابق اس گروپ میں شامل  
تھا لیکن میں نے ایئر سیکرٹری کو حکم دیا اس شخص کا نام فہرست سے خارج کر دو بعد ازاں میں کیمسٹ  
سینٹک میں شرکت کے لئے مری گیا اور بھٹو کو ساری واردات بتا دی وہ ہنسے اور کہا میں تمہاری  
کارروائی پر خوش ہوں یہ شخص ہے ہی بہت نامعقول اس نے مجھ سے بیٹے کی سفارش کی تو میں نے  
یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ ایئر چیف مارشل کا معاملہ ہے تم نے ٹھیک کیا۔ بھٹو میں معقول بات سننے اور  
اس پر عملدرآمد کی بڑی خوبی تھی۔

۳ جولائی ۱۹۷۷ء کو میں تھیاگی میں تھا۔ رات کے ۹ بجے مجھے بھٹو کا ٹیلی فون آیا اور  
انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "ایئر چیف مارشل تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے دوبارہ الیکشن  
کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے کہا سر یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے پھر اسی رات تین بجے میرے اسے  
ڈی سی نے مجھے جگایا اور کہا جنرل ضیاء الحق لائن پر ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، میں  
نے ٹیلی فون اٹھایا اور ریسور سے جنرل ضیاء کی آواز آئی "ایئر چیف مارشل ہم نے عارضی طور پر  
ٹیک اوور کر لیا ہے۔" میں نے کہا یہ آپ نے کیا کیا بھٹو تو ری الیکشن کا فیصلہ کر چکے تھے انہوں نے  
خود رات مجھے فون کر کے بتایا تھا یقیناً آپ کو بھی انہوں نے فون کیا ہوگا تو جنرل ضیاء بولے آپ  
صبح میرے دفتر تشریف لائیں میں آپ کو تفصیلاً بتاؤں گا۔ اگلی صبح میں جنرل ضیاء کے دفتر گیا تو  
انہوں نے ایسا ویسا تھا کاراگالا پنا شروع کر دیا۔

مارشل لا کے چند روز بعد میں چکالہ میں تھا تو مجھے مری سے بھٹو کا فون آیا میں نے  
فون ریسو کیا تو وہ کہنے لگے میں نے جنرل ضیاء سے رابطے کی کوشش کی لیکن وہ دفتر میں نہیں ہیں۔  
اچھا ہوا تم مل گئے۔ کیا تم کل میرے پاس آ سکتے ہو؟ تو میں نے کہا کہ سر اگر آپ سہولت محسوس  
کریں تو انہوں نے منس کر کہا نہیں اب تو آپ نے اپنی سہولت دیکھنی ہے بہر حال انہوں نے کہا تم

کل ساڑھے دس بجے آ جاؤ۔ فون بند ہونے کے بعد میں نے جنرل ضیاء سے رابطہ کیا تو وہ دفتر میں موجود تھے مجھے بڑی حیرت ہوئی، میں نے انہیں بتایا کہ بھٹو کا فون آیا تھا اور وہ آپ سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن آپ شاید موجود نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے صبح ساڑھے دس بجے بلایا ہے تو جنرل ضیاء نے کہا ”بڑی اچھی بات ہے آپ جائیں“ میں نے کہا جناب میں کیوں جاؤں آپ جائیں وہ بات تو آپ ہی سے کرنا چاہتے تھے۔

جنرل ضیاء نے ہنس کر کہا آپ اور مجھ میں کیا فرق ہے، چلے جائیں تو میں نے جواب دیا۔ ”آپ اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ آپ نے مارشل لا لگایا اور میں نے نہیں لگایا لہذا میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ وہ کچھ پوچھیں اور میں انہیں جواب دے سکوں۔“ بہر حال اگلی صبح ساڑھے دس بجے میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے مری پہنچ گیا جہاں بھٹو ہاؤس اریسٹ تھے۔ جنرل اختر عبدالرحمن نے مجھے ریسو کیا بعد ازاں میں اندر چلا گیا بھٹو سے ملاقات ہوئی، انہوں نے ملکی اور غیر ملکی صورتحال پر تفصیلاً لیکچر دیا، میں نے انہیں بڑا مطمئن پایا، کافی چائے چل رہی تھی اور سرگرم پے جارہے تھے۔

میری یونیفارم میں ضیاء الحق سے آخری ملاقات بڑی زبردست تھی۔ ریٹائرمنٹ سے چند روز قبل میں جنرل ضیاء سے ملنے گیا، میں نے انہیں کہا، جب میں جون میں ایران گیا تو شاہ ایران نے مجھے بلا کر کہا تھا تم بھٹو کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟ تو میں نے انہیں کہا بھٹو کا کیس عدالت میں چل رہا ہے اور کورٹ ہی اس کا فیصلہ کرے گی تو شاہ ایران نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ تم لوگ اسے قتل نہیں کرو گے؟ تو میں نے کہا نہیں سر، تو شاہ نے کہا دیکھو ڈاکٹر مصدق کے حامی صرف پانچ فیصد تھے آرمی میری تھی، عوام میرے تھے لیکن میں نے پھر بھی ڈاکٹر مصدق کو قتل نہیں کیا بعد ازاں میں نے جنرل ضیاء سے کہا آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کو ترکی کے ہیڈ آف تھری سٹاف جنرل سکی سنجر سے اپنی ملاقات کی رپورٹ پیش کی تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ آپ لوگ ہمارے دوست ہیں چنانچہ آپ کو مشورہ دیتا ہوں بھٹو کو قتل نہ کرنا کیونکہ ہم چاہتے تو عدنان میندرس کو قتل کر سکتے تھے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ پھر میں نے جنرل ضیاء کو انڈونیشیا کی مثال دی جہاں ۶۵ء میں جنرل سہارٹو نے سکارنو کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا، ملک میں بڑا خون خرابہ ہوا لیکن آرمی نے سکارنو کو قتل نہیں کیا اور اسے ہاؤس ریسٹ کرنے کے بعد پوچھا گیا کہ تم کون سی بیوی کو اپنے پاس رکھنا چاہو گے تو اس نے سری دیوی طلب کی۔ آخر میں جنرل ضیاء کو میں نے الجیریہ کی مثال دی

جہاں آرمی نے ٹیک اوور کیا اور بن بیلہ کو معزول کر دیا گیا، اسے بھی اور تھرو کے بعد قتل کرنے کے بجائے ایک ویلا میں ہاؤس ریسٹ کر دیا گیا اور اس قید کے دوران اس نے شادی بھی کی تو میں نے جنرل ضیاء الحق سے کہا آپ بھی بھٹو کو قتل کرنے کی بجائے نتھیا گلی کے گورنر ہاؤس میں بند کر دیں۔۔۔۔۔ لیکن جنرل ضیاء بالکل خاموش رہے انہوں نے ہاں کہی اور نہ ہی ناں اور یہ ملاقات ختم ہو گئی۔

جنرل ضیاء کا فیصلہ کرنے کا اپنا انداز تھا مثلاً ملک میں انتخابات کے لئے ملٹری کونسل کا اجلاس طلب کیا گیا، ہم سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے جنرل ضیاء آئے اور کہا میں نے انتخابات ملتوی کر دیئے ہیں۔ مجھے بہت غصہ آیا کیونکہ میں انہیں اکثر لکھا کرتا تھا جو سیاستدانوں کا کام ہے ہمیں وہ ان پر چھوڑ دینا چاہیے خود وہ بھی اسی قسم کے وعدے کرتے آرہے تھے، میں نے انہیں کہا اگر فیصلہ آپ نے کرنا تھا تو کونسل کیوں بلائی گئی۔

بھٹو کی پچاسی پاکستانی تاریخ کی ”گریگ ٹریجڈی“ ہے۔ میں طویل سوچ بچار کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکا کہ بھٹو جیسے ذہین آدمی جس کی تمام معاملات پر نظر تھی اور وہ خود عوام میں بھی بہت مقبول تھا، اس سے ایسی غلطیاں کیسے ہو گئیں جن کے باعث وہ اس قدر تکلیف دہ انجام کو پہنچا۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ انہوں نے فیڈرل سیکورٹی فورس کیوں بنائی اور اگر بنائی تو اس میں مسعود محمود جیسے بد قماش لوگوں کو کیوں لگایا جن کی بری عادات سے بھٹو خود بھی واقف تھے اور پھر اسی مسعود محمود نے بھٹو کے خلاف گواہی بھی دی۔ بھٹو کے ایک قریبی ساتھی (نام نہیں بتانا چاہ رہا) نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک مرتبہ بھٹو سے پوچھا ”آپ نے ان لوگوں کو فیڈرل سیکورٹی فورس میں کیوں لگا رکھا ہے جن کے کردار کے بارے میں آپ خود بھی واقف ہیں“ تو بھٹو نے کہا یہ میرے بازو ہیں کیونکہ یہ لوگ میرے لئے وہ کچھ کر سکتے ہیں جو آپ لوگ بھی نہیں کر سکتے۔ میں آج تک یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ بھٹو نے اپنے اقتدار کی عمارت بیوروکریسی اور آرمی پر کیوں استوار کی۔ مارشل لا لگنے کے بعد ہم نے چیف انکیشن کمشنر سجاد علی جان کو بلایا تو اس نے بتایا کہ انکیشن کی ابتدائی رپورٹوں میں ۳۲،۳۰ حلقوں کے نتائج آئے تھے اور اگر وہ ساری کی ساری نشستیں بھی اپوزیشن کو چلی جاتیں تو بھی بھٹو بھاری اکثریت سے جیت جاتے تو پھر بھٹو کو تھوٹے لوگوں پر اعتماد کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس واقعے کا بھی گواہ ہوں جب بھٹو کو پچاسی لگانے والوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ”سر نہ صرف ہم آپ کے وفادار ہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی آپ کی وفادار رہیں گی۔“ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ بھٹو ان تمام حقائق سے ناواقف تھے کیونکہ میں نے خود کسی

سے سنا تھا کہ جب ایک کمشنر نے انہیں غلط نتائج پیش کئے تو بھٹو نے کہا تم مجھے پھانسی پر لٹکانا چاہتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم مستقبل کا مورخ اس ٹریجڈی کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گا لیکن ایک بات طے ہے بھٹو کے اس افسوسناک انجام میں بیوروکریسی اور آدمی نے بڑا کردار ادا کیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے ضیاء کی افغان پالیسی کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تو انہوں نے دو تین مرتبہ بلایا، ملاقاتیں ہوئیں جن میں ہم اپنا اپنا موقف بیان کرتے رہے، میں ان سے کہتا امریکی دیتنام کا بدلا چکانا چاہ رہے ہیں جنگ کے بعد یہ لوگ واپس چلے جائیں گے اور ہمارے لئے بہت سے مسائل رہ جائیں گے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے آخر میں جنرل ضیاء نے کہا آپ کو تو مجھ سے بہت اختلافات ہیں لیکن میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے اور میں نے جس کران کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے بعض حساس معاملات پر میری رائے لینے کے لئے مجھے دو ایک مرتبہ اور بھی بلایا جس کا میں آپ کے سامنے ذکر نہیں کر سکتا پھر جنرل ضیاء ہی نے ۷۹ء میں مجھے سفیر بنا کر سوئٹزرلینڈ بھیج دیا شاید انہوں نے اس ملک کو بے ضرر سمجھا۔ میں وہاں سے ۸۰ء کے بعد واپس آیا پھر بے نظیر بھٹو نے اپنی پہلی حکومت میں ۸۹ء کو مجھے امریکہ میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ وہاں میں ستمبر ۹۰ء تک رہا۔ بے نظیر حکومت کے خاتمے کے اگلے ہی روز میں سفارت سے مستعفی ہو گیا۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرتا چلوں کہ میں مستعفی ہونے کے بعد پاکستان آ گیا لیکن ہمارے اخبارات میں یہ خبریں شائع ہونا شروع ہو گئیں کہ ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان امریکہ سے واپس نہیں آنا چاہتے، دور سفارت میں توسیع کے لئے کوششیں کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ اور میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ خبریں پڑھتا اور پاکستانی پریس کی انفارمیشن پر قہقہے لگاتا۔ کسی ایک رپورٹر کے ذہن میں بھی نہیں آیا کہ وہ یہاں اسلام آباد میں میرے گھر فون کر کے پتہ کر لے میں کہاں ہوں؟

اور اب میں اسلام آباد کے جی ۴ بلاک میں اپنے گھر میں مزے سے زندگی گزار رہا ہوں، اخبارات پڑھتا ہوں دنیا کی تازہ ترین کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں، کافی پیتا ہوں اور اپنے شاندار ماضی کی سنہری یادوں کا لطف لیتا ہوں کیونکہ یہی بہترین مشغلے ہیں۔

• • • • •

شمیم قریشی

وہاں جموں شہر میں ایک حکیم صاحب تھے۔

کبھی کسی ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ ایک بار لاہور گئے تو ساتھیوں کے ساتھ وانا دربار چلے گئے وہاں ان پر کیا گزری اس کے بارے میں جموں کے کسی شخص کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب وہ واپس آئے تو ایک بالکل مختلف انسان تھے۔ تن من سے بے گانہ کپڑے پہنے ہوئے ہال گرد سے اٹے ہوئے اور منہ سے رال کی تاریں نکل نکل کر سینے پر گر رہی تھیں وہ لاہور سے آ کر اپنے گھر کے تھڑے پر بیٹھ گئے اور پھر باقی ساری زندگی وہیں گزار دی۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں جھانکنے کی حس سے نوازا رکھا تھا لوگ دور دور سے آتے اور ان کے قریب بیٹھ جاتے جب حکیم صاحب پر مخصوص کیفیت طاری ہوتی تو لوگ باری باری اپنی عرض پیش کرتے حکیم صاحب چند لفظوں میں اس کا جواب دے دیتے۔ میں ان دنوں جموں میں رہتا تھا۔ ہمارا گھر ان کے تھڑے کے بالکل سامنے تھا۔ میں بالکونی میں بیٹھ کر سارا دن حکیم صاحب کا جائزہ لیتا رہتا کئی بار میرا جی چاہا میں نیچے اتر کر ان کے پاس بیٹھوں ان کی باتیں سنوں لیکن میرے اندر اتنی ہمت پیدا نہ ہوئی ویسے بھی چھ برس کا لڑکا جو اپنے والدین کی شفقت سے بھی محروم ہو وہ اتنی ہمت کر بھی کیسے سکتا تھا؟ ایک دن گرمیوں کی دوپہر کو میں نے دیکھا۔ حکیم صاحب کے پاس کوئی نہیں بس تھڑے پر وہ اپنے بی بول و براز میں لتھڑے پڑے ہیں اور ہزاروں کھیاں ان پر بھینسا رہی ہیں۔ اس وقت میرے اندر نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ میں سیڑھیاں اتر کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے ”یہ بوئی“ جیسی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا ”تو بھی دیکھے گا۔“ ”دیکھے گا تو بھی“ اور ساتھ ہی کھپوں کی چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اور میں ان کے لفظ پلے باندھ کر وہاں سے واپس آ گیا پھر زندگی کے ایک طویل عرصے تک یہ لفظ

شمیم قریشی صاحب ایک حیران کن شخص تھے ان سے میرا تعارف ایک پامسٹ کی حیثیت سے ہوا لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا وہ تو برصغیر کی تاریخ ہیں۔ میں نے ۱۹۹۵ء میں ان کا انٹرویو شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۶ء تک جاری رہا۔ جب یہ انٹرویو شائع ہوا تو اس نے تہلکہ مچا دیا۔ میں آج تک مختلف اخبارات رسالے اور ٹیلی ویژن پر دیگر امور میں اس انٹرویو کی بازگشت سنتا ہوں۔ آپ کو اس انٹرویو میں بیک وقت ایک عام انسان ایک صوفی ایک دست شناس اور ایک مؤرخ ملے گا۔ شمیم قریشی صاحب بھی ایک ایسے انسان تھے جنہوں نے میری شخصیت پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔

میرے 'پٹے' سے ہی بندھے رہے کیونکہ میری فراست انہیں سمجھنے سے قاصر تھی۔

میں ایک محروم بچہ تھا۔ میرے والدین میں ان بن تھی چنانچہ میرے 'پڑھا کو' بتایا جی  
نبی میرے سب کچھ تھے ان کی کتابوں سے دوستی تھی اور میری ان سے انہوں نے مجھے بہت بچپن  
میں گلستان، بوستان، رامائن، بائبل اور قرآن مجید پڑھا دیا تھا وہ خود سکول چھوڑنے جاتے تھے اور  
واپسی پر بھی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ راستہ بھر مجھے کتابوں کی باتیں سناتے رہتے تھے۔ بہت  
بڑے شطرنج باز بھی تھے۔ ہر شام ان کی بیٹھک میں لمبی لمبی بازیاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے لوگ  
آتے تھے۔ انہی مفلکوں میں میری ملاقات اصغر خان کے والد بریگیڈئیر رحمت اللہ شیخ رشید اور  
بھارتی افسان نویس الال ڈاکر سے ہوئی۔ اس دور میں گرمیوں میں کشمیر کا دار الحکومت جوں سے  
سری نگر منتقل ہو جاتا تھا۔ گرمیوں میں میری ماں انکی پڑا کر مجھے سری نگر لے جاتی۔ سری نگر وہ سکول  
میں پڑھاتی تھی۔ اس سکول کی پرنسپل محمودہ احمد علی شاہ جیسی زبردست خاتون ہوتی تھی۔ وہ ایک  
حاصلی عمر کی شاندار عورت تھی۔ اس میں ایسی کشش تھی کہ جو بھی دانشور، شاعر، ادیب یا حس جمال  
سے بھر سیاست دان ان سے ملتا وہ ان سے بار بار ملاقات پر مجبور ہو جاتا۔ یہ شاندار عورت پھر  
زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو میری ماں سے مجھے مانگ لیا۔ یوں میں محمودہ احمد علی شاہ  
کے گھر آ گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض اور سجا سجا یا گھر تھا جس میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک  
اداسی خاموشی اور ویرانی کے ڈیرے تھے۔ بیگم محمودہ اس اداسی کے بیچ بیچ بڑی سی چوٹی کرسی پر  
کتاب پڑھنے بیٹھ جاتی اور میں اس کے کندھے سے کندھا لگا کر چیرانی سے گرد و پیش کو دیکھتا رہتا  
تھا۔ بعض اوقات بیگم محمودہ کا گھر آباد ہو جاتا تھا بے شمار لوگ ان کے پاس آتے یہ لوگ بڑی بڑی  
گاڑیوں میں آتے انہوں نے شاندار سوٹ پہنے ہوتے تھے مگر بیگم صاحبہ کے پاس آ کر خاموشی  
سے بیٹھ جاتے تھے۔ وہ دیوی بن کر جب رساں سے انہیں دیکھتیں تھیں یہ لوگ رات گئے تک  
وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ اس دوران یہ لوگ سگریٹ پھونکتے جاتے قبوہ پیتے رہتے اور سامنے بیٹھی  
دیوی کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔ میں بچہ تھا لہذا مجھے ایک عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ  
سامنے کون ہے میں بیٹھا وہ شخص جو خاموشی سے سگریٹ پھونکتے جا رہا اور جس کے چہرے پر تجھ کی  
کٹی نہیں جی ہوئی ہیں اس کا نام فیض احمد فیض ہے اس کے قریب بیٹھا خوبصورت نوجوان ایم ڈی  
تا شیر ہے اور سلٹی شیر وانی اور ترکی ٹوپی والا شخص غلام محمد صادق ہے اور وہ جو ابھی ابھی سائیکل پر آیا  
تھا لوگ اسے شیخ عبداللہ کہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو اس وقت نہیں جانتا تھا لیکن جب زمانہ انہیں

جائے لگا تو میں نے فوراً نعرہ لگایا میں تو انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ گلیوں میں پیدل پھرا  
کرتے تھے اور انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

میں بارہ برس کا تھا جب مجھے بتایا گیا پاکستان جن چکا ہے یہ کیا ہوتا ہے میں نے بیگم  
محمودہ سے پوچھا انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا 'ابھی تو یہ کچھ بھی نہیں لیکن  
شاید آنے والے وقتوں میں کچھ بن جائے۔' میں ابھی اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے  
جواب تلاش کر رہی رہا تھا کہ ایک دن سری نگر میں فوج آ گئی 'پنڈیا فرسٹ فورس' پھر مجھے بتایا گیا  
کہ اوپر پہاڑوں پر جنگ ہو رہی ہے۔ پاکستان اور بھارت لڑ رہے ہیں۔ میں روز لال چوک پر شیخ  
عبداللہ کو دھارتے ہوئے دیکھتا 'بزدل پاکستانی بھاگ رہے ہیں ہم آزاد ہیں آزاد رہیں گے  
کوئی کشمیری پاکستان کا ساتھ نہیں دے گا وغیرہ وغیرہ۔ پھر شام کو اسی چوک پر گاڑیوں میں لدی  
بیسویں ایشیہ آئیں جن کے کندھوں پر 'پنڈیا فرسٹ فورس' کے بیج بے ہوتے ان بیجوں سے  
خون رس رہا ہوتا تھا۔ پھر شہر میں اعلان ہوا کہ عالم پاکستانیوں نے ہمارے ۳۵ جوانوں کو ہلاک کر  
دیا ہے ہم ان ااشوں کا بدلہ لیں گے وغیرہ وغیرہ۔

شاید وہ ۲۸ء کا کوئی دن تھا جب ہم لوگ ٹرک میں سوار ہو کر سپاٹلکٹ پہنچے اس اجرت  
کی وجوہات کیا تھیں؟ راستے میں کیا سماعتیں برداشت کیں؟ پاکستان آ کر کیا مسائل درپیش  
آئے؟ یہ لمبی اور غیر دلچسپ کہانی ہے بہر حال پاکستان آ کر میرے والدین کے اختلافات طلاق  
تک پہنچ گئے والد نے والدہ کو طلاق دی اور واپس کشمیر چلے گئے وہاں انہوں نے دوسری شادی کر  
لی والدہ نے بھی جلد ہی عقد ثانی کر لیا۔ باقی رہا میں تو میں اپنے بتایا جی کے پاس راولپنڈی آ گیا۔  
میں نے ۵۰ء میں میٹرک کیا۔ والدین سر پر تھے نہیں بتایا جی بیمار رہتے تھے لہذا مجبوراً میں  
نے ۵۰ء ورسکاپ میں 'ٹوپی و سہجو' پر نوکری کر لی میری دودھ پے روزانہ کھواد ہوتی تھی 'کام صبح  
سے رات بارہ بجے تک کرنا پڑتا تھا لیکن مجبوری تھی سو یہ سب کچھ کرنا پڑا لیکن میں نے اس ساری  
تنگی لڑائی اور روزانہ کام کی ساری تنگی کے باوجود پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم جاری رکھی۔

۱۱۶ اکتوبر ۵۱ء کو لیاقت علی خان نے لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ میں  
سری نگر میں محمودہ احمد علی شاہ کے گھر میں لیاقت علی سے مل چکا تھا لہذا مجھے ان کی تقریر سننے کا شوق  
چرا لیا میں صبح سویرے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا ابھی کرسیاں لگائی جا رہی تھیں شامیانے سیٹ کئے  
جا رہے تھے میں جلسہ گاہ پہنچ گیا اور بیچ کے بالکل سامنے پہلی رد میں ایک کرسی پر قبضہ کر لیا۔ چند

مجھے بعد میرے دائیں طرف ایک پٹھان آ کر بیٹھ گیا اس کے ساتھ اس کا چھوٹا سا بیٹا بھی تھا میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ سید اکبر تھا میں اسے سری نگر سے جانتا تھا یہ لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے سری نگر آئے تھے۔ ڈل گیٹ میں رہتے تھے میں ان کے خاندان کے اکثر بچوں کو جانتا تھا میں نے سید اکبر کو سلام کیا اور سری نگر کا حوالہ دے کر گفتگو شروع کر دی وہ مجھے پٹھانوں کے روایتی تپاک سے ملا اور اپنے بیٹے سے میرا تعارف کرایا ہم نے سری نگر کی باتیں شروع کر دیں مجھے وہ گفتگو کا بڑا مہر متحمل مزاج اور پُر خلوص انسان لگا۔ ہم باتوں میں اس قدر محو تھے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ لوگ کب آنا شروع ہوئے پنڈال کب بھرا سٹیج پر مسلم لیگی رہنما کب تشریف لائے اور جلسہ کب شروع ہوا البتہ سید اکبر کبھی کبھی تنکھیوں سے سٹیج کی طرف ضرور دیکھ لیتا تھا۔ پھر جلسہ شروع ہو گیا۔ سٹیج سیکرٹری نے کارروائی شروع کی ایک ایک مسلم لیگی رہنما تالیوں اور نعروں کے شور میں ڈانس پر آتا اور دھواں دھار تقریر جھار کر واپس چلا جاتا یہاں تک کہ وزیراعظم خان لیاقت علی خان کا نام پکارا گیا وہ مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھے ڈانس پر آئے ہاتھ ہلا کر عوام کے نعروں کا جواب دیا جب عوام کا شور تھا تو خان لیاقت علی خان نے کہا "میرے عزیز ہم وطنو! السلام علیکم" اور ساتھ ہی میری بغل میں بیٹھا سید اکبر اٹھا اور "ذبح" سے ریو اور نکال کر لیاقت علی خان پر گولی چلا دی میری آنکھوں کے عین سامنے سید اکبر نے ریو اور کی چھ گولیاں وزیراعظم پاکستان کے سینے میں اتار دیں۔ لیاقت علی خان نے چیخ ماری اور خون میں لت پت ہو کر گر پڑے جلسہ گاہ میں بھگدڑ مچ گئی لوگ اٹھ کر بھاگنے لگے اسی اثناء میں سٹیج پر کھڑے پولیس افسر لوگوں کو پھلانگتا ہوا سید اکبر کے پاس پہنچا سید اکبر نے بڑے تحمل سے اپنا خالی ہسٹول اس کے ہاتھ میں دے دیا لیکن پولیس افسر نے اسے گولی ماری سید اکبر کے منہ سے بڑی کرناک چیخ نکلی اور وہ میرے قدموں میں گر کر ٹپنے لگا اتنے میں وہاں پر چھبی بردار رضا کار پہنچ گئے پولیس افسر نے انہیں دیکھ کر حکم دیا "اس ذلیل انسان کے ٹوٹے ٹوٹے ٹوٹے ٹوٹے ٹوٹے ٹوٹے ٹوٹے ٹوٹے ٹوٹے رضا کاروں نے اپنی برچھیوں سے سید اکبر کی لاش کا قہر بنا دیا۔ چند لمحے بعد وہاں سید اکبر کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دور تک پھیلی ہوئی لیکریں الٹی سیدھی کرسیاں شامیانوں کی ٹوٹی تباہیں تاحد نظر ٹکھری ٹوپیاں اور جوتے پڑے تھے جبکہ سٹیج پر "سابق" وزیراعظم کی آڑھی ترچھی لاش اور اس کے بالکل سامنے میں سید اکبر کا بیٹا اور وارث خان کا ایک بے ذہول قصاب ساکت کھڑے تھے چیخ میرے ہونٹوں پر جمی تھی اور آنسو سید اکبر کے بیٹے کی چٹکوں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پولیس

آفیسر نے انکی کھوپڑی کوٹھو کر ماری اور میرے قریب آ کر ریو اور میری طرف لہرا کر کہا "یہ لو ہسٹول اور جب تم سے پوچھا جائے تو کہنا سید اکبر بھاگ رہا تھا لیکن میں نے اسے پکڑ لیا تمہیں پیسے ملیں گے۔" یہ لفظ میں نے سنے ضرور لیکن میرے سادگت جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی پولیس آفیسر میری آنکھوں میں سکتے کی کیفیت پڑھ کر آگے بڑھا اور اپنا ہسٹول وارث خان کے قصاب کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔۔۔۔۔ بعد ازاں اس قصاب کو اس بہادری پر ۲۰ ہزار روپے انعام ملا لیکن میں ایک عرصے تک ہسٹول پر پڑا رہا، موت کا یہ پہلا تجربہ تھا جو میرے شعور اور لاشعور پر بری طرح درج ہو گیا۔

۱۹۵۲ء میں مجھے ایئر فورس میں کمیشن مل گیا۔ چھ ماہ تک مجھے چک لالہ میں ٹریننگ دی جاتی رہی اس وقت یہ سارا کام ڈیج خواتین کرتی تھی۔ یہ لمبی لمبی خوفناک سی خواتین تھیں جو معمولی معمولی غلطی پر ہماری باقاعدہ ٹھکانی کر دیتی تھیں۔ میں ٹیک آف اور فلانگ میں تو "ماسٹر" ہو گیا لیکن لینڈنگ کے دوران مجھ سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی تھی جس پر میری ڈیج انسٹرکٹر مجھے "ٹھنڈے" مارتی تھی۔ یوں میں ایئر فورس سے "فیڈ اپ" ہو گیا اور چھوڑ کر واپس آ گیا۔ میں وہاں سے گرا تو سیدھا "کوہ نور ملز" میں آ اٹھا یہ پبلک ریلیشن آفیسر کی نوکری تھی ساڑھے پانچ سو روپے تنخواہ تھی۔ میرے پاس سائیکل تھی اور میز سے میز سے راستے تھے۔ یہیں سے میری زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔

ایک دن مجھے مل کے سیکرٹری مقبول حسین نے بلا کر کہا ہمارے ایک دوست لندن سے آئے ہیں انہیں پکھری سے کچھ کاغذات چاہئیں تفصیل اس لفافے میں بند ہے آپ پکھری سے لا کر میرے گھر پہنچا دیجئے گا۔ میں نے فوراً سائیکل لی اور حکم کی بجا آوری کے لئے عدالت چلا گیا کام لمبا تھا لہذا تین چار گھنٹے لگ گئے۔ شام کو میں مقبول حسین کے گھر گیا تو ڈرائنگ روم میں ایک خوش شکل جوان بیٹھا تھا اس کا استری شدہ سوٹ تازہ شیو اور میچنگ ٹائی اس کے اعلیٰ ذوق کی ترجمان تھی میں سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں مقبول صاحب افراتفری میں اندر سے نکلے اور مجھ سے کہا۔ "یہ میرے بیٹے ہیں آپ یہ کاغذات انہیں دے دیں" اور ساتھ ہی اندر بھاگ گئے میں نے حیرانی سے مہمان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولے "ان کے گھر بیٹا پیدا ہونے والا ہے سب کام اللہ کی مہربانی سے خوش اسلوبی سے ہو جائے گا یہ خواہ مخواہ پریشان ہیں۔" ان کی بات سن کر میں حیران ہو گیا کیونکہ کوئی شخص اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ فلاں شخص کے گھر چند لمحے بعد بیٹا پیدا ہوگا۔ میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ مقبول صاحب اندر سے خوش خوش نکلے اور کہا "بشیر

صاحب مجھے مبارک دیں اللہ نے مجھے پیارا دیا ہے۔" میر بشیر نے مسکرا کر گردن بلا دی مقبول صاحب میری طرف مڑے اور کہنے لگے شمیم، بشیر صاحب دنیا کے نامور پامسٹ ہیں انہیں ہاتھ دکھا کر چانا۔" میں نے اسے بھی حکم حاکم سمجھا اور جانے سے قبل اپنے دونوں ہاتھ میر بشیر کے سامنے پھیلا دیئے وہ چند لمحوں تک میرے ہاتھوں پر جھک رہے اور پھر سیدھے ہو کر کہنے لگے "شمیم صاحب آپ کو اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے نوازا رکھا ہے آپ فوراً ہماری فیلڈ میں آ جائیں اور میں نے ایک قہقہہ لگایا اور سائیکل پر بیٹھ کر سیٹی بجاتا ہوا گھرا گیا۔

تھوڑے عرصے بعد مجھے لندن سے ایک پیکٹ موصول ہوا جس سے پامسٹری کی چند کتابوں کے ساتھ میر بشیر کا مختصر سا خط نکلا۔ "جناب آپ نے ابھی تک پامسٹری سیکھنا شروع نہیں کی؟" میں نے کتابیں اور خط ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ عرصے بعد بیوی کے ساتھ میرے تعلقات خراب ہو گئے بگاڑ بڑھا اور نوبت طلاق تک آ گئی تو میں پریشانی کی حالت میں میر بشیر کی بھیجی کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں کچھ سمجھ نہ آئی لیکن میں پڑھتا چلا گیا ایک آدھ مہینے کی مشقت کے بعد مجھے بنیادی باتوں کا پتہ چل گیا کچھ عرصے بعد میر بشیر نے مجھے مزید کتابیں بھیج دیں میں وہ بھی "چٹ" کر گیا تو ہاتھوں میں دوسروں کے ہاتھ دیکھنے کی کھلی سی ہونے لگی۔ چند لوگوں کے ہاتھ دیکھ ڈالے کچھ سچ ثابت ہوا کچھ غلط نکلا لیکن اس کام میں سزا آنے لگا اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ہمارے سیکرٹری کے بھائی کا ایک کیس کیمل پور (انٹک) کی عدالت میں چل رہا تھا وہاں کا سیشن جج مقبول حسین کا واقف کار تھا اسے پامسٹری میں دلچسپی تھی میں جب وہاں جاتا تو اس کے چیمبر میں اکثر میری ملاقات کیمل پور کالج کے ایک نوجوان لیکچرار اور جیل سپرنٹنڈنٹ جو کرٹل تھا سے ہو جاتی وہ تینوں سر جوڑے دست شناسی پر گفتگو کر رہے ہوتے میں ایک کونے میں بیٹھ کر سنتا رہتا۔ ایک دن ان تینوں نے فیصلہ کیا کہ آج عدالت میں قتل کا جو مجرم پیش ہو رہا ہے اس کا ہاتھ دیکھا جائے۔ وہ تینوں اٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ عدالت کے احاطہ میں بیٹھ پر وہ مجرم بیٹھا تھا ہم چاروں باری باری اس کے ہاتھ پر جھک گئے۔ ان تینوں کا متفقہ فیصلہ تھا یہ بے گناہ ہے اور سچ جائے گا جبکہ میں نے کہا یہ بے گناہ ہے لیکن پھانسی پر چڑھ جائے گا۔ ان تینوں نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ بھی پامسٹ ہیں؟" میں نے فوراً لٹی میں سر ہلا دیا تو ان تینوں نے قہقہہ لگایا اور ہم واپس چیمبر میں آ گئے۔ وہ نوجوان لیکچرار معروف پامسٹ ایم اے ملک تھا بعد ازاں اس بے گناہ شخص کو پھانسی کی سزا ہو گئی تو سیشن جج نے مجھے بلا کر پوچھا

"آپ نے یہ پیش گوئی کس بنیاد پر کی تھی؟" میں نے اس کے ہاتھ کا وہ سائن بتا دیا جس پر ان تینوں کی نظر نہیں گئی تھی۔ یوں میری پہلی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اس سے دست شناسی سے میری رغبت میں اضافہ ہو گیا میر بشیر سے خط و کتابت شروع ہو گئی وہ لندن سے میری رہنمائی کرنے لگے ان کے تجربے میں جو بھی حیرت انگیز کیس آتا وہ مجھے بھیج دیتے ساتھ ہی ہر نئی کتاب بھی مجھے پارسل کر دیتے اور میں کتاب پڑھ کر انہیں اپنی رائے بھیج دیتا۔

ایوب خان کے مارشل لاء کے کچھ عرصے بعد دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ ابھی شہر آباد نہیں ہوا تھا۔ عمارتیں اور رہائش گاہیں نہ ہونے کے برابر تھیں چنانچہ حکومت نے عارضی کام چلانے کے لئے تمام ریست ہاؤسز اور فالتو عمارتیں خالی کر دیاں اور کڑیروں کو دے دیں۔ کوہ نور کا ریست ہاؤس بھی اس حکم کی زد میں آ گیا اور وہاں ایک نوجوان وزیر آٹھرا۔

میں اس ریست ہاؤس کا انچارج تھا لہذا ہر دوسرے تیسرے دن اس نوجوان وزیر سے میری ملاقات ہو جاتی میں اس کی رعب دار شخصیت خوبصورت انگریزی اور سلیقے سے بہت متاثر ہوا اس کی میموری بڑی شاندار اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس قسم کی ایک ملاقات کے دوران میں نے اس کا ہاتھ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا "آریو اے پامسٹ" میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اس کا ہاتھ بہت ہی عجیب تھا۔ پہلی انگلی اتنی لمبی تھی کہ دوسری کی انتہا کو چھو رہی تھی یہ سائن اس کے تفاخر، غرور، حصول طاقت اور اختیار کی شدید خواہش ظاہر کر رہا تھا جبکہ اس کے دماغ کی لکیر شمس کی طرف جھکی ہوئی تھی ہتھیلی کے عین درمیان میں ایک بڑا سا کراس اور زندگی کی لکیر کے ساتھ زہرہ پر مربع کا نشان تھا میں نے بڑے آرام سے کہہ دیا "آپ ترقی کے آسمان تک جائیں گے۔ پورے ملک میں آپ کا کوئی حریف نہیں ہوگا لیکن آپ کی موت جیل میں ہوگی اس نوجوان نے غصہ سے اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور مجھے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ دنیا اس شخص کو ذوالفقار علی بھٹو کے نام سے جانتی ہے۔

جنگ اخبار میں میرا ایک دوست ہوتا تھا "شہزادہ" اس کی والدہ ایرانی تھی اس کے پاس آسٹریلوی اور پامسٹری کے چند خاندانی "نسخے" تھے میں اس کے پاس اکثر جایا کرتا تھا بڑی شفیق خاتون تھیں میری بڑی رہنمائی کرتی تھیں وہیں ایک روز میری ملاقات پاکستان کے نامور صحافی اور شاعر رئیس امر دہوی سے ہو گئی۔ بات دست شناسی سے چلی تو ایک دوسرے کے ہاتھ دیکھنے تک جا پہنچی میں نے دیکھا ان کی ہتھیلی کے درمیان بھی ایک کراس ہے جو ان کی اچانک

موت کی نشاندہی کر رہا ہے میں نے ان سے کہا کہ امر وہی صاحب آپ قتل ہو جائیں گے انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا ”نو جوان مجھے کون مارے گا میں سیاست دان ہوں نہ بڑا آدمی رہی مال و دولت کی بات تو میں صرف نام کا رکھیں ہوں۔“ میں خاموش ہو گیا اس کے بعد ان سے اکثر ملاقاتیں رہنے لگیں ایک روز وہ کہنے لگے چلو تمہیں اپنے ایک دوست سے ملانا ہوں میں ان کے ساتھ چل پڑا وہ مجھے ایک بڑے سے دفتر میں لے گئے جہاں ایک بھاری بھر کم کرسی پر ڈھلتی عمر کا ایک پٹھان بیٹھا تھا۔ رئیس صاحب نے میرا تعارف کرایا تو اس نے ہنس کر کہا ”میں بھی پاماسٹری پڑھتا رہتا ہوں ساتھ ہی اس نے چند بالکل نئی کتابوں کے نام کنوا دیئے۔ جو ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزری تھیں گپ شپ کے بعد جب انہوں نے مجھے ہاتھ دکھایا تو میں نے دیکھا اس کی زندگی کے آخری دس بارہ سال سب سے زیادہ شاندار تھے اگر وہ کسی شاہی خاندان کا فرد تھا تو اس عرصہ حیات میں اس کے بادشاہ بننے کے امکانات ہوتے ہیں نے بڑے آرام سے تمام سامان دکھائے اور کہا جب آپ کی عمر ۷۲ سال ہوگی تو شاید آپ ”انسرائے“ بن جائیں تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا برخوردار ۶۰ سال کے بعد تو بیوی بھی دھکے دے کر باہر نکال دیتی ہے اور تم مجھے ۷۲ برس میں سربراہ مملکت بنا رہے ہو“ میرے پاس اس کے ”جوک“ کا کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ ابھی ۷۲ سال کے درمیان کئی وہائیاں حائل تھیں اور وقت کو تو وقت ہی ثابت کر سکتا ہے میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر رئیس صاحب کے ساتھ چلا آیا۔ لوگ اس شخص کو غلام اسحاق خان کے نام سے جانتے ہیں۔

جب ۸۸ء میں وہ صدر بنے تو میں تازہ تازہ بھارت سے آیا تھا میرے ایک دوست مجھے ان کے پاس لے گئے انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور کہا کچھلی ملاقات کے بعد جب بھی میری نظر اپنے ہاتھ پر پڑتی میں ہنس پڑتا لیکن اب میں ایوان صدر میں بیٹھ کر اسے دیکھتا ہوں تو غمزہ ہو جاتا ہو کیونکہ اگر قدرت نے بہت پہلے یہ فیصلہ کر رکھا تھا تو اس نے کچھ اور بھی تو سوچا ہوگا اور وہ کتنا خوفناک کتنا سنگین ہے مجھے اس کے بارے میں علم ہی نہیں!“

ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران لیاقت باغ میں آل پارٹیز جلسہ ہوا اس میں غفار خان بھاشانی اور سہروردی سمیت دوسرے تمام اپوزیشن رہنماؤں نے خطاب کرنا تھا لیکن جلسہ شروع ہونے سے قبل ہی دائیں بازو کے بعض عناصر نے پنڈال الٹ دیا سٹیج پر ٹائمر اور گندے انڈوں کی بارش ہوگئی اور سارے لیڈروہاں سے بھاگ گئے اس ہنگامے کے دوران میاں افتخار (پاکستان ٹائمز والے) اور میں غفار خان کو چلے سے باہر نکال لائے راستہ بھر ہمیں گندے انڈے

پڑتے رہتے لیکن ہم نے کسی نہ کسی طرح انہیں ان کے ایک وکیل دوست کے گھر پہنچا دیا۔ گھر کے کوریڈور میں داخل ہوتے ہی غفار خان نے عجیب حرکت کی وہ بھولی پھیلا کر کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہا ”یا پروردگار میرے ان تمام مجرموں کو معاف کر دے“ یہ بات میرے لئے باعث حیرت تھی کیونکہ میں نہ صرف غفار خان کو ”کافر“ بلکہ ملک دشمن سمجھتا تھا۔ غفار خان کی دعا ختم ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا ”خان صاحب آپ تو نظریہ پاکستان کے مخالف تھے پھر مسلم لیگیوں کے لئے بخشش کی دعا کیوں مانگ رہے ہیں۔“ انہوں نے میری بات غور سے سنی اور کہا ”میرے بچے میں واقعی نظریہ پاکستان کا مخالف تھا لیکن اب پاکستان بن چکا ہے اور میں اسی ملک میں رہ رہا ہوں لہذا پاکستان کی حفاظت میرا ایمان ہے۔“ بہت بعد ۷۹ء۔۸۰ء میں سری نگر ہسپتال میں میرے کمرے کے ساتھ غفار خان کا کمرہ تھا میں ان سے ملنے گیا تو وہ بہت علیل تھے میں نے انہیں پرانی ملاقات کا حوالہ دیا تو وہ مجھے پہچان گئے بڑی شفقت سے ملے ماضی کی باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے کہا ”میرے بچے میں برملا اعتراف کرتا ہوں قائد اعظم کا خیال درست تھا ہم سب غلطی پر تھے۔ دو قوی نظریہ حقیقت ہے مسلمان کبھی ہندوؤں کو اپنا بھائی نہیں بنا سکتے کاش قائد اعظم اب ہوتا تو میں خود اس کے پاس چل کر جاتا۔“ میں نے دیکھا اس سن رسیدہ شخص کی مدہم پڑتی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ”اعتراف جرم“ کی لرزش تھی۔ لیکن کیا ندامت کے چند آنسو تاریخ کے داغ دھو سکتے ہیں۔ میں ایک طویل عرصے تک سوچتا رہا۔

انہی دنوں ایوب خان سے میری ملاقاتیں شروع ہو گئیں ایوب خان اپنے دل میں صنعت کاروں کے لئے بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے۔ کوہ نور ملز کے مالک سہگل تھے لہذا مقبول حسین اور میں سہگل خاندان کے بیٹھے ہوئے تحفے ایوب خان کو پہنچانے جاتے تھے۔ ایوب کی ایک عجیب عادت تھی وہ سرکاری تقریبات اور اجلاس میں جس قدر سنجیدہ نظر آتے اپنی نجی محفلوں میں وہ عام لوگوں کے سامنے اتنے ہی ”کھلے ڈھلے“ ہو جاتے ”خوب گپ لڑاتے“ لطیفے سناتے، قہقہے لگاتے، میرے سامنے کی بات ہے کئی بار بھٹو آئے ان کے پیچھے کھڑے رہے اور پھر ”ڈیڈی“ کہہ کر ایوب سے لاڈ شروع کر دیا اور پھر چلے گئے۔ اسی قسم کی ایک ملاقات کے دوران جب انہوں نے امریکہ کے متوقع دورے کا ذکر کیا تو میں نے انہیں ”جین ڈکسن“ سے ملاقات کا مشورہ دیا۔ انہوں نے ہامی بھر لی۔ دورے سے واپسی کے بعد انہوں نے مجھے بلا کر بتایا کہ ”جین ڈکسن“ سے ان کی ملاقات ہوئی ”بڑی عجیب عورت ہے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھیں بند کیں اور کہا ۶۸ء تک آپ

کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے پھر بہت بعد آپ کا ایک بیٹا سیاست میں آئے گا اور بہت ترقی کرے گا۔ ۲۰۰۰ء کے بعد پاکستان کا بہترین دور شروع ہوگا اسی دوران وہ نئی حکومت بھی معرض وجود میں آئے گی جو ملک کی تاریخ کی سب سے مضبوط ایماندار اور مخلص حکومت ہوگی شہر بھی اس دور میں آزاد ہوگا۔“

میری والدہ کی دوسری شادی بھی ناکام ہو گئی تو وہ سری نگر میں تنہا ہو گئیں انہوں نے مجھے بلاوا بھیجا میں نے بڑی مشکل سے پاسپورٹ حاصل کیا اور اپنے کشمیر واپس چلا گیا۔ وہاں میں نے سری نگر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا کچھ ہی عرصے میں ۶۵ء کی جنگ پھڑ گئی جس کے بعد پاکستان واپس مشکل ہو گئی۔ بیگم محمودہ احمد علی شاہ ابھی تک سری نگر میں تھیں میری ان کے ساتھ ”ایسوی ایٹن“ بھی اسی طرح تھی لہذا میرا زیادہ تر وقت ان کے گھر گزرنے لگا اس دور میں بھی ان کی مقبولیت کا گراف ماضی ہی کی طرح اونچا تھا۔ بھارت کے تمام ناپ کلاس سیاستدان، بیورو کریٹ، شاعر، ادیب اور دانشور اسی طرح خاموشی سے اس دیوی کے سامنے آ بیٹھے اور وہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر بڑی نخوت سے انہیں دیکھتی رہتی۔ وہیں ایک روز انہوں نے کتاب سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا ”تم بنارس یونیورسٹی اپلائی کیوں نہیں کرتے؟“ اور ساتھ ہی انہوں نے نظریں پھیر کر کتاب پر گاڑ دیں۔ جیسے ابھی کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو لیکن میرے لئے سوچ کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ میں اگلے چند روز میں زور اور جمع کرتا رہا جب ”حالات“ حوصلہ افزا ہوئے تو بس پکڑ کر وادی سے نکلا اور بنارس جا پہنچا۔ اب میرے سامنے ”فنی علوم“ کی قدیم ترین درس گاہ تھی۔ ایسی درس گاہ جس میں آج تک مسلمان تو دور کی بات برہمنوں کے سوا کسی ذات کے شخص کو داخلہ نہیں ملا۔ میں ڈرتا ڈرتا پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کھدر کے سفید کپڑے پہنے ماسٹے پر قشقہ لگائے ایک اعلیٰ شخص پان چار ہاتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”پرنسپل آپ ہیں؟“ تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں مرکزی ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھنے لگا تو اس نے کہا ”نہیں بیٹے تم ادھر میرے پاس آ جاؤ“ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اس نے دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی اور پھر خالی انٹیلیوں سے میز پر لکیریں کھینچیں خانے بنائے اور ان میں کچھ ہندسے کچھ حروف اور کچھ سائنز بنا کر کہا ”تم پہاڑ سے آئے ہو ہاتھ دیکھاؤں کا علم سیکھنا چاہتے ہو لیکن برہمن نہیں۔“ میں اس کے یہ الفاظ سن کر برف ہو گیا۔ اس نے ایک اور لکیر کھینچی اور کہا ”بھگوان تم پر مہربان ہے تم یہ ضرور سیکھ لو گے۔“ اسی اثناء میں پرنسپل اندر آ گیا۔ اس اجنبی نے کھڑے ہو کر کہا ”ہاں یہ وہ لڑکا ہے جس کے

بارے میں تم سے بات کر رہا تھا میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں“ ساتھ ہی وہ میری طرف مڑا اور کہا ”کیوں بے تم گوشت کھاؤ گئے، عیدیں مناؤ گے، مسجدوں میں جاؤ گے؟“ اور میں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا ”ہوں دیکھو کتنا فرمانبردار ہے آپ اس کو داخلہ دے دیں۔“ اور یوں میں اس اجنبی کے توسل سے اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو گیا جس میں آج تک کسی مسلمان کا گزر تک نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس اجنبی کے حوالے کر دیا گیا۔ اچاریہ کسم اس کا نام تھا اور اس کا شمار بنارس کے چوٹی کے نجومیوں اور دست شناسوں میں ہوتا تھا۔

بنارس یونیورسٹی کے علوم مخفی کے شعبے کا اپنا ہی ایک نظام تھا۔ یہاں کسی بھی طالب علم کو بارہ تیرہ برس سے پہلے ایم اے کی ڈگری نہیں دی جاتی۔ طالب علم کو شروع میں کسی بڑے ”اچاریہ“ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جو انہیں اپنی نگرانی میں ٹریننگ دیتا ہے۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا ہے توں توں وہ یونیورسٹی میں آ کر اپنے دوسرے ہم مکتبوں کو لیکچر دیتا ہے۔ میں جس ”اچاریہ“ کے ساتھ وابستہ تھا اس کے پاس دس ہزار حیرت انگیز ہاتھوں کی ایک قلمی کتاب تھی جو اس نے خود تیار کی تھی۔ مجھے اس کتاب سے استفادہ کا موقع ملا پھر ہمیں ”دی ٹی آر“ پر ہاتھوں کی سلائیڈز دکھانی جاتیں۔ ماں کے پیٹ میں بچے کے ہاتھ کی ابتدائی ساخت پھر اس کی پرورش انٹوں کا وجود میں آنا بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہاتھ میں آنے والی تبدیلیاں یہ سب کچھ مجھے سکھایا گیا۔ وہاں مجھے دنیا کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ خلا نورونیل آر مسٹر انک سمیت دنیا کے مشہور سائنس دان سیاست دان، حکمران انقلابی اور مجرم وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال اس یونیورسٹی میں میرا تیرہ برس کا قیام میرے لئے اس علم کے نئے نئے دروازے کھولتا چلا گیا۔

میں ایک بار چھٹیوں میں سری نگر گیا۔ یہ غالباً ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ ایک شام محمودہ احمد علی شاہ کے گھر اندرا گاندھی آ گئی۔ کھانے کے دوران بیگم محمودہ نے میرا ان سے تعارف کرایا تو انہوں نے ہاتھ دکھانے کی خواہش ظاہر کی۔ کھانے کی اس میز پر جب بھارت کی سب سے بڑی رہنما نے اپنے ہاتھ کھول کر رکھے تو ان پر کراس ہی کراس تھے۔ لائن آف مرکزی لائف لائن کو کاٹ رہی تھی جو اس کی بیوگی ظاہر کر رہی تھی۔ ہتھیلی کے درمیان کراس اچانک موت کا اعلان تھا۔ زہرہ سے اترتی لائنیں قریبی عزیز (بیٹے) کی موت ظاہر کر رہی تھیں۔ میں نے سب کچھ صاف صاف کہہ دیا تو وہ ناراض ہو گئیں۔ بڑے عرصے تک وہ جب بھی بیگم محمودہ سے ملتیں میری ”گستاخی“ کا ذکر ضرور کرتیں۔ یہاں تک کہ میری پیش گوئی کے مطابق اس کا بیٹا ہلاک ہو گیا۔

بیگم محمودہ تعزیت کے لئے گئیں تو پہلی مرتبہ اندرا گاندھی نے نہ صرف سنجیدگی سے میرا ذکر کیا بلکہ ساری پیشگوئیاں لکھ کر بھجوانے کی درخواست کی۔ میں نے محمودہ بیگم کے کہنے پر سب کچھ ٹاپ کر کے بھیج دیا۔ اندرا گاندھی کے قتل پر جب اس کے کاغذات سے میرا یہ خط برآمد ہوا تو بھارتی خفیہ اداروں نے میری انکوائری شروع کر دی لیکن انہیں مجھ سے کیا ملنا تھا۔

۸۲ء کی بات ہے دہلی میں ایشین گیمز ہو رہی تھیں۔ میں چند دوستوں کے ساتھ باسکٹ بال کا میچ دیکھ کر سٹیڈیم سے نکلا تو گیٹ پر راجیو گاندھی اپنے بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہم بیگم محمودہ کے حوالے سے ایک دوسرے سے شناسا تھے۔ لہذا ملاقات ضروری تھی۔ ہم نے وہیں گپ شپ شروع کر دی۔ میں نے اس سے ہاتھ دکھانے کی فرمائش کی تو اس نے کارڈ لیس فون اپنے پی اے کو پکڑا کر ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دیکھا وہ مقدّر کا سکندر ہے۔ سن لائن مارز کی طرف جارہی تھی، لیکن مرکزی لائن لائف لائن کو کاٹ رہی تھی اور برین لائن ہارٹ کو۔ میں نے کہا جناب آپ آئندہ تین برس تک اس ملک کے وزیراعظم ہونگے لیکن ہونگے صرف ایک ٹرم کے لئے۔ عمر آپ کی بہت کم ہے اور آپ کی وفات بھی ویسے ہی ہوگی جیسے آپ کی والدہ کی۔ راجیو گاندھی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ”بھگوان مانتا جی کی عمر لمبی کرے میں ڈرائیور ہی ٹھیک ہوں۔“ وہیں نزدیک ہی کوئی اخباری رپورٹر بھی تھا لہذا اگلے ہی روز میری یہ ملاقات اور پیشگوئیاں اخبار میں شائع ہوئیں جس سے بھارت میں خاصا شور ہوا۔

۸۳ء میں مجھے بنارس یونیورسٹی نے دست شناسی میں ایم اے کی ڈگری دے دی تو سب سے پہلے میرے بشیر نے مجھے مبارکباد کا خط لکھا۔ اس وقت میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑے ہو کر میں نے سوچا اس سے قبل کہ میرا فن روزگار کے گھن چکر میں پھنس جائے مجھے مزید علم حاصل کرنا چاہئے تو دوستوں! میں وہیں سے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ میں مدراس کے اس مندر میں گیا جہاں ”اکستھ ناڑی“ پر مندر میں آنے والے ہر شخص کا احوال درج ہوتا ہے وہاں میں نے اپنی ناڑی پڑھی پھر کیرالہ گیا وہاں کے ماہرین کے پاؤں چھوئے جو چند ایک ”نئے“ ہاتھ آئے گرو سے باندھ لئے وہاں سے نیپال کے یوگیوں سے ملاقات کی جب تھک بار کر واپس آیا تو والدہ کا انتقال ہو چکا تھا سو تھلا بھائی ہندو لڑکی سے شادی کر کے غائب ہو چکا تھا۔

ابھی اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ کال بلایڈ خراب ہو گیا۔ ہسپتال گیا تو پیچھے دروں میں گینسر نکل آیا پھر ایک بیماری سے دوسری بیماری ایک دکھ کے بعد دوسرا دکھ غرض ۱۳ ماہ

ہسپتال میں بے یار و مددگار پڑا رہا جب کچھ صحت سنبھلی تو سوچا اب کہاں جاؤں..... اندر سے آواز آئی پاکستان۔ صرف وہی سر زمین ایسی ہے جو ہر بے سہارا کو سہارا دے سکتی ہے۔

۸۸ء میں واپس پاکستان آ گیا مجھے یہاں رہنے کی اجازت کیسے ملی یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ بہر حال مجھے پاکستانی تسلیم کر لیا گیا۔ فروری یا مارچ میں ہمارے ایک دوست مسعود ہاشمی روپڑی نے مجھے ایک پرنٹ دکھایا شمس کی انگلی کے بالکل نیچے دل کی لکیر پر کا لائن تھا، برین لائن سن کی طرف جارہی تھی سر پر دائرے کا نشان تھا چوڑیوں پر تل کا نشان تھا میں نے مسعود ہاشمی کو بتایا یہ شخص کسی سٹیٹ کا ہیڈ ہے۔ اس کا ایک بچہ اینارمل ہے اور اس کی موت ۶۲ سال کی عمر میں پانی میں ڈوبنے سے ہوگی۔

مسعود ہاشمی نے کہا لکھ کر دے دو۔ میں نے دے دیا۔ ٹھیک دو ماہ بعد مجھے یہ پتہ چل کہ وہ پرنٹ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کا تھا۔ وہ ۱۷ اگست ۸۸ء کو بہاولپور میں دریا کے کنارے جاں بحق ہو گئے لیکن میں نے دو برس بعد یہی ہاتھ ایک جیتے جاگتے انسان کی کلائی سے منسلک دیکھا وہی لکیریں وہی ابھار اور وہی سائنز۔ میں نے کہا آپ بھی اپنے والد کی طرح بہت اوپر جائیں گے آپ کا تیسرا بچہ اینارمل ہوگا اور آپ بھی اپنے والد ہی کی طرح جاں سے جائیں گے اس ہاتھ کا نام اعجاز الحق تھا۔

نومبر ۸۹ء میں جب راجیو گاندھی نے لوک سبھا میں ”مڈ ٹرم الیکشن“ کا اعلان کیا تو اس کے ایک ساتھی نے کھڑے ہو کر کہا آپ کو معلوم ہے آپ نہیں جیت سکتے تو پھر آپ ہمیں کیوں مردا ہے ہیں۔ اسمبلی میں ان الفاظ سے ہنگامہ ہو گیا۔ دوسرے ارکان نے اس دعویٰ کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا ”یہ بات بھی اسی پامست نے کہی تھی جس نے پائلٹ راجیو گاندھی کو وزیراعظم بننے کی خوشخبری سنائی تھی۔ راجیو دوسری بار وزیراعظم نہیں بن سکتے ان کی عمر بھی کچھ زیادہ لمبی نہیں۔“ ارکان کے پوچھنے پر اس شخص نے لوک سبھا میں میرا نام لے لیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ پامست آج کل پاکستان میں ہے۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد جب راجیو گاندھی قتل ہو گیا تو پاکستان کے بعض خفیہ اداروں نے میری انکوائری شروع کر دی یہ وہ تین ماہ میری زندگی کا بڑا پریشان کن دور تھا۔

اب آٹھ برس سے پاکستان میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت دی اس ملک کا شاید ہی کوئی بڑا سیاستدان، بیوروکریٹ، فوجی افسر یا سفارتکار ہوگا جس سے میری ملاقات نہ ہوئی، جس نے میری ”سروس“ نہ لی ہو۔ مزے میں ہوں کتابیں پڑھتا رہتا ہوں لوگوں سے ملتا رہتا ہوں

سارا دن مصروفیت میں گزر جاتا ہے لیکن جب رات ہوتی ہے تو جنوں کا وہ درویش میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے جو سارا دن کھیاں اوڑھے تھمڑے پر بیٹھا رہتا تھا اور ایک سہا سا شرمیلہ لڑکا کھڑکی سے اسے دیکھتا رہتا تھا اور جنوں کی ایک دوپہر کو جب وہ لڑکا ہمت کر کے اس کے سامنے کھڑا ہوا تو اس نے ”پیر بوٹی“ جیسی آنکھوں سے گھور کر کہا ”تو بھی دیکھے گا تو بھی“ اور اس کے بعد وہ لڑکا دیوانے کے الفاظ پہلے سے باندھ کر چلا آیا اور ایک عرصے تک ان لفظ کی گرہ اس سے نہ کھل سکی۔ لیکن جب اس کی فگارا نکلیاں کا گر ہونے لگیں تو انسانی مقدوریت بن کر اس کی مٹھی میں آگیا جسے اس نے جس قدر سنبھالنے کی کوشش وہ اسی قدر گرفت سے سرکنا چلا گیا اور اب جبکہ وہ موت کی ویلیز پر کھڑا ہے تو اس کی مٹھی بالکل خالی ہے۔ اور وہ سوچتا ہے کاش دیوانے کا فرمایا ہوا اسی طرح اس کے پلو سے بندھا رہتا اور وہ آگہی کے دکھ سے آزاد خاموشی سے زندگی گزارتا چلا جاتا۔ لیکن وہ یہ بھی تو سوچتا کہ کیا اس کائنات میں انسانی خواہش کی بھی اہمیت ہے؟

• • •

(شیم قریشی صاحب نے جولائی ۲۰۰۵ء کو انتقال فرما گئے۔ میں نے ان کے انتقال پر روزنامہ جنگ میں جو کالم تحریر کیا میں یہ کالم بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔)

### تھوڑی دیر بعد کوشش کیجئے گا

وہ ہمیشہ کپ خالی کرتے تھے اور کچھ تھوڑی قیاسی باتیں کرتے تھے۔ اس سے مراد ناگناہ ہے۔ ہذا ان کے سامنے شربت کا گلاس رکھا جائے یا پائے کا کپ وہ ہمیشہ اسے خالی کر کے اٹھتے تھے۔ لیکن پانچ دن پہلے انہوں نے آدھا کپ چھوڑ دیا میں نے ذرا دیر کئے کی درخواست کی وہ مسکرا کر بولے ”بیٹا تھوڑی سی جلدی ہے آج عاف کرو۔“ میں نے عرض کیا۔ ”آپ کو ذرا سیور چھوڑ دے گا۔“ وہ اٹھے اور کاندھوں کی فائل اٹھا کر بولے۔ ”نہیں بیٹا ذرا سا تو سفر ہے میں پیدل جانا چاہتا ہوں۔“ میں خاموش ہو گیا وہ دفتر سے باہر نکلے میں ان کے پیچھے پیچھے باہر آیا انہوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پیدل چلنے پڑنے باہر ہلکا ہلکا اندھا رہا تھا دو میرے سامنے چلتے چلتے اندھیرے میں گم ہو گئے اگلی شام میرا دل گھبرا ہوا تھا میرا فون بجایا پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا دوسری طرف لمبی خبر ہے وہی ہوا میں نے فون اٹھایا تو کسی صاحب نے اطلاع دی۔ ”شیم قریشی صاحب رخصت ہو گئے ہیں۔“

شیم قریشی صاحب ایک عجیب شخصیت تھے وہ جنوں میں پیدا ہوئے ان کے

والدین میں علیحدگی ہوئی ان کی والدہ انہیں سرینگر کے انہیں وہ کالج میں پڑھاتی تھیں والدہ نے دوسری شادی کر لی انہیں کالج کی پرنسپل نے گود لے لیا وہ اپنے زمانے کی ایک مشہور خاتون تھی ان کے کمر شیخ عبداللہ فیض احمد فیض ایم ڈی تھے اور نہرو کا آنا جانا تھا۔ شیم قریشی صاحب نے بچپن میں ان شخصیات سے میل ملاقات شروع کر دی۔ پاکستان بنا تو وہ راولپنڈی آ گئے اور ایک مزدور کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا ۱۹۵۱ء میں وہ لیاقت باغ گئے ان کے ساتھ ایک بھٹان بیٹھا تھا یہ بھٹان سید اکبر تھا شیم قریشی صاحب کے سامنے لیاقت علی خان نے جان جان آفرین کے حوالے کی اور ان کی آنکھوں کے سامنے پریس نے سید اکبر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا انہوں نے کوئٹہ میں تو لری شروع کی وہاں ان کی ملاقات دنیا کے مشہور ترین پامسٹ میر بشیر سے ہوئی میر صاحب نے ان کا ہاتھ دیکھ کر بتایا انہیں اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے نوازا رکھا ہے میر بشیر نے انہیں پامسٹری سکھانا شروع کر دی اس دور میں انہوں نے ایک بچی کا ہاتھ دیکھ کر پیشین گوئی کی کہ سولہ سال کی عمر میں اس کی جنس بدل جائے گی وہ بچی بڑی ہو کر لڑکا بن گئی۔ ان کی اس پیشین گوئی نے پامسٹری کی دنیا میں تھلک مچا دیا۔ وہ ۱۹۶۳ء میں واپس سرینگر چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں جنگ شروع ہوئی اور وہ بھارت میں پھنس کر رہ گئے وہ گھومتے پھرتے بنارس گئے وہاں غیر مرئی علوم کی ایک درس گاہ بنے یہاں فیلڈ میں دنیا کی قدیم ترین درس گاہ ہے اور درس گاہ کے چنڈے سے انہوں نے ان کا لڑکچہ بنایا اور انہیں اپنی درس گاہ میں داخلہ دے دیا۔ وہ اس ادارے کی تاریخ میں پہلے مسلمان طالب علم تھے وہ دس سال تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ انہوں نے وہاں سے پامسٹری میں ایم۔ اے کیا اور بعد ازاں وہاں طالب علموں کو تعلیم دینے لگے اس دوران ان کا راجہ اندرا گاندھی سے ہوا اور وہ وزیراعظم ہاؤس آنے جانے لگے۔ انہوں نے اندرا گاندھی کے قتل ان کے بیٹے نیچے کی حادثاتی موت اور راجیو گاندھی کے وزیراعظم بننے کی پیشین گوئیاں کی۔ انہوں نے سرینگر میں شادی کی ان کے ہاں ایک بیٹی اور ایک بیٹا پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۸۲ء میں پاکستان آ گئے۔ راجیو گاندھی نے جب قتل ان وقت انکیشن کرانے کا اعلان کیا تو لوگ سبھا کے کسی ممبر نے ایوان میں شیم قریشی صاحب کا ایک انٹرویو پلہرا کر کہا۔ ”راجیو کی زندگی میں یہ انکیشن ہے ہی نہیں۔“ یوں لوگ سبھا میں بحث چھڑ گئی۔ وہاں کسی نے شیم قریشی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ آج کل کہاں ہیں؟“ بتانے والے نے بتایا۔ ”پاکستان۔“ یہ خبر پاکستان پہنچی تو ان کی تلاش شروع ہو گئی وہ ان دنوں راولپنڈی میں تھے۔ انجینیئروں کے لوگ ان تک پہنچ گئے اور اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت ایوان اقدار میں گزارنے لگا۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی اہم شخص ہو جس نے ان کے سامنے ہاتھ نہ

پھیلائے ہوں۔ اس اہمیت کے باوجود انہوں نے دروغی ترک نہ کی۔ ان کے پاس کوئی گھر نہ تھا وہ لاہور اور اوپنڈی میں اپنے عزیزوں کے پاس رہتے تھے۔ کسی سے ایک پانی طلب نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی دے دیتا تو وہ یہ رقم یتیم بچیوں کی شادیوں پر خرچ کر دیتے، میرے ساتھ ان کا دس سال سے تعلق تھا۔ وہ اچانک غائب ہو جاتے اور پھر کسی روز گھر کی کھٹی جٹی اور وہ مسکراتے مسکراتے اندر داخل ہوتے۔ ”میں میں ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تمہیں سلام کرنا چلوں۔“

اپریل ۲۰۰۵ء میں مظفر آباد سے سرینگر کے لیے پہلی بس روانہ ہوئی تو وہ اس میں سوار تھے۔ سرینگر میں کشمیر اور بھارتی میڈیا نے ان کا پھر پورسوائت کیا۔ ٹیلی ویژن چینلوں پر ان کے لائیو پروگرام چلے درجنوں اخبارات نے ان کے انٹرویو کیے۔ انہوں نے میڈیا کی مدد سے اپنے بچے تلاش کئے اور ان سے لپٹ کر دیر تک رہتے رہے پاکستان واپس آئے مجھ سے ملے اور جذبات سے تہمتائی آواز میں بولے۔ ”میں نے زندگی میں صرف دو خواہشیں کی تھیں ایک میں آزاد کشمیر کے راستے مقبوضہ کشمیر جاؤں اور وہ میں اپنے بچوں سے ملاقات کر سکوں۔ میری دونوں خواہشیں پوری ہو گئیں۔“ وہ ان دنوں ہر دوسرے دن مجھے ملنے آتے اور بار بار کہتے تھے مقبوضہ کشمیر کی کشمیری قیادت پاکستان کو دھوکا دے رہی ہے یہ سب را کے چاموس ہیں ہمیں ان سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ میں ان کے احترام میں خاموش رہتا تھا۔ وہ ۶ جولائی کو میرے پاس سے اٹھے اور ۷ جولائی کی شام واپس آنے کا وعدہ کیا لیکن ۷ جولائی کی شام ان کی بجائے ان کے انتقال کا پیغام آ گیا۔

شیم قمریشی صاحب کی عجیب عادت تھی وہ چوبیس گھنٹے اپنے موبائل آن رکھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ”فون بند رکھنا تکبر کی نشانی ہے آپ فون بند کر کے دوسروں کو یہ پیغام دیتے ہیں میں تم سے زیادہ اہم ہوں یہ بات اللہ کو اچھی نہیں لگتی۔“ لہذا میں نے جب بھی فون کیا مجھے دوسری طرف سے السلام علیکم پینا کی آواز آتی۔ ۸ جولائی کو ان کا جنازہ تھا میں نے غیر ارادی طور پر ان کا نمبر ڈائل کیا۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کے نمبر سے وہ آواز سنائی دی جو اکثر لوگوں کے نمبروں سے اکثر آتی ہے۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجئے گا۔“ میں نے سوچا ”تھوڑی دیر“ میں نے سرنئی میں ہلایا اور اپنے آپ سے کہا۔ ”نہیں یہ تھوڑی دیر مگر کے روز تک پھیلی ہے اس تھوڑی دیر کو ختم ہونے کے لیے نہ جانے کتنے ہزاروں سال درکار ہوں گے۔“

پروفیسر عبدالعزیز

چہرے کی تمکنت اور تنی ہوئی گردن اس کے "خاص" ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی جبکہ اس سے ذرا ہٹ کر کھڑے دونوں مردوں کی جھکیں گردنیں اور پیٹ پر بندھے ہاتھ ظاہر کر رہے تھے کہ ان میں غلام اور آقا جیسا تعلق ہے۔ میں چوتھے سے قریب آیا تو عورت نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر میرے گالوں کو چھو کر بولی "آؤ میرے بچے ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے" میں چھلانگ لگا کر چوتھے پر چڑھ گیا۔ عورت مسکرائی اور سامنے سکول کے گراؤنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا "ان بچوں کو دیکھو" میں نے غیر ارادی طور پر گراؤنڈ میں کھیلنے اپنے ہم ملتبیوں پر نظر دوڑائی "تمہیں پتہ ہے یہ کون ہے؟" میں نے مز کر بولڑھی عورت کو دیکھا اور فنی میں سر بلا دیا "ہوں، یہ اچھا سفر کے محروم مسافر ہیں جو پوری زندگی سراب کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں اور آخر میں جب شام ہوتی ہے تو ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا، پھر یہ تاسف کرتے ہیں، روتے پیتے ہیں، لیکن کیا وقت واپس نہیں آتا۔" میرے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں لیکن اس بولڑھی عورت کا ایک بھی لفظ میرے پلے نہ پڑا۔ میں ہولق بنا اسے دیکھتا رہا۔ پر وہ میرے احساسات سے لاتعلق بولتی چلی گئی "لیکن تم ان سے مختلف ہو تمہارا سفر رائیگاں نہیں جانے کا، تم کانٹوں کے اس جنگل سے اپنے کپڑے اور جسم دونوں بچا کر نکلو گے" مجھے ان الفاظ کی بھی بالکل سمجھ نہ آئی، لیکن اس کے باوجود میں ایک سحر زدگی کے عالم میں ہمدن گوش رہا۔ پھر وہ پیچھے مڑی، یہاں دونوں مرد تعظیم سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی "یہ دونوں تمہارے استاد ہیں۔ یہ تمہیں زندگی کا درس دیں گے۔ ابدی اور ازالہ زندگی کا درس۔ ان کا احترام کرنا، ان کے ہر مشورے کو حکم سمجھنا۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں گمراہی سے دور رکھیں گے، یہ تمہیں بھٹکنے نہیں دیں گے، لیکن اگر تم نے ان کی حکم عدولی کی تو پھر تمہیں زمین پر عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ پوری دنیا کی حقارت، نفرت اور ذلت جمع کر کے تمہاری جھوٹی میں ڈال دی جائے گی۔" میں نے دیکھا اس وقت عورت کے چہرے پر کوئی انوکھی بات تھی، کوئی ٹھنڈا احساس، کوئی آگ میں جھلٹتا ہوا جذبہ جو اس کے چہرے سے اتر کر میری ہڈیوں میں سرایت کر گیا اور میں وہاں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اب پتہ نہیں میں کب تک اس چوتھے سے پر بے سدھ پڑا رہا لیکن جب ہوش آیا تو میں اپنے گھر بستر پر پڑا تھا اور میری ماں میری پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔

آٹھویں جماعت کے ایک ایسے کمزور سے لڑکے کے لئے جس کی زندگی درسی کتابوں تک محدود ہو یہ سب کچھ الف لیلیٰ کی کسی داستان سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے بھی "سوتے جاگتے" کا قصہ ہی سمجھ رہا تھا۔ شہر یار کے کسی کردار کا خواب یا کسی قصہ گو کی داستان طرازی۔ اسی لئے جب میں تین ماہ کی بیماری کاٹ کر دوبارہ سکول پہنچا تو اسے ایک بھیا تک خواب سمجھ کر بھول گیا۔ ہاں البتہ تفریح کے وقت کنوئیں کے پاس جانے کا معمول ترک کر کے میں نے اپنے ہم ملتبیوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ تین چار ماہ تک چلتا رہا لیکن ایک روز، میرے ایک ساتھی نے فٹ بال کو زوردار ہٹ لگائی اور وہ اچھل کر کنوئیں کے قریب چلا گیا، میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے بھاگا لیکن جوں ہی چوتھے سے کے پاس پہنچا وہاں ان دو "اتالیق" میں سے ایک بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ سانس گٹھے میں پھنس گئی اور جسم جیسے ٹھنڈ ہو گیا۔ دو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور کہا "دوستوں سے دوری اچھی بات نہیں۔ میں کل اس وقت یہاں تمہارا انتظار کروں گا، ضرور آنا" اور میں نے واپس دوڑ لگا دی۔ اگلے روز میں بڑا مصمم ارادہ کر کے سکول آیا کہ میں کنوئیں پر نہیں جاؤں گا لیکن جوں جوں تفریح کا وقت قریب آتا گیا، میرا ارادہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی میں کلاس روم سے سیدھا کنوئیں پر جا پہنچا "وہ" وہاں موجود تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا، پھر مجھے ساتھ بٹھا کر بولا "علم یہ نہیں جو ان مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ علم وہ ہے جو انسان کی ذات میں چھپا ہوتا ہے۔ اس کا کھوج لگاؤ، اسے ہکاؤ۔ اندر کی روشنی باہر کی روشنی سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے یہ ہمیں وہ سب کچھ بھی دکھا دیتی ہے جو باہر کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔ یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں اندر کی روشنی کا علم سکھاتا ہوں۔ سنو حضرت یونس چالیس برس تک مچھلی نہیں بلکہ مگر مچھ کے پیٹ میں رہے تھے۔ مچھلی کا پیٹ ہی نہیں ہوتا وہاں تو ایک سیدھی آنت ہوتی ہے۔ پیٹ تو مگر مچھ کا ہوتا ہے اور سنو حضرت آدم چکوال میں اتارے گئے تھے۔ اس اونچی نیچی زمین کے اندر اس دور کے سارے آثار دفن ہیں۔ ان آثار کو چار پانچ سو سال بعد آنے والے لوگ نکالیں گے۔ یہاں اس شہر کے نیچے کئی شہر ہیں ان شہروں میں ہزاروں برس پہلے کے لوگ رہتے تھے۔ وہ لوگ بڑے ظالم تھے، بے انصاف اور غصہ ور تھے۔ جب وہ حد سے گزرے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اتر آیا اور وہ اور ان کی بستیاں زمین میں دفن ہو گئیں۔ پھر

ان پر مٹی اور ریت کے ٹیلے آٹھہرے۔ پھر ان پر جنگل آگے، خوفناک جانور اور حشرات الارض آجے۔ پھر دور سے انسان آیا اسے یہ جگہ بھائی اور وہ یہاں اقامت پذیر ہو گیا۔ یوں زمین دوبارہ آباد ہو گئی لیکن تم دیکھنا کبھی نہ کبھی اس زمین کے نیچے سے وہ پرانی بستیاں بھی ضرور نکلیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر نئے عذاب سے قبل انسان کے سامنے پرانے عذابوں کی مثال پیش کرتا ہے اور پھر تفریح ختم ہونے کا گھنٹہ بجا تو وہ فوراً خاموش ہو گیا۔ میں اس سارے دورانے میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، بغیر آنکھ جھپکے، بغیر ہونٹ ہلائے اور وہ اپنی مقناطیسی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے بولتا رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں کوئی بات ضرور تھی شاید اسی لئے اس کا ہر لفظ میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ہاں، اب تم جاؤ کل پھر یہیں ملیں گے۔

یوں میری تدبیریں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں روز تفریح کے وقت کنوئیں پر آتا تو اس اجنبی کو اپنے مختصر پاتا۔ ان دنوں اس نے مجھے بتایا، زمین پر پہلا درخت بیر کا تھا، لوکات بیر اور ادر یک کے ملاپ سے بنا۔ لوکات کا سب سے پہلا درخت کناس قلعہ میں راجہ نے لگوا دیا۔ شروع میں اس کا پھل کڑواہٹ کے باعث کھانے کے قابل نہیں تھا، لیکن آہستہ آہستہ اس کی کڑواہٹ میں کمی آتی چلی گئی۔ پھر مجھے بتایا گیا، سانپ زمین کو زرخیز کرتے ہیں۔ جن زمینوں پر سانپوں کی بہتا ہوتی ہے وہ آنے والے وقتوں میں بڑی قیمتی ہوتی ہیں۔ وہاں بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ وہاں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ وہاں بڑی رونقیں ہوتی ہیں۔ پھر مجھے بتایا گیا جب بھیڑیں درختوں کے نیچے سے گزرتی ہیں تو ان کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کیوں، تم نے کبھی سوچا؟ اس وقت انہیں اپنے لبو کی خوشبو آتی ہے۔ اس لبو کی خوشبو جس نے قصاب کی چھری پر چمکنا ہوتا ہے۔ اس لمبے انہیں اپنی موت کے وقت کا اور اک ہو جاتا ہے۔ تم دیکھنا عید قربان سے قبل سارے جانور تمہیں مغموم ملیں گے، کیوں؟ اس لئے کہ انہیں اپنی موت کا علم ہوتا ہے۔ یہ جس انسان میں بھی تھی لیکن وہ اسے گم کر چکا ہے، سوائے چند لوگوں کے۔ پھر مجھے بتایا گیا جہاں مزدور بیت زیادہ ہوتی ہے وہاں زلزلے زیادہ آتے ہیں۔ جاپان مزدوروں کا خطہ ہے وہاں مزدور بستے ہیں۔ لا اعلق کھوئے ہوئے مگن مزدور۔ اسی لئے وہاں زمین ہر وقت کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ پھر مجھے بتایا گیا پانی میں جس جگہ زیادہ مرغائیاں ٹپکتی ہیں وہ ”چلوں“

کی جگہ ہوتی ہے۔ اس لئے صوفیا مرغابی کے شکار کے خلاف ہیں تم زندگی بھر مرغابیوں کے شکار یوں میں سکون اطمینان اور امن نہیں پاؤ گے پھر مجھے بتایا گیا لفظوں کے بھی جسم ہوتے ہیں۔ جنہیں دیکھنے کے لئے بالغ النظر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہانس اور برگد کا کوئی پھل نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیوں اگتے ہیں۔ پٹکواڑہ میں کوئی قوت نہیں ہوتی پھر یہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اس لئے کہ یہ زمین کی زکوٰۃ ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو زمین پر کچھ نہ ہو۔ پھر مجھے بتایا گیا باروت اور ماروت کنوئیں میں اگلے نہیں لٹکے بلکہ وہ ”پیلے مٹکوس“ میں گمن ہیں کہ جس نے بھی وقت پر قابو پانا ہے اسے اسی طرح اٹالنا ہوگا۔

میں ٹڈل پاس کر کے چکوال کے ہائی سکول میں داخل ہو گیا۔ وہاں پوری کلاس میں میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ میں بالکل الگ تھلگ اور خاموش رہتا تھا۔ سکول کا کام اور پڑھائی میں ٹھیک تھا۔ اس لئے استاد بھی مجھ پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتے تھے۔ چھٹی کے بعد گھر آتا، کھانا کھانے کے بعد کتابیں لے کر شہر سے باہر نکل جاتا۔ وہاں میرا ”اتالیق“ میرا انتظار کر رہا ہوتا۔ وہ میری انٹی پکڑتا اور مجھے کسی ویران جگہ پر لے جاتا۔ پھر وہ مجھے پڑھانے لگتا۔ سب سے پہلے نصاب کی کتابیں سکول کا کام کرانا، سبق یاد کرانا، اگلے دن کا سبق پڑھانا اور جب اس سے فارغ ہو جاتا تو پھر وہ ”اندرونی“ علم سکھاتا۔ قرآن مجید کے واقعات، ان کا پس منظر، دوسری سماوی کتب میں ان کے ریفرنس پھر دنیا کا کلاسیکی ادب۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ پوچھا تم مجھے انگریزی، الجبرا، فزکس اور کیمسٹری کیوں پڑھاتے ہو، ان کا تو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ تو وہ ہنس کر کہتا ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں تم زندگی کی محرمیوں سے تنگ آ کر ”ادھر“ نہیں آئے۔ تم ابو بن اوصم ہو۔ جس کے پاس سب کچھ تھا لیکن اس نے جذب و مستی کی زندگی کا انتخاب کیا۔ تم نے مادی زندگی کی تمام خوشیاں چھوٹی ہیں۔ شاندار تعلیم، اعلیٰ عہدہ، عزت، شہرت، ناموری گاڑی، بنگلہ، عورت، بچے، پیسہ سب کچھ۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے تم کمزور تھے۔ تم نادار تھے، تم بے نام تھے، تم محروم تھے اور تم جاہل تھے اس لئے اللہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایف اے کیا تو اعزاز کے ساتھ، بی اے کیا تو وہ بھی اعلیٰ درجے میں، پھر ایم اے انگریزی میں بھی پوزیشن لی۔ اس کے بعد مجھے فوج میں اپائی کرنے کا حکم دیا گیا۔ میں نے اپائی کر لیا۔ بڑی آسانی سے میری

سلیکشن ہو گئی۔ کاکول اکیڈمی سے فراغت کے بعد میری پوسٹنگ بلوچ رجنٹ میں ہوئی۔ یہ نواب آف بہاولپور کی رجنٹ تھی۔ جون یونٹ کے بعد پاک آرمی میں ایمرج ہو گئی۔ ان دنوں یہ رجنٹ آزاد کشمیر میں تھ پانی کے قریب کالادپو کے جنگل میں تعینات تھی۔ اس وقت سیز فائر لائن کی صورتحال بہت خراب تھی۔ روزانہ بھارتی مورچوں سے آزاد کشمیر کی آبادیوں پر فائرنگ ہوتی تھی۔ جو اب ہم بھی اپنی توپوں کے منہ کھول دیتے۔ جس سے کبھی کبھار تھوڑا بہت جانی نقصان بھی ہو جاتا۔ ایک رات بھارتی فوجیوں نے سیز فائر لائن کر اس کی اور آزاد علاقے میں آ کر اپنی چوکی قائم کر دی۔ دوسرے روز جب ہمیں خبر ہوئی تو ہم نے جوابی تیاریاں شروع کر دیں۔ حالات بہت خطرناک صورت اختیار کر رہے تھے۔ جس سے خدشہ تھا کہ کہیں یہ بھڑپیں پورے علاقے کو جنگی لپیٹ میں نہ لے لیں۔ اسی شام میں ٹھہلتا ٹھہلتا دشمن کے علاقے میں چلا گیا۔ ادھر سے میرے پیروں میں فائرنگ کی گئی تو میں نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور تیزی سے بھارتی مورچوں کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر ایک ہندو میجر نے میگافون پر مجھ سے پوچھا تم کون ہو؟ اور ادھر کیوں آ رہے ہو؟ میں نے چیخ کر کہا میرا نام ”رام لعل“ ہے میں بھارتی انڈین انٹیلی جنس میں آفیسر ہوں اور آفیشل ڈیوٹی پر پاکستان گیا تھا۔ اب دشمن کے قیمتی راز چر کر لایا ہوں۔ یہ سن کر میجر مورچے سے باہر آیا اور میری تلاشی لے کر مجھے کمپ میں لے گیا۔ جہاں مجھے ہمیں کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی میری شناخت کے لئے دہلی پیغام بھیج دیا گیا۔ یہ ایک بہت ہی خطرناک کھیل تھا۔ جس میں میری جان جانے کا سو فیصد امکان تھا لیکن ایک غیر مرنی قوت میرے ساتھ تھی۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لوگ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ شام کو مجھے فائرنگ ہال میں لایا گیا۔ ہال ہندو آفیسرز سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے بریگیڈ کمانڈر کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ اس نے دیکھتے ہی میرا اندر دھڑکن شروع کر دیا۔ اس کے لہجے سے یوں محسوس ہوا جیسے اسے میری اصلیت کا علم ہو چکا ہے۔ لہذا میں نے مزید جھوٹ بولنے یا رسک لینے کے بجائے ٹپکھن کھولتے ہوئے کہا، میرا نام کیپٹن عزیز ہے۔ نامکھ عہاسہ بلوچ رجنٹ سے تعلق رکھتا ہوں اور میں آپ لوگوں سے مذاکرات کے لئے آیا ہوں۔ میرے اس انکشاف سے جونیر آفیسرز کے ہاتھوں سے چیچ پھسل کر پلیٹوں میں گر گئے اور وہ غصے سے اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ بریگیڈیئر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا اور

ساتھ ہی سان کا ڈونگا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، میرا نام بریگیڈیئر جسونت سنگھ ہے۔ تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے ڈونگا پکڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا، ”چکوال“۔ ہوں بریگیڈیئر نے ہنکارہ بھرا اور کہا پھر تو تم میرے ”گرائیں“ ہوئے، میں ”بھون“ کا رہنے والا تھا۔ تقسیم کے بعد ادھر آ گیا۔ اب چکوال کیسا ہے؟ اور پھر اس کے ساتھ ہی چکوال کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بریگیڈیئر جسونت سنگھ اپنی جنم بھومی کے سلسلے میں بڑا جذباتی تھا۔ وہ تقریباً گھنٹہ بھر اپنے بچپن، اپنی سکول لائف پھر اپنے کیریئر کے ابتدائی دنوں اور اپنے پرانے دوستوں کی باتیں کرتا رہا۔ میں درمیان میں اسے ٹوک ٹوک کر نئی صورتحال کے بارے میں مطلع کرتا رہا۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں بھی یہی گپ شپ ہوئی۔ رات گئے جب ہم اصل ”ٹاپک“ پر آئے تو میں نے اسے سیز فائر لائن کی صورتحال، بھارتی قبضے اور اس کے نتائج کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا۔ جس سے اس نے اتفاق کرتے ہوئے اپنے جوانوں کو پرانی پوزیشن پر واپس لانے کی یقین دہائی کر دی۔ دوسرے روز مجھے باعزت طریقے سے واپس بھیج دیا گیا۔ میں اپنی یونٹ میں آیا تو مجھے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ پھر ایک لمبا ٹرائل ہوا۔ جس میں میں نے ساری واردات کھول کر بیان کر دی۔ چند روز بعد جب بھارتی دستے پسپا ہو کر پرانی پوزیشنوں پر چلے گئے تو میرے سینئر ڈکو میری بات پر یقین آ گیا لہذا میری رپورٹ جی ایچ کیو بھیج دی گئی۔ جہاں سے ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو میری پروموشن کا آرڈر آ گیا۔

کچھ عرصے بعد میں ایجوکیشن کور میں چلا گیا۔ مجھے پہلے کاکول اکیڈمی کینڈس کو پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی لیکن جلد ہی میں وہاں سے سبکدوش ہو گیا کیونکہ میں نے لاء میں داخلہ لے لیا تھا، ایل ایل بی کیا، پھر سرکاری اخراجات پر ہارایٹ الاء کیا اور واپس ایجوکیشن کور میں آ گیا۔ اب میرا تبادلہ سٹاف اینڈ کمانڈ کالج کوئٹہ میں ہو گیا۔ جہاں آفیسرز کو تعلیم دینا میری ذمہ داری ہو گئی اور ہاں میں ایک اور بات بتانا بھول گیا فوج میں آنے کے بعد میرے پہلے ”انٹیلی“ کی ذمہ داریاں ختم ہو گئی تھیں اور اب اس کی جگہ دوسرے ”انٹیلی“ نے لے لی۔ میں نے اس کی ہدایات پر مختلف ”وظائف“ شروع کر دیے تھے، مجھے پہلے پہل اسماء الہی پڑھنے کے لئے دیئے گئے، پھر مخصوص آیات قرآنی کی تلاوت کا حکم ہوا۔ پھر چلہ کشی کا مرحلہ آیا پھر مراقبہ اور آخر میں نفس

کشی کی مشقیں۔ میں جوں جوں ان مشکل مراحل سے گزرتا چلا گیا میری ذات میں روشنی سی اترتی چلی گئی۔ اپنے آپ پر اعتماد اور اپنے رب پر یقین بڑھتا چلا گیا۔ میرے لفظوں میں کشش اور میری آنکھوں میں پیش پیدا ہونے لگی۔

پھر مجھے کہا گیا "موسیقی سیکھو" میں نے ہارمونیم، پیانو اور ستار خرید لیا۔ کوئٹہ میں موسیقی کے استاد تلاش کئے اور باقاعدہ سیکھنا شروع کر دیا۔ چند ہی ماہ کی محنت سے مجھے گانے اور بجانے میں مہارت حاصل ہو گئی۔ انہی دنوں پاک آرمی کے زیر انتظام کوئٹہ میں ایک فنیہ پروپیگنڈا ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا، اس کا نام "کہکشاں" رکھا گیا۔ مجھے اس کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس ریڈیو کی نشریات پہلے کوئٹہ اور بعد ازاں کراچی سے "ریڈیو" کی جاتی تھیں۔ میں نے اس ریڈیو سے گھونگٹ، دائیں اور دھونی کے نام سے تین قسط وار ڈرامے شروع کئے۔ یہ ڈرامے میں نے خود لکھے اور ان کے زیادہ تر کردار بھی میں نے خود ہی کئے جبکہ موسیقی اور گلوکاری بھی میری ہی تھی۔ بعد ازاں انہی ڈراموں کے سکرپٹس پر فلمیں بنیں۔ گھونگٹ کی کہانی خورشید انور نے لے لی اور فیض احمد فیض نے اس کے لئے گانے لکھے۔ اس فلم کی کامیابی پر دھمن اور دھونی کو بھی فلمایا گیا۔ یہ فلمیں بھی بڑی ہٹ ہوئیں۔ گھونگٹ فلم کی اوپننگ ال کہاب والا کے قریب عصمت ٹائیکز میں تیرے ہی ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ فلم چھ ماہ میں مکمل ہوئی۔ انہی دنوں میں نے "کہکشاں ریڈیو" سے بیلام گھر شروع کیا۔ اس میں ہم ایسے سوالات منتخب کرتے تھے جن سے ہمارے دشمنوں کی آئینہ یا لوتی کو نقصان پہنچتا تھا۔ یہ پروگرام بڑا مقبول ہوا۔ بڑی مدت بعد جب پاکستان میں ٹیلی ویژن شروع ہوا تو طارق عزیز نے یہ پروگرام ٹی وی پر شروع کر دیا۔ یہ پروگرام طویل عرصے تک جاری رہا۔ انہی دنوں میں نے "سیر وارث شاہ" سے فنیہ کلام خارج کر کے اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہ کتاب آج بھی بازار سے دس روپے میں دستیاب ہے۔ جس پر سیر عزیز باریٹ الا چھپا ہوا ہے۔ میں نے اسی عرصہ میں "اوم پرکاش" کے فنیہ نام سے قانون کی ایک کتاب بھی لکھی "چارٹر آف یو این او" ایک ہندو جلی بے ڈیپانے اس کا دیباچہ لکھا۔ یہ کتاب آج بھی پاکستان اور بھارت میں پڑھائی جاتی ہے۔

وہ میرے لئے معاشی آسودگی کا دور تھا۔ مجھے "جیل ابدال" سے بزرگوں کی وارثت سے بڑی بھاری رقم ملی تھی اس سے میں نے کوئٹہ میں بڑا خوبصورت گھر بنایا۔ گاڑی خریدی، ہر

وقت تھری بیس سوٹ میں ملبوس رہتا تھا۔ قیمتی ترین سگریٹ، نایاب خوشبو اور سونے کا المیہ ٹرے استعمال کرتا۔ بیوی تھی، بچے تھے۔ شہر میں عزت تھی، یارا حباب کا ایک وسیع حلقہ تھا، مجھ سے اس کے بروہی جیسے لوگ بڑی محبت کرتے تھے۔ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج میں بڑی قدر تھی۔ شہر کی سیناؤں میں بڑا نام تھا لیکن میں اندر سے بری طرح ڈرنا رہتا تھا کیونکہ میں تیزی سے اس حد کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے میں نے پلٹنا تھا کیونکہ لوگ اب مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے مجھے مقدر کا سکندر سمجھنے لگے تھے۔ پھر ایک روز مجھے علم دیا گیا، اب رقص سیکھو۔ انکار کی کسے تاب تھی۔ میں دوسرے روز کوئٹہ کے مشہور رقص استاد سادق کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے چھ ماہ تک ٹریننگ دیتے رہے۔ جب میں "گھا گھر بھر نے" کا مشکل ترین رقص سیکھ گیا تو مجھے حکم دیا گیا اب رابرٹ مارکیت میں ہسپتال کے سامنے رقص کرو۔ اگلے روز میں چوک میں کھڑا ہو کر ناپنے لگا۔ سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے، ٹریفک ٹک ٹکی، لوگ حیران تھے کہ ان کے سامنے شہر کا معروف شخص پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں ناچ رہا ہے لیکن میں اس تمام تر جگ ہنسائی سے لاتعلقی ناچتا رہا، ناچتا رہا۔ یہاں تک کہ میں ہوش سے بے گانہ ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ علم نہیں عمر عزیز کہاں بسر ہوئی۔ کہاں کی خاک چھانی۔ کہاں کہاں رہا۔ بیچ میں ایک بار ہوش آیا تو خود کو کسی جیل میں پایا۔ کمزور اور لاغر تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال پریشان تھے اور منہ سے رال نکل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔ بس ایک ہی حس کام کر رہی تھی وہ تھی، "تالیق" کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتا۔ ایک بار ہوش آیا تو میں ایک بڑے سے کمرے میں اس طرح اٹا لٹکا ہوا تھا کہ سر کے قریب سے شہر بھر کا بول و براز گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر خرد کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فنا کے اس عالم میں مجھے کسی بھی حرکت پر کنٹرول نہ رہا تھا میں شہر شہر خاک چھانتا رہتا تھا۔ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ دریاؤں کے کنارے پڑا رہتا۔ تن کے کپڑے تار ہو گئے۔ داڑھی بڑھتے بڑھتے ناف تک پہنچ گئی۔ سر کے بالوں نے پوری کمر ڈھانپ دی۔ کبھی ہوش آیا تو خود کو کسی درگاہ پر پایا۔ کبھی کسی حزار پر۔ کبھی کسی کے پاؤں میں پڑا ہوں، کبھی کسی سے پتھر کھاد ہا ہوں۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء آ گیا۔ یہ ۲۶ برس میرا جسم کھا گئے۔ میرے ہوش، میرے اپنی کیس کھا گئے۔ مجھے مجھ سے دور کر گئے، لیکن میرے اندر ایک جہان تھا، نیا، حیرت انگیز جہاں ۱۹۹۰ء میں جب مجھے شعور واپس دیا گیا تو میں راولپنڈی میں فیض آباد کے قریب

قبرستان میں پڑا تھا۔ وہاں ایک میجر صادق ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا کی خصوصیت دے رکھی تھی۔ وہ پانی کے گلاس میں انگلیاں ڈبو کر جس مریض کو پلاتا تھا وہ صحت یاب ہو جاتا تھا۔ وہ مجھے پکڑ کر ساتھ لے گیا۔ مجھے کپڑے پہنائے، شیو کرائی، بال صاف کئے اور انسان بنایا۔ میں بڑا عرصہ اس کے گھر پڑا رہا۔ وہ میری بے تحاشا عزت کرتا تھا۔ اس کے گھر آنے والے لوگ مجھے درویش سمجھ کر میرے پاس آ بیٹھتے۔ صادق مجھے دعا کرنے پر مجبور کرتا، میں ہاتھ اٹھا دیتا۔ اب پتہ نہیں کیوں اللہ تعالیٰ میری بات کو قبولیت کی سند دے دیتا تھا۔ لوگوں کے کام ہو جاتے تھے بڑی جلد میری شہرت دور تک پھیل گئی۔ لوگ میجر صادق کے گھر ٹوٹ پڑے تو اتنے لوگ دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ جسم میں عجیب قسم کی بے چینی پھیلنے لگی۔ پھر میں ایک دن وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ اب چکوال میرا ٹھکانہ تھا۔ پورا شہر میرے لئے انجمنی ہو چکا تھا۔ پرانے یارا احباب سب بچھڑ چکے تھے۔ بچے مجھے پہچانتے تک نہیں تھے۔ میں بسوں کے اڈے پر پڑا رہتا کوئی کھانے کے لئے دے دیتا تو کھالیتا۔ نہ دیتا تو دیسے ہی منہ لپیٹ کر پڑا رہتا۔ وہاں بھی جلد ہی لوگوں کو خبر ہو گئی۔ ایک ایسا شخص جو لوگوں کا شجرہ نسب اور ان کی آنے والی نسلوں کا احوال تک جانتا ہو لوگ اسے کب چھوڑتے ہیں۔ میرے آگے بیچھے لوگوں کا میلا لگ گیا۔ یہ ”شوشا“ میرے اتالیق کو پسند نہ آئی لہذا اس نے میرا شعور دوبارہ واپس لے لیا۔ میں ایک بار پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں مجھے کن کن شہروں میں کن کن بستیوں میں گھمایا گیا۔ کس کس گندی نالی کا پانی پلایا گیا۔ کوزے کے کس کس ذیر سے رزق نکال نکال کر مجھے کھلایا گیا۔ اس سفر کے دوران کبھی کبھی چند لمحوں کے لئے میرے دماغ میں روشنی کے جھنکے ہوتے تو میں کھلی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش کو دیکھتا اور خود کو کسی کچرے گھر میں الف نکا پاتا لیکن یہ تاثر چند لمحوں کا مرہون منت ہوتا۔ اس کے بعد دوبارہ ایک طویل اندھیرا مجھے آ گھیرتا۔ پھر ۹۳ء میں مجھے ایک بار پھر شعور واپس دیا گیا۔

میری زندگی کا یہ فیز قدرے بہتر ہے۔ مجھ پر زیادہ پابندیاں نہیں۔ میں دن میں ایک آدھ بار کھانا کھا سکتا ہوں۔ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر چیزوں کی شناخت کر سکتا ہوں۔ لوگوں کے چہرے نام اور پتے کسی حد تک یاد کر سکتا ہوں۔ طالب علمی کے دور کی انگریزی نظمیں، دنیا کے مشہور مقدموں کی روداد اور آلات موسیقی کا استعمال یاد آ رہا ہے۔ انگریزی پر پرانی گرفت بھی

آہستہ آہستہ بحال ہو رہی ہے۔ فلسفہ، منطق اور فکر کی ساری باتیں بھی احاطہ شعور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ گفتگو کرنے لگوں تو زبان نکلتی نہیں۔ کسی موضوع پر لکھنا چاہوں تو ہاتھ رکنا نہیں۔ سوچنے لگوں تو سوچ کو ٹھوکر نہیں لگتی، لیکن دوستو! جب لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا مقدر پڑھتا ہوں تو کوئی طاقت میری زبان پکڑ لیتی ہے۔ فقروں کا سارا اتار پور مل جاتا ہے۔

لفظوں کے سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور سوچ کا سارا عمل بانجھ ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید قدرت اپنے راز افشا نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے ایک بار اپنے اتالیق سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا ”تم خدا بننے کی کوشش مت کرو“ اور میں نے کانون کو ہاتھ لگا کر اپنے رب سے معافی مانگ لی۔

اور اب یہاں کیا ہو گا یہ سینہ کائنات کا ایک ایسا راز ہے جسے میں افشا نہیں کر سکتا۔ میں تو کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ جو کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا، لیکن ہاں! میں آپ لوگوں کو ایک بات ضرور بتاتا چلوں، وہ لوگ جن کی عمریں پچاس ساٹھ سال سے زائد ہیں وہ آسمان کی طرف دیکھ کر بتائیں کبھی وہاں بڑے اور خوبصورت ستارے ہوا کرتے تھے اب وہ کہاں گئے؟ ہوا میں رنگ برنگے پرندے اڑا کرتے تھے۔ آپ نے پچھلے پچیس تیس برسوں میں وہ کیوں نہیں دیکھے؟ سڑکوں پر کپڑوں اور جانوروں کی بہتات ہوتی تھی اب کیوں نہیں؟ بارش کے بعد آسمان پر ”فلاںک“ کا بھیس اڑا کرتی تھیں۔ اب وہ کیوں نظر نہیں آتیں؟ صبح کی خوبصورتی، دوپہر کی تپش اور شام کی ریشمی کہاں چلی گئی؟ ویرانوں میں اب کوندر (پانی مرانا) ایسا پودا جس میں سو رہتے ہیں (زیادہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ لوگو! یہ سب بے مقصدیت کی نشانی ہیں۔ جب لوگوں کی زندگی صرف دن گزارنے تک محدود ہو جاتی ہے تو قدرت ان پر عذاب بھیجتی ہے۔ یہ سب عذاب سے پہلے کی نشانیاں ہیں۔

یہ آپ لوگوں کا المیہ ہے، بے خبر لوگوں کا المیہ۔ جو ”بچ سسٹم“ کی اس جدید سائنسی دنیا میں ہراس ”واردات“ کو پاگل پن سمجھتے ہیں جس میں بجلی، تیل اور گیس صرف نہیں ہوتی۔ جو تو اس شے کی کسوٹی پر پوری نہ اترنے والی ہر حقیقت کو ابہام اور توہم سمجھتے ہیں۔ جو خدا کی تشکیل کردہ حقیقتوں کو اپنے بنائے معیارات پر پرکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خسارے میں رہتے ہیں۔

جہنموں نے اپنی جانوں پر ظلم کئے۔ جو پوری زندگی اندھیرے میں بہکتے رہے۔ مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی کیونکہ میں عالم حیرت سے گزرا ہوا ایک ایسا شخص ہوں جو اب ”من تو شدی تو من شدی“ کے مقام پر کھڑا ہے۔ ہاں البتہ میرے دماغ میں ایک سوال ضرور چمکتا رہتا ہے کہ اس پروردگار میں جن لوگوں میں زندگی گزار رہا تھا تم نے تمیں برس کی چمپا کے بعد مجھے دوبارہ انہی لوگوں میں کیوں لا پھینکا، کیوں؟ پھر جب کائنات کی قوتیں مجھے کوئی جواب نہیں دیتیں تو خود میرا دماغ بولتا ہے شاید مجھے اس لیے اس کرب سے گزارا گیا کہ میں دوا دوا کا تجزیہ کر سکوں، میں پچھلے اور آنے والے لوگوں کو دیکھ سکوں۔

• • •

امیر گلستان جنجوعہ

میرے آباء و اجداد صدیوں سے سالٹ رینج میں آباد چلے آ رہے ہیں۔ سپہ گری ان کا پیشہ تھا۔ تزک بابری میں قسیر الدین بابر لکھتا ہے ”وہ جب کوہ نمک پہنچا تو وہاں جنجوعہ قبیلے کے رہنے مسن کی حکومت تھی“ جنجوعوں نے مغلیہ دور میں مغلوں کا ساتھ دیا۔ ہمیشہ سکھوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہے اور اسی سکھ دشمنی کے باعث انگریزوں سے بھی تعاون کیا۔ سکھوں کا اقتدار ختم ہوا تو انگریز کو مزید فتوحات کے لئے فوجیوں کی ضرورت تھی لہذا انگریز افسر پنجاب میں فوجی بھرتی کے لئے آئے تو میرے دادا کے بڑے بھائی مرزا خان کیپٹن جانسن کی پلٹن سیکند پنجاب میو انٹری (پی این ایف) میں بھرتی ہو گئے۔ مرزا خان کا قد سات فٹ تین انچ تھا جب وہ سو بیدار ہوئے تو لارڈ رابرٹس نے انہیں اپنا اے ڈی سی بنالیا ان دنوں گھوڑے اور اونٹ سواری کا ذریعہ تھے لارڈ رابرٹس کا قد بہت چھوٹا تھا اور انہیں اونٹ پر سوار ہونے اور اترنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا مرزا خان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ جب اونٹ لارڈ رابرٹس کو لے کر اٹھے تو وہ لارڈ کو پیچھے سے پکڑ رکھیں تاکہ اونٹ کے جھکنے سے ”ٹازک اندام“ لارڈ کو تکلیف نہ پہنچے وہ یہ عمل اونٹ کے بیٹھتے وقت بھی دہراتے تھے۔ مرزا خان کے والدین نے ان کی مصلحتی توڑ دی تو وہ گاؤں آئے اور اپنی سابقہ منگیتر کو گھر سے بھاگ چلنے کی ترغیب دی وہ نہ مانی تو کھوار سے اس کا سر قلم کر دیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ مقدمہ چلا اور ان کو سزائے موت ہو گئی پھر انہیں جہلم میں عارضی جیل بنا کر پھانسی دے دی گئی۔

مرزا خان کے چھوٹے بھائی (میرے دادا) ۱۸ نو ائمہ رسالہ میں بھرتی ہو گئے۔ مختلف جگہوں پر ۳۲ برس تک فوجی خدمات سر انجام دینے کے بعد ریٹائر ہوئے تو واپس پنڈ وادن خان آ گئے اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے چند روز بعد میرے دادا نے کنواں کھدوایا

امیر گلستان جنجوعہ بریگیڈ میز کی حیثیت سے فوج سے ریٹائر ہوئے۔ وہ دو ممالک میں سفیر رہے۔ انہیں طویل عرصے تک صوبہ سرحد کا گورنر رہنے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ وہ جنرل ضیاء الحق کے جوانی کے ساتھی تھے۔ آپ کو اس انٹرویو میں ان دنوں کی جھلک نظر آتی ہے جب جنرل ضیاء الحق اور امیر گلستان جنجوعہ محض کیپٹن تھے اور دونوں پیسے ملا کر انگلیٹھی کے لیے کوئلے خریدتے تھے۔

جب کنواں حمل ہو گیا تو وہ پانی ماپنے کے لئے اترے۔ وہ ایسی پر رس ٹوٹ گیا وہ گردن کے بل گزریں میں گرے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے چار بیٹے تھے کیپٹن راجہ فیروز خان (میرے والد) کیپٹن راجہ سیف علی خان، نراسب خان اور لیفٹیننٹ شیر افگن۔ اس وقت میرے والد کی عمر دس برس تھی۔

میرے والد پر انگریزی پاس تھے۔ جب وہ چودہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کے ایک دوست انہیں فوج میں بھرتی کرانے لے گئے۔ انگریز نے رکھ لیا۔ ۱۹۰۷ء میں آرمی کا ایک دستہ ایسٹ افریقہ میں صومالی لینڈ گیا وہ ان کے ساتھ ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ چار برس بعد بمبئی دار بن گئے۔ ۱۹۱۸ء تک وہیں رہے پھر واپس پٹن میں آ گئے۔ ۱۹۲۵ء میں میرے والد صمانہ کے قریب فورٹ گلستان میں انچارج تھے۔ چودہ اگست ۱۹۲۵ء کو میں وہاں فورٹ گلستان میں پیدا ہوا۔ والد نے جاتے پیدائش کی مناسبت سے میرا نام امیر گلستان جنجوعہ رکھ دیا۔ ساڑھے چار برس کی عمر میں مجھے سکول داخل کرا دیا گیا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا لہذا والد نے مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ بچپن والد کے ساتھ ساتھ سنگھو، مل فقیر، پی، میران شاہ، میر علی اور کوہاٹ میں گزرا۔ ۱۹۲۵ء میں والد شاہ برطانیہ کے اے ڈی سی بن گئے تو میں ان کے ساتھ لندن چلا گیا۔ وہاں چارج ٹیم، کنگ ایڈورڈ ہسپتال اور جارج ہسپتال میں ششما کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شاہی خاندان کی تقریبات میں شرکت کی۔ انگریزوں کا کردار بھی دیکھا اور نظم و ضبط بھی۔ ہم ۱۹۳۸ء میں واپس بھارت آ گئے اور پھر جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی۔ والد صاحب محاذ پر چلے گئے اور میں گارڈن کالج راولپنڈی میں فرسٹ ایئر میں داخل ہو گیا۔ مجھے کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ کالج میں فٹ بال ٹیم کا کپتان بن گیا۔ پنجاب یونیورسٹی تک، جس کا دائرہ کار اس وقت کے پاکستان سے بھی زیادہ تھا میں نے فٹ بال کھیلا، میرے کھیل کا دور دور تک شہر تھا۔ شہر میں کرکورنٹ کالج لاہور کے پرنسپل نے مجھے خط لکھا کہ اگر آپ ہمارے کالج میں داخلہ لیتا چاہیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ میں نے پیشکش قبول کر لی اور سیکنڈ ایئر میں لاہور گورنمنٹ کالج منتقل ہو گیا۔ وہاں پر کراس کنٹری لیول کی اٹھلیکس کیں، باسکٹ شروع کی اور نادرن انڈیا کا چیمپئن بن گیا۔ وڈ پلو کی طرف گیا تو ایوارڈ لے لیا۔ داد جوانی کی بھی کیا بات تھی شکست نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ۳۶ء میں بی اے کیا تو میرے پاس پنجاب یونیورسٹی کے چار اعلیٰ اعزاز تھے۔

انگریز نے جنگ عظیم دوم کے دوران ڈیرہ دون کو انہیں بنادیا تھا۔ جنگ کے بعد

اسے دوبارہ اکیڈمی کی شکل دے دی۔ وہاں میں نے پوسٹ وارسیکنڈ ریگولر کورس میں کیڈٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ اکیڈمی میں فٹ بال ٹیم کا کیپٹن رہا باسکٹ کھیلی دوڑیں لگائیں وہاں بریڈیڈ ٹراکٹر جنرل ہمال میاں (سابق وزیر ریلوے اور واپڈا) جنرل شفقت سعید (اے این سی، سابق سیکرٹری اطلاعات اور سیر) جنرل میاں عبدالقیوم اور ہندوؤں میں جنرل ہریش چندرا (سابق ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف انڈیا) جنرل منوہر لعل چٹ، جنرل ہتھندرا انوالیہ جنرل بی رلیس رات اور جنرل ریڈی میرے کورس میٹ تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ٹریننگ مکمل کرانے کے بعد میں پاکستان آ گیا۔ میری پہلی پوسٹنگ میرے والد کی پٹن پلر (پی آئی ایف ایف ای آر) میں ہوئی۔ یہ پٹن انگریز نے ۱۸۳۳ء میں بنائی تھی اور اس میں میرے خاندان کی خدمات کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ میرے والد اور دادا سے لے کر آج تک میرے خاندان کے ۲۵۰ سے زائد افسروں نے اس میں خدمات سرانجام دی تھیں۔

قائد اعظم سے میری دو ملاقاتیں ہوئیں۔ قیام پاکستان سے قبل ہم لوگوں نے گورنمنٹ کالج میں ایم ایس ایف کی بنیاد رکھی۔ ہندو پرنسپل نے ہماری اس شرکت پر بڑا اہمیت دیا لیکن ہم لوگوں نے سنبھل لیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب قائد اعظم نے لاہور کے دورے کا اعلان کیا تو علامہ عنایت اللہ مشرقی نے دھمکی دی کہ جناح لاہور آ یا تو زندہ واپس نہیں جائے گا۔ ہم لوگوں نے سنا تو بڑے پریشان ہوئے۔ ایک روز ایم ایس ایف کے سیکرٹری جنرل قاسم رضوی (سی ایس پی) میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم لوگوں نے قائد اعظم کی حفاظت کا فیصلہ کیا ہے تم بھی ہمارا ساتھ دو۔ میں نے فوراً ہاں کر دی۔ دوسرے روز ہم نے "ممدوٹ والا" کو گھیرے میں لے لیا۔ ہم نے دیال سنگھ، گورنمنٹ، ایف سی اور اسلام آباد کالج کے لڑکوں کے سیکر بنادے تھے جو باری باری قائد اعظم کی حفاظت کرتے۔ ممدوٹ والا کے کھانے کا بندوبست بھی ہم نے سنبھال لیا تھا۔ جب ہمارے گروپ کی باری آئی تو قائد اعظم اسلام آباد کالج کی تقریب میں شرکت کے لئے باہر نکلے تو گیٹ پر میں کھڑا تھا۔ قائد اعظم نے ہاتھ ملایا "کچھ دیکھ باتیں کیں اور روانہ ہو گئے۔ ان سے دوسری ملاقات قیام پاکستان کے بعد ہوئی جب قائد اعظم خان عبدالقیوم خان کے ساتھ بنوں کے دورے پر آئے۔ بنوں ایئر پورٹ شہر سے سات آٹھ میل باہر تھا۔ میں نے قائد اعظم کو ایئر پورٹ پر ریسیو کیا اور انہیں "ایئر کمارٹ" کرتے ہوئے ان کی اقامت گاہ تک پہنچایا میں دورے کے اختتام پر

بھی ان کے ساتھ تھا۔ ایئر پورٹ پر قائد اعظم سے ملاقات کے لئے علاقے کے ملک جمع تھے۔ سیکورٹی کی وجہ سے یہ ملک ایئر پورٹ سڑک سے ہٹ کر ایک "چھپر" کے قریب کھڑے تھے۔ قائد اعظم انہیں دیکھ کر ان کی طرف بڑھے اور ان سے فر دافرو ہاتھ ملایا میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ ملکوں سے ملاقات کے بعد قائد اعظم میری طرف مڑے ہاتھ ملایا اور کہا "تھینک یو کیپٹن" اور میں نے انہیں سیلوٹ کیا۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

۱۹۴۹ء میں مجھے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے ہاڈی گارڈز کا ایجوٹ لگا دیا گیا۔ وہاں شینڈول بڑا ٹائٹ تھا۔ ہر وقت گورنر جنرل کے ساتھ رہنا پڑتا تھا شام کو سوشل فنکشنز میں بھی حاضری ضروری تھی۔ میں کھیلوں کا رسیا تھا۔ سکوائش اور فٹ بال کا تو مجھے نشہ تھا۔ بڑے بڑے چھٹے روزانہ وہ پہر کا کھانا خواجہ صاحب کے ساتھ کھانا پڑتا تھا۔ ایک روز کھانے کی میز پر میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر خواجہ صاحب نے پوچھا جنگ میں کیا مسئلہ ہے؟ تو پتہ نہیں کہاں سے میرے اندر جرأت آگئی اور میں چلا اٹھا۔ "سر! میں سپورٹس میں ہوں اور ان لوگوں نے مجھے ہاڈی گارڈز میں لگا دیا۔" خواجہ صاحب بھونچکے رہ گئے تھوڑی دیر تک سوچا اور پھر میرے کمانڈنگ آفیسر جنرل جہانزیب کو بلا کر کہا اسے واپس یونٹ بھیج دو اور میں واپس آ گیا۔

اس سال ہم لوگوں نے نوشہرہ میں ایک کورس کیا۔ جنرل وجاہت، جنرل اعجاز جنرل فضل حق اور بریگیڈر بابر بشیر (نصیر اللہ باہر کے کزن) بھی میرے ساتھ تھے۔ کورس ختم ہوا تو شام کو ہمیں میں پارٹی تھی پارٹی کے دوران کیپٹن ضیاء میرے پاس آئے اور کہا کہ تم چراگت میں میرے نمبر نو آ رہے ہو۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ یہ بات ہفتے کی ہے تو اور کون جھٹی تھی۔ یہ کیپٹن ضیاء کے ساتھ طویل رفاقت کا سفر شروع ہو گیا۔ کیپٹن ضیاء چراگت میں بوائز ونگ چلا رہے تھے۔ بوائز ونگ انگریزوں کے دور میں شروع ہوئی تھی اور ایوب کے دور میں ختم ہوئی اس میں ہم ۱۲، ۱۳ برس کے لڑکے لیتے تھے انہیں ٹریننگ دیتے اور جب وہ ۱۷، ۱۸ برس کے ہو جاتے تو مستقل آرمی میں بھرتی کر لیتے۔ کیپٹن ضیاء اس ونگ کے انچارج تھے اور میں ان کا نمبر نو وہ بھی غیر شادی شدہ تھے میں بھی کنوارہ۔ وہ بھی بغیر فیملی کے میں بھی اکیلا۔ ایک پہاڑی پر ان کا بنگلہ تھا دوسری پر میرا گھر سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی تو ہم لوگ کمرے گرم کرنے کے لئے لکڑی کے کونکے جلاتے تھے۔ ایک روز ہم مل بیٹھے اور فیصلہ کیا کہ ہم دونوں بڑے بڑے گھروں میں اکیلے رہتے ہیں۔ اپنا اپنا کونکہ جلاتے ہیں جو اسراف ہے لہذا ہمیں ایک ہی گھر میں آ جانا چاہیے۔ دوسرے روز میں نے

اپنا بستر اٹھایا اور ان کے گھر آ گیا۔ اس زمانے میں کونکے کی بوری تین روپے چھ آنے میں آتی تھی۔ آدھے روپے میں ڈالتا تھا اور آدھے ضیاء۔ یوں ہم نے کونکے سینک سینک کمرے دیاں گزار دیں۔ وہاں ہم ایک برس تک اکٹھے رہے۔ ضیاء الحق مجھے روز فجر کی نماز کے لئے اٹھا دیتے تھے۔ سخت سردی ہوتی تھی میں ان سے کہتا ضیاء تمہاری ساری باتیں درست ہیں لیکن یہ فجر کے وقت مجھے نہ اٹھایا کرو۔ میں سپورٹس میں ہوں شام کو کھیل سے تھکا ہوتا ہوں اور وہ مسکرا دیتے وہ عجیب انقلابی روح تھا مثلاً اس نے بوائز ونگ میں پہلی مرتبہ سیلف فارمیشن شروع کی اور روز صبح دعا ہوتی باجماعت نماز ہوتی اسلامی شعائر کی ترویج کی جاتی اور بوائز کو جسمانی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ اسلامی تربیت بھی دی جاتی۔ ان تمام مشاغل سے وقت ملتا تو ضیاء کتابیں لے کر بیٹھ جاتے۔ ایک برس بعد ۱۹۵۰ء میں ضیاء کو ہاٹ گارڈز کی کوری میں چلے گئے اور میں نوشہرہ پھر وہ ایجوٹ آف دی سینٹر بن کر نوشہرہ آ گئے اور میں کو ہاٹ چلا گیا وہاں کبھی وہ میرے گھر آ جاتے اور کبھی میں نوشہرہ ان کے پاس۔ وہ صدر میں رہتے تھے ان کے گھر ان کے والدہ والدہ اور بہن سے ملاقاتیں ہوتیں مجھے ان کے گھر کے نمبر کی حیثیت حاصل تھی۔ اکٹھے کھانا پاتیں کرنا وہ بڑا خوبصورت وقت تھا کیا بات تھی کوئی فکر تھی نہ اندیشہ ۵۰ء میں ہی نہرو نے پاکستان کو جنگ کی دھمکی دے دی سرحدوں پر بھارتی فوجیں جمع ہو گئیں تو ادھر سے خان لیاقت علی خان نے بھارت کو مدد کا دکھا دیا اور ہماری ساری فوج بھی ہاڈی ریز پر چلی گئی۔ ہماری یونٹ سیالکوٹ مو کو گئی وہاں ہم سرحد پر ایک برس تک بھارت کو مدد کا دکھاتے رہے۔ سرحدوں پر کشیدگی کے باوجود جنگ نہ ہوئی خطرات ٹل گئے تو یونٹ واپس پنڈی آ گئی۔ میں اور ضیاء پھر اکٹھے ہو گئے۔ ایم ایچ کے سامنے پائل لائنز ہوا کرتی تھی وہاں میں اور ضیاء اکٹھے رہتے تھے وہ ۵۳ء سے ۵۵ء تک ایجوٹ رہے۔ ۵۵ء میں شاف کالج کو چلے گئے اور میں ان کی جگہ ایجوٹ بن گیا۔ ضیاء شاف کالج کر کے آئے تو میں شاف کالج چلا گیا۔ دسمبر ۵۶ء میں وہاں سے واپس آیا اور ان کے ساتھ شاف آفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگا وہ اس وقت بریگیڈر منیجر تھے۔ ۱۴۶ امری روڈ (آج کل وہاں ضیاء فاؤنڈیشن کا دفتر ہے) میں ان کی رہائش تھی میں ایم ایس آئی ہسپتال کے قریب رہتا تھا۔ ویسٹریج میں ہمارا دفتر تھا صبح وہ سائیکل پر میرے گھر آتے اور میں اپنا سائیکل تیار کر کے کھڑا ہوتا۔ وہاں سے ہم دفتر روانہ ہو جاتے۔ چڑھائی کے دوران جب ہم زور زور سے پنڈل چلاتے تو سامنے سے سردیوں کی بخ ہوا میں ہمارے ساتھ لپٹ جاتیں۔ ہاتھ اور چہرہ ٹھنڈے سے جم سا جاتا اور جب گرمیاں ہوتی تو تپتی

دو پہروں میں ہم دفتر سے واپس گھر آتے۔ راستے میں جہاں سایہ دیکھتے گھڑی دو گھڑی دم لینے کے لئے رگ جاتے اور جب بارش ہوتی تو ہم درختوں کی پناہیں ڈھونڈتے۔ آج بھی جب میں ویسٹریج جاتا ہوں تو راستے میں مجھے جگہ جگہ میجر ضیاء الحق کے قہقہے اور اپنی شوخیاں بکھری نظر آتی ہیں اور میں وہ وردیاں بھی آج تک نہیں بھولا جو ہم نے اس راستے پر کبھی پسینے اور کبھی بارش میں بھگوئیں اور وہ رومال اور مظفر بھی میرے گھر سے ہی فطیس کے جو ہم سردیوں کے تیز چبھنے والی ہواؤں سے بچنے کے لئے استعمال کرتے تھے ان ہی دنوں ضیاء الحق کے بچے پیدا ہوئے میری شادی بھی اسی دوران ہوئی۔

ہمیں مارشل لاء کا پہلا تجربہ ۵۸ء میں ہوا۔ بریگیڈ میں دو میجر ہوتے ہیں ویسٹریج میں ضیاء اور میں تھے۔ مارشل لاء کا حجم آتے ہی رات کو ضیاء اور میں نے ڈاک خانہ، خزانہ، ٹیلی گراف آفس، بینک اور چنڈی کے مرکزی پل اپنی حفاظت میں لے لئے۔ دوسرے روز ہمیں عوام کی طرف سے پھر پورا اپنی ٹینک کا خطرہ تھا لیکن صبح سات بجے ہم نے دیکھا مری روڈ پر معمول کے مطابق ٹریفک چل رہی ہے۔ لوگ سکون سے دفتر جا رہے ہیں سب کچھ نارمل ہے تو ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ مارشل لاء کے کچھ روز بعد سکندر مرزا چلے گئے اور فیملی مارشل ایوب خان نے اقتدار سنبھال لیا۔

۱۳ نومبر ۱۹۵۸ء کو میں اور ضیاء کھاریاں چلے گئے۔ چھاؤنی بن رہی تھی۔ سڑکیں بن رہی تھیں۔ رہائشی کمرے نہیں تھے۔ میں اور ضیاء ایک خیمے میں رہتے رہے۔ جب کمرے بن گئے تو میں اور وہ ایک کمرے میں رہے۔ چھاؤنی کے تمام درخت ہمارے ہاتھوں کے لگے ہوئے ہیں۔ اس دوران ان کی بریگیڈ میجر کی تین سال پورے ہو گئے اور وہ کورس کے لئے امریکہ چلے گئے۔ وہ واپس آئے تو میں کورس کے لئے چلا گیا۔ ویرجینٹ میں آگئے۔ میں بھی کورس کے بعد رجمنٹ میں آگیا۔ رجمنٹ میں تین سکواڈرن ہوتے ہیں ایک کی کمان ضیاء کے پاس تھی۔ دوسری کی میرے پاس اور تیسری کے کمانڈر فضل حق تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ سٹاف کالج کے لئے امریکہ چلے گئے۔ وہ واپس آئے تو میں امریکہ چلا گیا۔ وہ آکر سٹاف کالج میں انسٹرکٹر لگ گئے۔ میں واپس آ کر جی ایچ کیو میں سی جی ایس کا جی ٹو لگ گیا۔ وہ دور پڑھائی، ٹریننگ، مشقوں اور آگے بڑھنے کی تحریک کا دور تھا۔ ۶۵ء کی جنگ پر بڑی "کنٹر ورسٹی" ہوئی۔ کئی نے کہا جنگ اچانک تھی۔ کئی نے کہا جنگ کا پہلے سے علم تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں مثلاً میں نے ایک جگہ پڑھا

بھارتی فوج میں لاہور کا پاؤر کراس کر کے شاہ امارت تک آگئی تھیں۔ وہاں انہوں نے دیکھا گوالے معمول کے مطابق سائیکلوں پر دو دو لے کر جا رہے ہیں۔ چوکیدار جاتے رہو کی آوازیں لگا رہے ہیں۔ سڑکوں پر کوئی فوجی گاڑی ہے نہ جوان تو وہ گھبرا گئے اور انہوں نے سوچا یہ پاکستانی فوج کا "کریپ" ہے لہذا وہ واپس بی آر بی نہر پر چلے گئے۔ کسی نے کہا دشمن بی آر بی نہر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہو گیا تھا لیکن پاک فوج نے انہیں واپس دھکیل دیا۔ میرا ایک افسر دوست جو ٹینک رجمنٹ میں فرنٹ پر تھا۔ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس سے یہ سوال کیا تو اس نے کہا۔ "اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا وہ نہر کی دوسری طرف تھے اور ہم اصرہر بی آر بی بہت بڑا فرنٹ ہے اسے کراس کرنا اتنا آسان نہیں بہر حال یہ سب افواہیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمیں جنگ کا پہلے سے علم تھا بھارتی فوجیں بارڈر پر آ چکی تھیں ہم بھی ریکی کر رہے تھے۔

میں نے ۱۲ اگست ۶۵ء کو یونٹ کا چارج لیا۔ ہمارا ڈویژن گوجرانوالہ سیکٹور روڈ پر ہندی پور میں تھا۔ ۶ ستمبر کو جنگ شروع ہوئی تو ہم چونڈہ کے محاذ پر پہنچ گئے جہاں ٹینکوں کی تاریخی لڑائی ہوئی۔ بھارتی فوج بین الاقوامی پاؤر کراس کر کے ۹-۸ میل پاکستان کے اندر چار بھائی گاؤں تک پہنچ چکی تھی۔ بریگیڈیئر عبدالرحیم ملک ہم سے پہلے چونڈہ پہنچ گئے۔ ہمیں چونڈہ سے بائیں طرف ریلوے سٹیشن کے پھانک سے بدیانہ گاؤں تک کا علاقہ دیا گیا۔ دوسری یونٹ کو فلوراکا روٹ دیا گیا اور پھر ۱۱ ستمبر کو چونڈہ کے میدان میں ٹینکوں کی تاریخی لڑائی شروع ہو گئی۔ ہمارے جوان راتوں کو "کراٹنگ" کرتے جاتے اور دشمن کے ٹینکوں کے نیچے بارودی سرنگیں بچھا آتے۔ واہ بھان اللہ کیا جذبہ تھا ہر شخص کے چہرے پر عزم کی سرخی تھی اور ہاتھوں کی گرفت کے نیچے بندوؤں کا لوہا پگھل پگھل جاتا تھا۔ ہم ۱۸ ستمبر تک چونڈہ میں لڑتے رہے پھر ہم سیز فائر پر مجبور ہو گئے۔ لڑائی ہتھیاروں کے ساتھ ہوتی ہے یا بارود کے ساتھ۔ ہمارے پاس ہتھیار تو تھے لیکن بارود نہیں تھا۔ امریکہ نے (آف دی ریکارڈ)۔

لوگ ۶۵ء کی جنگی حقائق کا سارا الزام جنرل موسیٰ کو دیتے ہیں لیکن صرف ان کو الزام دینا مناسب نہیں وہ جیسے بھی تھے ان میں کچھ تھا تو وہ جنرل بنے۔ چیف آف آرمی سٹاف بنے۔ اگر وہ قطعی طور پر نا اہل ہوتے تو انگریز کی فوج میں اعلیٰ عہدوں تک نہ پہنچتے لیکن اس کے باوجود اس جنگ میں کچھ ایسی حقائق بھی ہوئی جن کا نقصان پاکستان کو پہنچا مثلاً کھیم کرن آپریشن دیکھیں

اس کی منصوبہ بندی بڑی اعلیٰ تھی لیکن کمزور آرگنائزیشن کے باعث ہم مارکھا گئے۔ جب میں نیپال کا سفیر تھا تو پاکستان سے نیپال جاتے ہوئے میرا دہلی میں "ٹائٹ سٹ" ہوتا تھا۔ اس دوران میری بھارت کے ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف ہریش چندتا (میرے کورس میٹ تھے) سمیت متعدد بھارتی جنرلوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان لوگوں نے ایک روز انکشاف کیا کہ ہم کرن آپریشن کا بھارتی فوج پر اس قدر دباؤ تھا کہ ہم نے امرتسر تک خالی کر دیا تھا لیکن آپ لوگوں کی نالائقی کی وجہ سے ہم واپس آ گئے اور آپ کو لینے کے دینے پڑ گئے صرف یہی نہیں پاکستان کی اعلیٰ قیادت نے وہ وہ حمایتیں کیں؟ (آف دی ریکارڈ)

فیلڈ مارشل ایوب خان سے پہلی ملاقات کے ذکر سے قبل اس کی بیک گراؤنڈ بتانا چاہوں گا۔ ایوب خان کی پلٹن ۱۴ پنجاب رجمنٹ تھی جب وہ کیپٹن تھے تو ان کا سی او انگریز کرنل بیکرڈ تھے۔ ایوب خان کو ان سے بڑی انیسیت تھی۔ کرنل بیکرڈ آئی ایم اے میں چیف انسٹرکٹر رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جنرل بنا دیے گئے۔ جنگ ختم ہوئی تو بریگیڈیئر کے رینک پر ریٹائر ہوئے اور لندن میں گوشہ گمنامی میں زندگی گزارنے لگے۔ ایوب خان ۱۹۵۲ء میں امپریل جنرل سٹاف کی میٹنگ میں شرکت کے لئے لندن گئے (اس میٹنگ میں کامن ویلتھ کے تمام آرمی چیف شرکت کرتے تھے) تو واپسی پر بریگیڈیئر بیکرڈ کو کہیں سے تلاش کر لائے اور آتے ہی انہیں کوہاٹ میں اوٹی ایس کا کمانڈنٹ لگا دیا اور میں ان دنوں اوٹی ایس میں انسٹرکٹر تھا۔ بریگیڈیئر بیکرڈ میری خاندانی بیک گراؤنڈ اور کام کی وجہ سے مجھے بہت پسند کرنے لگے۔ ۱۹۵۳ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان پاسنگ آؤٹ پریڈ میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے آئے تو میں نے انہیں ریسپو کیا اور انہیں بریگیڈیئر بیکرڈ کے کمرے تک لایا۔ کمرے میں آ کر ایوب خان چھوٹی کرسی پر بیٹھنے لگے تو بیکرڈ نے مرکزی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ایوب پوسٹ دیئر" تو ایوب نے کہا۔ "نو سر دیئر یور چیئر" تو بیکرڈ نے زور دے کر کہا۔ "نو نو پوسٹ دیئر" ایوب خان نے دوبارہ انکار کیا تو بیکرڈ نے مسکرا کر کہا۔ "یو آر ناٹ سٹنگ دیئر بیکاز یو کیمن ناٹ فنٹ ان دیئر" (تم اس لئے وہاں نہیں بیٹھ رہے کہ تم اس قابل نہیں ہو) ایوب نے قہقہہ لگایا اور مرکزی کرسی پر بیٹھ گئے۔ یہ ایوب خان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کا اے ڈی سی وی عہد سوات اور گلگت میں میری یونٹ کا تھا وہ بھی وہاں تھا۔ اس سے خوب گپ شپ ہوئی۔ دسمبر ۵۴ء میں امریکہ کے ساتھ ملٹری ایڈوائزری اینڈ کوآپریشن کا معاہدہ ہوا۔ پشاور روڈ پر سپریم کورٹ کی بلڈنگ کی جگہ ہمارا میس ہوا کرتا تھا۔

معاہدے کی تقریب اسی میس میں ہوئی وہاں بھی ایوب خان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ تیز پنجابی بول رہے تھے ان کا لہجہ مکمل ہزاروی تھا پھر اورنگزیب کی نسیم کے ساتھ شادی ہو گئی اور وہ ایوب خان کے داماد بن گئے۔ اورنگزیب اور میں بڑے اچھے دوست تھے لہذا ان کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ پھر میں سی جی ایس کا جی ٹو لگ گیا تو جنرل عمر اور نیجی خان کے ساتھ کئی مرتبہ ایوب خان سے ملا (جی ٹو ہمیشہ سی جی ایس کے ساتھ جاتا ہے) اس دوران میں متعدد تاریخی فیصلوں پر بھی وہاں موجود تھا مثلاً ایک مرتبہ؟ (آف دی ریکارڈ)

ایوب خان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ایوان صدر سے انہیں اسلام آباد چھوڑنے گیا۔ ایوان صدر چھوڑنے کا فیصلہ ہو گیا تو اس ناگوار فریضے کی ذمہ داری میرے سر آن پڑی۔ میں نے ایوب خان سے پوچھا آپ کب جائیں گے؟ انہوں نے کہا دن کے گیارہ بجے۔ میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو وہ تیار تھے ان کا سامان جاچکا تھا۔ مری روڈ پر بڑا رش تھا سکوارڈ کے ساتھ انہیں لے جانا ممکن نہیں تھا میں نے اپنی ذاتی گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی گاڑی نے ایوان صدر سے ٹرن لیا اور ایوب خان ایوان اقتدار سے ہمیشہ کے لئے باہر آ گئے۔ راستہ بھر وہ بہت اداس رہے میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا کبھی میری نظریں ان کے چہرے پر گرتیں تو وہاں گہری ہوتی شکنیں دیکھ کر اسی کی ایک لہر میرے جسم سے گزر جاتی۔ اسلام آباد ان کے ذاتی گھر پہنچ کر میں نے ان کے لئے دروازہ کھولا وہ باہر آ گئے گھر پر ایک ملازمت نظر ڈالی میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا "آفیسر تھینک یو دی ری مج" میں دو قدم پیچھے ہٹا اور انہیں آخری سیلوٹ کیا وہ مسکرائے اور دروازہ کھول کر اندر چلے گئے اور میں۔۔۔ واپس آ گیا۔

۶۵ء کی جنگ کے بعد میری یونٹ کھاریاں آگئی میں بنیادی طور پر کمانڈو ہوں۔ کھاریاں آنے کے تھوڑے عرصہ بعد مجھے کمانڈو یونٹ کا کمانڈر بنا کر مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا۔ میں ۳ نومبر ۶۶ء کو چٹاگانگ پہنچا میں وہاں ایک برس تک رہا۔ مشرقی پاکستان میں وہاں کے متعدد رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں مولانا بھاشانی سے ملاقات قابل ذکر ہے۔ بھاشانی بڑے مشکل آدمی تھے۔ میں نے ان سے بات شروع کی کہ ایسٹ اور ویسٹ کو اکٹھا رہنا چاہیے۔ علیحدگی پسندی مثبت بات نہیں وغیرہ وغیرہ وہ آرام سے سنتے رہے جب میری بات مکمل ہو گئی تو وہ بولے جناب آپ ہیں ایڈمنسٹریٹر اور ہم ہیں ایجنٹی ٹیئر۔ آپ اپنا کام کیجئے اور ہمیں اپنا کام کرنے

میں ۶۷ء میں واپس راوہ پٹنڈی آ گیا اور اسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری ٹو کمانڈر انچیف لگ گیا۔ کسی بھی شخص کی قابلیت کے بہترین معیار اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ میں نے نوکری کا طویل عرصہ منزل بجلی کی ماتحتی میں گزارا اس کی بنیاد پر میں دہلوی سے کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء سے آج تک بجلی خان جیسا اچھا آفیسر پاکستان آری میں کوئی نہیں آیا (میں صدر کی حیثیت سے یا فال آف ڈھاکہ سے صرف نظر کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں) شارب آفیسر گنڈا گنڈا ایڈمنسٹریٹر ویری انٹیلی جنٹ اور کیوک ڈسین۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوبیوں کا مجموعہ بنایا تھا۔ میں نے زندگی میں متعدد جرنیلوں کے ساتھ نوکری کی لیکن اپنے سٹاف کے ساتھ اس سے بڑھ کر کوئی کمانڈر اچھا نہیں ملا جو شخص اس کی ماتحتی میں رہا وہ تر گیا۔ وہ صحیح معنوں میں جج آف لیول تھے۔ ان میں کمزوریاں بھی تھیں۔ لیکن کمزوریاں تو سب میں ہوتی ہیں۔ انسان کا اصل کریڈٹ تو اس کی خوبیاں ہوتی ہیں۔ بجلی خان کے بارے میں باقی سب کچھ آف دی ریکارڈ۔

بجلی خان کی حکومت ریل کوڑیک پر واپس لانے کے لئے آئی تھی لیکن کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آ گئے جن کے باعث ان کا دور بھی طویل ہو گیا۔ بس فوجیوں کو سیاست مار جاتی ہے فوجی "سٹیٹ فارورڈ" ہوتے ہیں جو ہے وہ ہے۔ آفیسر نے کسی فیصلے پر دستخط کر دیے تو اسے "اون" کرے گا۔ کسی ماتحت پر نہیں ڈالے گا۔ جبکہ افسر شاہی کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہے وہاں کسٹمر کا آرڈر پوری تک آتا ہے اور درمیان میں بلا کسی بھی ماتحت پر ڈالی جاسکتی ہے۔ مزید مارشل لا ایوب خان کا ہو بجلی کا یا ضیاء کا کچھ لوگ فوراً ان کے گرد سرکل بنا لیتے ہیں اور اس کے بعد انہیں اس سرکل سے باہر نہیں جانے دیتے اور باہر والے یہ سرکل تو ڈر اندر آنا چاہتے ہیں جس سے صورتحال عجیب رنگ اختیار کر جاتی ہے یہ روایت آج تک قائم ہے۔

۱۷ء کی جنگ ہوئی تو میں جی ایچ کیو میں تھا۔ سارا کھیل میرے سامنے ہوا لیکن میں نے منہ نہ کھولنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے لہذا اس پر بالکل بات نہیں ہو سکتی۔ تاہم "فال آف ڈھاکہ" کے بارے میں ضرور کچھ کہوں گا مشرقی پاکستان میں بنگالیوں نے مغربی پاکستان کے شہریوں اور بہاریوں کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ گو آری بھی معصوم نہیں تھے ان لوگوں نے بھی زیادتی کی لیکن بنگالیوں نے تو صحیح معنوں میں انسانیت کی دھجیاں اڑا دیں۔ فال آف ڈھاکہ کے بعد جنرل بجلی خان نے عالمی سطح پر دکھانے کے لئے ایک دستاویزی فلم بنوائی۔ فلم کے ڈائریکٹر جنرل عربی تھے۔ فلم مکمل

ہوئے کے بعد اعلیٰ افسران کو دکھائی گئی تو یقین کریں وہ فلم دیکھنے کے بعد میرے اندر اسے دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں آج بھی مغربی پاکستان کے شہریوں اور بہاریوں پر ہونے والے ظلم کا خیال کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک کمرہ دیکھا جو بچوں کے کپڑوں، جوتوں اور بالوں سے چھت تک بھرا ہوا ہے۔ سید پور میں بنگالیوں نے ہزاروں بہاریوں کو لٹا کر مرنے کر دیا۔ چناگانگ میں بنگالی ڈاکٹروں نے مغربی پاکستان کے شہریوں اور بہاریوں کو باندھ کر ان کی ہڈیوں میں سرخیں لگا کر چھوڑ دیا اور وہ مرتے دم تک اپنی ہڈیوں سے ٹپتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ہماری فوج نے جب یہ مناظر دیکھے تو کیا وہ اپنے آپ پر قابو رکھ سکتی تھی۔ نہیں جناب ہرگز نہیں۔ تو انہوں نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی درست ہے کہ آپریشن کے دوران بے گناہ بھی مارے گئے نفرت بھی پیدا ہوئی زیادتیاں بھی ہوئیں لیکن ان لوگوں کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ خود میرے ایک عزیز آفیسر کے ساتھ بڑا ظلم ہوا اسے پڑ کر (آف دی ریکارڈ)۔

میری ذوالفقار علی بھٹو سے بہت ملاقاتیں ہوئیں ان میں کئی اہم نوعیت کی ہیں۔ میں بعض مصلحتوں کے باعث ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تاہم ان سے طویل میل ملاپ کی بناء پر میں نے انہیں غیر معمولی انسان پایا۔ "ویری شارب، ویری انٹیلی جینٹ" وہ محتاط طلب کا و مان پڑھنے کے ماہر بین السطور بات سمجھنے میں سینڈ سے بھی کم وقت لگاتے تھے انہیں مذاکرات میں حریف کو شکست دینے کا ملکہ حاصل تھا۔ رات کو بارہ بجے اندر گاندھی کے پاس بیٹھے اور اسے موم کر لیا یہ کسی معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور بس۔

۲۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے "ٹیک اوور" کیا تو میں بریگیڈیئر کے رینک سے ریٹائر ہو گیا۔ نوکری کے دوران ان تھک کام کا عادی ہو چکا تھا لہذا ہنگامہ خیز زندگی کے اختتام پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ میں واپس اپنے وطن کو نہمک چلا گیا جہاں میری آبائی زمینیں نہ جانے کب سے میری منتظر تھیں انہیں بے آباد بن کر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا وہ مجھ سے اپنا حق طلب کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا زمینداری کا ناج نہیں تھا لیکن محکمہ زراعت زرعی یونیورسٹی کے پروفیسروں اور لوکل زمینداروں کے تعاون سے میں نے یہ میدان بھی مار لیا اس کے لئے مجھے جتنی محنت کرنا پڑی وہ صرف میں جانتا ہوں لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۷ برس بعد میری زمینوں کے پچے چپے پر بزرگ لہلہا رہا تھا۔

۱۹۷۶ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے وزیر اعظم ہاؤس طلب کیا۔ میں گیا تو

انہوں نے کہا میں نے آپ کو نیپال میں غیر مقرر کر دیا ہے۔ آپ آغا شای سے بریفنگ لے کر ایک ہفتے کے اندر کھٹمنڈو پہنچ جائیں اور میں ایک ہفتے کے اندر کھٹمنڈو پہنچ گیا۔ ان دنوں ساؤتھ ایشیا کے حالات بہت خراب تھے۔ بھارت سے ہر قسم کے تعلقات منقطع تھے۔ دہلی میں ہماری ایجنسی بند تھی 'فلائنس' بھی آجائیں رہی تھیں۔ نیپال دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک تھا جس کے تعلقات شروع دن سے پاکستان کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ شاہ بریندرا کے والد کنگ مہندرا ایوب خان کے بڑے گہرے دوست تھے وہ یہاں سے بنیادی جمہوریت کا نظام لے کر گئے اور نیپال میں اسے "پنچائیت سسٹم" کا نام دے کر رائج کر دیا۔ یہ نظام ۶۰ء سے ۸۳ء تک نیپال میں چلتا رہا۔ جغرافیائی حوالوں سے نیپال افغانستان کی طرح "لینڈ لاٹ کنٹری" تھا اور بین الاقوامی سفارتی قوانین کے تحت اسے ٹرانزٹ ٹریڈ کا حق ملا ہوا تھا۔ لیکن جنوبی ایشیا میں "تھانیداری" کی وجہ سے بھارت نے ٹریڈ اور ٹرانزٹ کو ایک بنا دیا تھا جبکہ ٹرانزٹ حق ہے اور ٹریڈ "وارہ" مزید بھارت نے ۵۰ء میں اس سے زبردستی "ٹریڈی آف پیس" پر دستخط بھی کرائے تھے جس سے بھارت کا نیپال پر معاشی اور سماجی دباؤ مزید بڑھ گیا۔ ان دنوں ہماری فارن پالیسی کا مقصد جنوبی ایشیا میں دو طرفہ تعلقات کو کثیر القومی تعلقات کی شکل دینا تھا مثلاً ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا اور چین سے انفرادی سطح پر تعلقات بہتر بنائیں جب ایک ملک سے تعلقات مضبوط ہوتے تو اس کے دوست ممالک کے ساتھ بھی تعلقات استوار ہو جائیں گے چنانچہ اس دور میں ہماری پالیسی "دوست کا دوست بھی دوست اور دشمن کا دشمن بھی دوست" قسم کی تھی میں ان حالات میں کھٹمنڈو پہنچا وہاں جا کر میں نے نیپال کی زبان لکھنا، بولنا اور پڑھنا سیکھی۔ پورا نیپال گھوما۔ ۶ ہزار میل سے زائد ٹریکنگ کی تمام پہاڑوں پر گیا تمام علاقوں کی تہذیب و ثقافت کو قریب سے دیکھا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے نیپال کا ماہر سمجھا جانے لگا۔ میں نے پاکستان سے نیپال کی ٹریڈ شروع کرائی۔ انہیں کپڑا، چینی اور چھوٹی مشینری چاہیے تھی ہم نے دی اور ان سے عمارتی لکڑی، ریلوے سلیپروں اور بجلی کے پولوں کے اوپر لگنے والی ٹیک وڈ خریدی اور ان کے طلباء کو پاکستان کے تعلیمی اداروں میں سولتیس ویں۔ آرمی کے ساتھ رابطہ بڑھایا بہر حال میں انتہائی کوشش سے نیپالیوں کو مزید قریب لے آیا۔ میں وہاں دو برس کے کنٹریکٹ پر گیا تھا لیکن مجھے وہاں چھ برس رہنا پڑا۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو میں ٹریکنگ پر تھا۔ میں عموماً ایسے سفروں کے دوران چھوٹا سا ریڈیو اپنے پاس رکھتا تھا۔ نیپال میں حیرت انگیز طور پر لاہور شیٹن بہت گھیسر آتا ہے۔ میں نے اس دن

ریڈیو آن کیا تو خبر ملی کہ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے ٹیک اور کر لیا ہے۔ میں فوری طور پر واپس سفارتخانے آ گیا، ہمیں جنرل ضیاء کی طرف سے پہلا پیغام فارن پالیسی کے بارے میں ملا۔

بھٹو کی پھانسی کے دو روز بعد نیپال کی کیونست پارٹیوں نے ہنگامے شروع کر دیے۔ احتجاج ہوا، طلباء نے مل کر جلوس بھی نکالا، مگر لوکل ایڈیٹرز کی وجہ سے یہ موڈ زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ اسی دوران مجھے نیپال کا سب سے بڑا ایوارڈ "گورکھا دشندہ" ملا جو اس سے قبل کسی غیر کو نہیں دیا گیا۔ نیپال میں قیام کا ایک اور یادگار واقعہ بنگلہ دیش کے صدر ضیاء (خالدہ ضیاء کے خاوند) کا دور نیپال ہے۔ ضیاء میرے پرانے جاننے والے تھے۔ رائل پبلش میں ان کے اعزاز میں استقبال کیا تھا۔ میں نے کور آف ڈیپلومیٹس کے ڈین کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا۔ مختصر سی ملاقات ہوئی اور اگلی صبح وہ واپس چلے گئے۔ دو روز بعد ۱۹ اپریل کو وہ چٹاگانگ میں مارے گئے۔

شیخ زید بن سلطان الیہان کے بھٹو سے ذاتی مراسم تھے اسی لئے بھٹو کی پھانسی کے بعد عرب امارات میں پاکستان کے خلاف شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ امارات کی حکومت کا ہمارے سفیر سے رویہ بہت خراب تھا۔ ان حالات میں ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کو مجھے عرب امارات کا سفیر بنا دیا گیا۔ اس سے قبل سفیر تباد لے کے بعد براہ راست نئے ملک پہنچ جاتے تھے لیکن جنرل ضیاء نے یہ طریقہ کار تبدیل کر دیا "اب سفیر نئے ملک جانے سے قبل پاکستان آتا تھا۔ وزارت خارجہ میں خارجہ پالیسی سے متعلق بریفنگ لیتا تھا۔ تمام وزارتیں اسے بریفنگ دیتیں۔ صوبوں میں گورنرز اور چیف سیکرٹریز سے ملاقات کرتے اور آخر میں اس کی صدر سے تفصیلی ملاقات ہوتی" میں اس عمل سے گزرنے کے بعد عرب امارات پہنچ گیا۔ سفیر کے کاغذات کی وصولی ڈیپلومیسی میں دوستی ناپنے کا بیرونی میسر یا ٹمس ٹیسٹ ہے۔ حکومتیں جس ملک سے ناراض ہوں ان کے سفیروں کے کاغذات ایک طویل عرصے تک وصول نہیں کئے جاتے اور جب تک صدر مملکت کاغذات وصول نہیں کرتا سفیر کو سفیر کا پروٹوکول نہیں ملتا۔ خوش قسمتی سے میرے وہاں پہنچنے کے تین روز بعد مجھے کاغذات پیش کرنے کی اجازت مل گئی جس سے فارقی حلقوں میں حیرت پھیل گئی کیونکہ یہ اس وقت کے لحاظ سے بڑی تبدیلی تھی۔ کاغذات کی وصولی کے طریقہ کار کے مطابق صدر سفیر سے کاغذات لے کر اسے بخالیتا ہے چند منٹوں تک رکھی گفتگو کے بعد سفیر کو فارغ کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں جنرل ضیاء نے اس روایت میں لٹچ کا اضافہ بھی کر دیا تھا۔ بہر حال باتیں شروع ہو

گئیں چند لمحوں بعد گفتگو رسمی تکلف سے نکل کر ذاتی دلچسپیوں میں الاقوامی صورتحال اور جغرافیائی تبدیلیوں پر آگئی اور وہ دو منٹ ۴۰ منٹ تک وسیع ہو گئے۔ میرے بعد سوڈان کے سفیر نے کاغذات پیش کرنا تھے چیف پروٹوکول دس پندرہ منٹ بعد آتا اور سامنے کھڑا ہوتا لیکن شیخ اسے ہاتھ کا اشارہ کر کے واپس بھیج دیتے۔ میں نے شیخ کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ پاکستان کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ ہر سال تین ماہ وہ یہاں گزارتا ہے۔ وہ سندھ، بلوچستان اور پنجاب سارا گھوما ہوا ہے لہذا اس کے پاس بہت معلومات تھیں بہر حال اس ملاقات کے بعد دونوں ممالک کے درمیان سرد مہری کی برف ٹوٹ گئی۔

میں نے زندگی میں تین شاہ دیکھے۔ ان میں شیخ زید بہت منفرد "رولز" ہیں۔ اکتوبر میں انہوں نے پاکستان آنا تھا مجھے بلایا میں نے ملاقات کے دوران پوچھا آپ وہاں کتنا قیام کریں گے؟ تو اس نے مجھے دیکھا اور کہا۔ "سفیر پاکستان میرا اپنا ملک ہے جب میری مرضی جاؤں گا اور جب جی چاہا واپس آؤں گا۔" میں نے فوراً ان کی یہ بات پکڑ لی اور پھر جب بھی پاکستان کو متحدہ عرب امارات کی ضرورت پڑی میں شیخ کے پاس گیا اور انہیں کہا۔ "جناب! شیخ یہ میرے نہیں آپ کے ملک کا مسئلہ ہے" اور وہ فوراً کہتے "ڈن"۔ میرے دور سفارت میں شیخ سے جنرل ضیاء کی پانچ ملاقاتیں ہوئیں زیادہ تر ملاقاتیں بیرونی دوروں کے دوران ابوظہبی میں مختصر قیام پر ہوئیں۔ شیخ نے پاکستان میں جنرل ضیاء سے دو اہم نوعیت کی ملاقاتیں کیں۔ میں ان ملاقاتوں میں موجود تھا۔ معاملات حساس نوعیت کے ہیں لہذا میری خاموشی بہت ضروری ہے (آف دی ریکارڈ) شیخ زید کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ پاکستان میں شکار کھیلنے کے بعد ٹھوکر نیا زبیک لاہور میں اپنے محل میں قیام کرتے ہیں، صدر انہیں گورنر ہاؤس دعوت دیتے ہیں اور اگلے روز شیخ صدر کو اپنے محل میں بلاتے ہیں جنرل ضیاء نے شیخ زید کو ایک مرتبہ اسلام آباد میں ایوان صدر بھی بلایا، میں امارات میں چار برس رہا تھا۔

۱۳ مارچ ۸۵ء کو میرا تبادلہ سعودی عرب ہو گیا، سعودی عرب میں اپنی ذمہ داریوں کا احوال بتانے سے قبل میں بیک گراؤڈ بتانا چاہوں گا۔ تیل بیچنے والے ممالک نے "اوپیک" کے نام سے ایک تنظیم بنا رکھی ہے اس تنظیم نے پٹرولیم کے وسائل اور آبادی کی بنیاد پر تیل بیچنے کا کوئی مخصوص کر رکھا ہے مثلاً ابوظہبی کا کوٹہ 1.2 ملین بیرل روزانہ اور سعودی عرب کا ۶ ملین بیرل ہے اسی حساب سے انڈونیشیا، تائیچیریا، لیبیا، ایران اور کویت کا بھی کوئی مخصوص ہے۔ ۱۹۸۲ء تک

ہر سال تیل کی قیمتوں میں اوسطاً ۲ ڈالر فی بیرل اضافہ ہوتا تھا لیکن اس برس تیل کی قیمت اچانک ۲۸ ڈالر فی بیرل ہو گئی تو ان ریاستوں نے سوچا اگلے برس قیمت یقیناً ۳۲ ڈالر تک پہنچے گی لہذا انہوں نے اس حساب سے اپنا بجٹ بنالیا۔ دوسری طرف تیل خریدنے والے بڑے ممالک امریکہ، جاپان اور جرمنی نے قیمتوں میں اضافے کے باعث تیل سٹاک کرنا شروع کر دیا اور اگلے برس تیل خریدنے سے صاف انکار کر دیا "اوپیک" نے تیل کا کوئی کم کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس سے قیمتیں بڑھنے کا امکان تھا لیکن لیبیا، تائیچیریا اور انڈونیشیا نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ لیبیا نے کہا میں تو اگلے پانچ برس تک کا تیل اسلحہ کے عوض روس کو بیچ چکا ہوں، تائیچیریا نے کہا میرے عوام بھوکے مرجائیں گے ہم تیل نہیں پی سکتے، انڈونیشیا نے "اوپیک" کے مین ترجمان اور سعودی وزیر تیل ذکی یحیٰی کو کہا جناب! آپ کی آبادی ۸ ملین اور ہماری ۱۶۲ ملین ہے آپ تیل بیچیں تو آپ کے ہر فرد کو اتنے ڈالر آتے ہیں جبکہ ہمارے شہری کے حصے تو چند سینٹ آتے ہیں ہم کوئی کم نہیں کر سکتے آپ کریں اور ایران عراق جنگ کی وجہ سے وہ دونوں ممالک اس صف میں شامل ہی نہیں تھے لہذا تیل کی قیمت ۲۸ سے گر کر ۱۱ اور ۱۲ ڈالر فی بیرل ہو گئی۔ ابوظہبی میں ۹ ڈالر بھی آیت ہوا۔ تیل کی بڑی منڈی نوٹروڈیم ہے جہاں ریٹ بنتے ہیں اور تیل بکتا بھی ہے۔ سعودی عرب میں تیل کے سارے وسائل شاہی خاندان کے ہاتھ میں ہیں۔ تمام سعودی شہزادوں کا کوئی مخصوص ہے وہ تیل کا جہاز بھر کر نوٹروڈیم لے جاتے ہیں جہاں اس کی بولی لگتی ہے، اس برس شہزادے تیل لے کر گئے تو ذکی یحیٰی نے تیل فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور ان شہزادوں نے تیل کے بھرے جہاز پانچ ڈالر فی بیرل کے حساب سے بیچ دیے۔ اس بحران کے نتیجے میں سعودی عرب معاشی بحران کا شکار ہو گیا بجٹ تباہ ہو گئے لینے کے دینے پڑ گئے لہذا انہوں نے اخراجات کم کرنے کا فیصلہ کیا جب عملدرآمد ہوا تو بجلی پاکستانی مزدوروں پر گری۔ اس وقت پاکستان کے ۸ لاکھ افراد سعودی عرب میں ملازمتیں کرتے تھے سعودی حکومت نے ان سب کو نکالنا شروع کر دیا اکثریت کی ایک ایک سال کی تنخواہیں کمپنیوں کے پاس تھیں جس کو نکالا اس نے تنخواہ کا مطالبہ کیا تو جواب ملا کوئی سال وال کی تنخواہ نہیں یہ تین ماہ کے پیسے پکڑو اور بھاگو، پاکستانی مزدوروں کی اس بے دخلی سے پاکستانی معیشت پر بھی بڑی زور پڑی درمیانہ ٹک گیا، بے روزگاری بڑھ گئی اور شدید معاشی بحران کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ ان حالات میں جنرل ضیاء الحق نے مجھے سعودی عرب بھیج دیا، سعودی عرب میں قانون نہیں دوستی چلتی ہے جو دوست ہے اس کے لئے سارے قانون

نرم اور جو دوست نہیں اس کے لئے کوئی رعایت نہیں۔ میرے دور سفارت میں جنرل ضیاء دس مرتبہ سعودی عرب گئے، وہ اسلامک پیس کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے لہذا ایران عراق تصفیے کے لئے دو مرتبہ جدہ آئے، محمد خان جو نجو نے بھی تین مرتبہ سعودی عرب کا دورہ کیا میں وہاں ساڑھے ۳ برس رہا یکم اکتوبر ۸۷ء کو میری سر دس ختم ہوئی تو سعودی عرب میں پاکستانیوں کے حالات معمول پر آچکے تھے۔

میں چار پارچہ ماہ کی طویل پھٹی گزرا کر فروری ۸۸ء میں پاکستان واپس آیا تو جنرل ضیاء سے ملاقات ہوئی ہم پرانے دوست تھے، پرانی یادوں کی باتیں ہونیں، ملکی حالات پر انہوں نے کچھ کہا اور نہ میں نے کچھ پوچھا اس وقت میں غیر سرکاری آدمی ہو چکا تھا لہذا سرکاری گفتگو بے وقوفی تھی..... چند ماہ بعد ۱۵ جون کی شام مجھے ایوان صدر سے فون آیا اور جنرل ضیاء نے مجھے طلب کیا میں پہنچ گیا تو انہوں نے کہا میں نے تمہیں گورنر سرحد بتا دیا ہے تم کل صبح میرا جہاز لے کر پشاور پہنچ جاؤ، وزیر اعلیٰ جنرل فضل حق تمہارا استقبال کریں گے۔ میں نے یس سر کہا اور دوسرے روز پشاور ایئر پورٹ پر ہمارا پرانا ساتھی اور دوست فضل حق مجھے "ریسیو" کر رہا تھا۔ میں، جنرل ضیاء اور فضل حق بہت پرانے دوست تھے۔ جنرل ضیاء نے یہ فیصلہ اچھی ٹیم بنانے کے لئے کیا تھا، فضل حق میری آمد پر بہت خوش تھے انہوں نے بڑی خوشدلی سے میرا استقبال کیا اور اس کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا..... کہاں فوج کی سخت زندگی پھر زمینوں پر مل چلا کر آب و ہوا کا کھیل پھر سفارت کی تکلفات سے بھرپور زندگی اور پھر اختیار و اقتدار کا انوکھا دور، میں جب اپنے موٹر کائے ماشی پر نظر ڈالتا ہوں تو میں حیران ہو جاتا ہوں، کہاں سے شروع کیا کہاں کہاں رہا، کہاں کہاں رکھا، کتنے لوگ ملے، کتنے لوگوں نے متاثر کیا اور کتنے لوگ آ کر چلے گئے..... صاحب یہ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔

میں ضیاء ایئر کرش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، ساری باتیں سنی سنائی ہیں لہذا بات کرنا فضول ہے۔

ضیاء میرا دوست تھا میں نے زندگی کا طویل دور اس کے ساتھ گزارا۔ میں نے صرف صدر مملکت ضیاء الحق کو نہیں دیکھا۔ میں لیفٹیننٹ ضیاء، میجر ضیاء، کرنل ضیاء، بریگیڈیئر ضیاء اور جنرل ضیاء الحق کے بھی بہت قریب رہا۔ ہم نے راتیں اکٹھی گزاریں، سارا سارا دن اکٹھے گھومے پھرے، سائیکلوں پر پھرتے رہے جب خدا نے گاڑیاں دیں تو بھی ساتھ رہے اور اس طویل تجربے

کی بنیاد پر میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں میں نے جنرل ضیاء میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی وہ صدر بن کر بھی چرائے کے سرد ہنگلے میں کونکوں کی انگلیٹھی کے پاس بیٹھا ضیاء ہی رہا ایسا ضیاء جو مجھ سے باتیں کرتا تھا لیکن اس کے ذہن میں بار بار یہ بات گردش کرتی رہتی تھی کہ ابھی اس نے عصر کی نماز بھی پڑھنی ہے، بہت شریف آدمی تھا اس میں عجز تھا۔ شروع دن سے مہمان کو باہر تک چھوڑ کر آتا تھا۔ صدارت کے دور میں بھی اس نے اپنی یہ عادت بھائی۔ بولتا لم تھا، میں اور ہمارا مشترکہ دوست کرنل ہاشم اس سے ملنے گئے واپس آنے لگے تو اس نے کہا کل ۱۴ اگست کی تقریب ہے آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔ تو ہم نے کہا نہیں تم چلے جانا ہم خود آ جائیں گے، تقریب میں ہم نے دیکھا وہ سائیکل پر آ رہا ہے وہ دن بعد میں نے پوچھا صدر ہو کر سائیکل پر سفر کیسا لگا؟ تو کہنے لگا پوری زندگی سائیکل چلائی ہے اب کیا محسوس ہوتا تھا؟ اپنے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اچھا فیملی ممبر تھا تھک ہار کر گھر آتا لیکن اہل خانہ کو دیکھتے ہی مطمئن اور خوش نظر آتا۔ رشتہ داروں کا بڑا ساتھ دیتا تھا۔ جب میجر تھا تو مجھے ساتھ لے کر اپنے ایک دور دراز کے رشتہ دار کی تعزیت کے لئے گیا، ہم نے بڑی مشکل سے گھر تلاش کیا جب صدر ہوا تو بھی رشتہ داروں کو نہیں بھولا۔ ان تھک کام کرتا تھا۔ میں مارشل لا کے شروع میں پاکستان آیا آری ہاؤس میں جنرل ضیاء سے ملاقات ہوئی، ہم دیر تک باتیں کرتے رہے پرانی دوستی کی باتیں اہل خانہ کے مسائل پھر نیپال کی باتیں پھر کینس تو میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ ہم نیپال سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جس سے بھارت کو نقصان پہنچے گا۔ ام نے کھانا بھی اکٹھے کھایا رات کو بارہ بجے میں نے اجازت طلب کی تو اس نے میز پر فائلوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تم تو جا کر سو جاؤ گے لیکن میں نے ابھی ان سے بھی ڈیل کرنی ہے۔ اگلی صبح گیارہ بجے ایوان صدر سے مجھے ایک لحاف موصول ہوا جس میں دو تنگوں کا خط تھا۔ یہ خط سیکرٹری کا مرس کے نام تھا جس میں صدر مملکت نے کہا تھا کہ کل ان کی ملاقات نیپال میں پاکستانی سفیر سے ہوئی اس میں انہوں نے یہ یہ تجاویز پیش کیں۔ آپ ان سے مل کر ان کو قابل عمل بنائیں، خط پڑھ کر میں نے سوچا، میں بارہ بجے آیا اس کے بعد اس شخص نے فائلیں پڑھیں پھر یہ خط تحریر کیا سو یا صبح دفتر آیا اور یہ خط جاری کیا اور اگر یہ معمول ہے تو یہ بندہ ہے یا جن جن جنرل ضیاء انسانی جذبات کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ مولانا عارف حسینی کے قتل پر پشاور میں بڑی نفرت پائی جاتی تھی۔ جنرل ضیاء ان کے جنازے میں شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن لوگوں نے منع کر دیا تو مجھے فون کیا میں نے کہا ہاں ضرور آئیں اور پھر شاہی باغ جنازے کے

دوران لوگوں نے صدر کو اپنے درمیان پایا تو وہ حیران رہ گئے اور بڑھتی ہوئی ٹینشن ایک دم ختم ہو گئی۔

ضیاء ایز کرش کے فوراً بعد جنرل اسلم بیگ اسلام آباد آئے اسحاق خان سے ملے اور تمام گورنرز کو کال کر لیا گیا۔ ہم سب جمع ہوئے تو اسلم بیگ نے ملک میں مارشل لا لگانے کی تجویز پیش کر دی۔ ہم نے کہا مارشل لا کس گراؤنڈ پر لگایا جائے اس سے پہلے جتنے مارشل لا لگے وہ افواہ تفریق، ایڈ آرڈر کی خراب صورتحال اور قتل و غارت گری کی وجہ سے لگے اس وقت ملک معمول کے مطابق چل رہا ہے جلوس نکلے نہ قتل و غارت گری ہوئی، سول وار کا خطرہ نہیں، گروہی تصادم کا امکان نہیں تو مارشل لا کس بنیاد پر لگایا جائے؟ مینٹگ کی مجموعی رائے یہی تھی کہ ملک میں جمہوری طریقے سے تبدیلی لائی جائے گو اس وقت یہ فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن بعد کے حالات نے ہمارے اس فیصلے کی تصدیق کر دی، رہی بات جنرل اسلم بیگ مارشل لا کیوں لگانا چاہتے تھے؟ تو اس کی کئی وجوہات تھیں جن کا میں ذکر نہیں کروں گا۔ جنرل بیک موجود ہیں آپ لوگ ان سے رابطہ کریں ہاں البتہ (آف دی ریکارڈ)

غلام اسحاق خان فطرتاً نازل آدمی ہیں، تعاون کرتے ہیں، صاحب علم ہیں، متوازن ہیں اور منطق سے آگے چھپتے نہیں ہوتے۔ انہوں نے یہ تمام خوبیاں فطرتاً نہیں پائیں، ڈویلپ کی ہیں، وہ ایسے تجربہ کار آدمی ہیں جنہوں نے زندگی میں بڑے گرم سرد موسم دیکھے۔ میں ایک مرتبہ فانا کے مسائل پر انگریز کے دور کی ایک فائل دیکھ رہا تھا تو ایک حوالے کے نیچے غلام اسحاق خان پرائیویٹ سیکرٹری ٹو چیف منسٹر لکھا ہوا تھا اور غلام اسحاق خان کے دستخطوں کے نیچے اپریل ۱۹۳۶ء درج تھا، آپ خود اندازہ کریں جو شخص آج سے ۵۰ برس پہلے اتنی اعلیٰ پوسٹ پر رہا ہو اس نے زندگی میں کیا کیا نہ دیکھا ہوگا۔ آپ پاکستان کے کسی محکمے کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھیں وہ اپڈا ہو، پی آئی ڈی سی ہو یا سٹیٹ بینک اس کی بنیادوں میں آپ کو غلام اسحاق خان نظر آئیں گے۔ آپ فنانس کی بات کریں، دفاع کی بات کریں یا انتظامیہ کی بات کریں غلام اسحاق خان کی شاندار خدمات سامنے آئیں گی، مینٹگ میں جب کسی محکمے کی بات چلتی تو وہ فوراً کہتے فلاں من کو جب میں اس شعبے کا ڈائریکٹر جنرل تھا تو یہ مسئلہ اس طرح چلا تھا پھر اس طرح ہوا اور بات یہاں پر ختم ہوئی وغیرہ وغیرہ ہم لوگ چیزوں کو گھمانے پھرانے کے بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن وہ فوراً پکڑ لیتے تھے بلاشبہ وہ حکومتی امور کے بڑے ماہر تھے۔

غلام اسحاق خان صدر بنے تو ان سے تعلقات میں اضافہ ہوا، بے نظیر بھٹو کی حکومت بنی تو انہوں نے مجھے سرحد کی گورنر شپ سے الگ نہیں کیا اس کے تین فیلڈ ہو سکتے ہیں۔ اول ہو سکتا ہے صدر اسحاق نے بے نظیر بھٹو سے کہا ہو جنجود بڑا قابل آدمی ہے پارٹی نہیں ہے ضیاء کا دوست ضرور تھا لیکن اپنے کام کا سو فیصد خیال رکھتا ہے اگر سسٹم ٹھیک طریقے سے چلانا چاہتی ہیں تو سرحد کا گورنر جنجود کو ہی رہنا چاہیے وغیرہ وغیرہ دوم پیپلز پارٹی کے سرحد کے رہنماؤں آفتاب شیر پاد، افتخار گیلانی وغیرہ نے میرے لئے بے نظیر پر بڑا دباؤ ڈالا، سوم میں کسی کی طرف داری نہیں کرتا تھا، آئین کے مطابق کام کرتا تھا، سیاسی لڑائی نہیں لڑی چنانچہ بے نظیر بھٹو نے اگلے ۲۰ ماہ تک مجھے قبول کر لیا۔

میں نے گورنر شپ کے دور میں کبھی نا جائز بات نہیں کہی۔ اسی لئے جو کہا بے نظیر نے فوراً مان لیا، صدر اسحاق یقیناً میری طرف داری کرتے تھے اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ میں سیاسی پیچیدگیوں میں نہیں پڑا۔ سٹیٹ فاروڈ رہا۔ آئین کو مد نظر رکھتے ہوئے صاف کہہ دیا، ایسا ہونا چاہیے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آفتاب شیر پاد اور میر افضل میں نے دونوں کے ساتھ کام کیا بڑی اچھی گوارڈینیشن رہی۔ فانا کی وجہ سے صوبہ سرحد کا نظام دوسرے صوبوں سے مختلف ہے۔ یہاں فانا کا انچارج گورنر ہوتا ہے اور فانا ارکان اسمبلی کے حوالے سے صدر کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے، انتظامی تقسیم میں بعض ڈویژن میں اضلاع بھی ہیں اور ایجنسیاں بھی۔ اضلاع وزیر اعلیٰ کے ماتحت ہوتے ہیں اور ایجنسیاں براہ راست گورنر کے زیر اثر، لہذا وہاں گورنر اور وزیر اعلیٰ کے اختلافات کا خدشہ رہتا ہے۔ اس میں کوہاٹ ڈویژن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اس کے دو اضلاع ہیں کوہاٹ اور کرک جبکہ اس میں تین ایجنسیاں ہیں، ایف آر کوہاٹ، اور کڑئی، اور کرم ایجنسی وہاں ہر دور میں مسئلہ رہا ہے کہ کمشنر کون لگائے؟ وزیر اعلیٰ یا گورنر لیکن میں نے جب بھی کمشنر کا فیصلہ کیا، وزیر اعلیٰ کے مشورے سے کیا جس وجہ سے سرحد میں وزیر اعلیٰ گورنر اختلافات پیدا نہیں ہوئے۔

بے نظیر نے اس دور میں مجھے کئی مرتبہ کال کیا لیکن سب سے بڑا ایٹو لکڑی بنی، سرحد کے ملک جنگل کے جنگل کاٹ کر ٹرکوں میں بھرتے اور پنجاب میں لا کر بیچ دیتے، راستے میں پوچھا جاتا تو کہتے ہم تو افغانستان سے لائے ہیں، ان کارروائیوں سے جنگل برابر ہو کر رہ گئے لہذا میں نے لکڑی کی ایکسپورٹ پر پابندی لگا دی، دوسرے روز سارے ملک جمع ہو کر وزیر اعظم ہاؤس پہنچ

گئے اور لٹ گئے، مہر گئے کاوا دیا شروع کر دیا، وزیراعظم نے مجھے طلب کیا میں نے انہیں ساری بات بتائی، صدر اسحاق خان نے بھی میرا بھرپور ساتھ دیا اور وزیراعظم میری بات مان گئیں۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہوئی تو میں عمرے پر گیا ہوا تھا واپس آیا تو اطلاع ملی بہر حال میں معمول کے کام میں مصروف ہو گیا۔

نواز شریف وزیراعظم بنے تو ان کے ساتھ بڑی کوآرڈینیشن رہی، نواز شریف بڑے اچھے دوست ہیں لیکن ان میں وہ گرفت نہیں تھی جو وزیراعظم میں ہونی چاہیے وہ پریش کے سامنے دب جاتے تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر نواز شریف پر دائیں بائیں سے پریش نہ ہوتا تو شاید ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتیں بہر حال تجربے کے لئے وقت چاہیے علم تو بندہ مطالعہ اور پریکٹس سے حاصل کر لیتا ہے لیکن تجربہ۔۔۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور نواز شریف کو ابھی وقت چاہیے۔

اسحاق نواز شریف اختلاف بنایا، جو نیچو چپقلش سے مختلف نہیں تھے وہی لائن کراسنگ، اگر دونوں اپنی حدود میں رہتے تو بہت سارے واقعات نہ ہوتے۔ نواز شریف نے کئی ایسی باتیں کیں، کئی ایسے ایکشن لئے جو انہیں نہیں لینا چاہیے تھے اور ان کے ان اقدامات کے باعث اسحاق خان کی بجائے کوئی اور صدر ہوتا تو وہ بھی پوائنٹ آؤٹ ضرور کرتا، دونوں میں کئی اختلافات تھے، مثلاً رولز آف بزنس تھے، سلیکشن آف جوائنٹ چیفس آف سٹاف، سلیکشن آف آرمی چیف اور ایئر چیف پھر ان کی ریٹائرمنٹ، تقرریاں، تبادلے، این ایف سی کے فیصلے، ان پر عملدرآمد کا مسئلہ بس اختلافات ہی اختلافات تھے۔ میں نے ان دونوں میں صلح کرانے کی بہت کوشش کی لیکن اختلافات بہت بڑھ چکے تھے لہذا میں بہتری کا کوئی راستہ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا باقی اس سارے قصے کی تفصیلات تو میں نہیں بتاؤں گا۔ پھر نواز شریف چلے گئے، مزاری آئے وہ چلے گئے تو نواز شریف پھر واپس آ گئے لیکن جلد ہی وہ دوبارہ چلے گئے اور۔۔۔ معین قریشی آ گئے انہوں نے آتے ہی تمام گورنروں سے استعفیٰ طلب کر لئے اور یوں گورنرشپ سے مستعفی ہو گیا۔

یارو! میں نے ان آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا اور ان کانوں سے بہت کچھ سنا۔ میں کھرے لوگوں کے کلمات حق کا بھی گواہ ہوں اور جابر حکمرانوں کے کروفر کا یعنی شاہد بھی، میں نے نیٹوں کے نیچے لیٹے جوان بھی دیکھے اور گولیوں سے بھاگتے غدار بھی، میں نے دستور بنتے بھی دیکھے اور ان کے پھنے اوراق آڑتے بھی، میں نے حکمرانوں کو اقتدار کے ایوانوں میں جاتے اور

پھر خالی ہاتھ واپس آتے بھی دیکھا، بہت سی سازشیں میرے سامنے پروان چڑھیں اور کئی راز میرے سامنے افشا ہوئے۔ بہت کچھ ہے میرے اندر۔ مجھے پتہ ہے یہ راز یہ سوچیں مانور بھی بن سکتی ہیں لیکن یارو! میں نے خاموش رہنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرا یہ فیصلہ درست ہے یقیناً یہ قوم کے ساتھ زیادتی ہے، تاریخ کے ساتھ ظلم ہے، لیکن میں اپنی فطرت کا کیا کروں؟ یہ مجھے فیصلہ کر لینے کے بعد توڑنے کی اجازت نہیں دیتی، میں نے کبھی سگریٹ نہیں پیہا، شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، میرا منہ پان کے ذائقہ تک سے آشنا نہیں اور یہ سب کچھ میں نے کسی گناہ یا ثواب کے ڈر سے نہیں کیا، بس میں نے فیصلہ کر لیا۔ اور پھر پوری زندگی اسے بھایا۔ اسی طرح میں نے زندگی میں کچھ اور فیصلے بھی کئے جن پر میں کاربند رہا۔ کاربند ہوں اور کاربند رہوں گا بہر حال میرا آپ کا اور اس ملک کا خدا حافظ

• • •

ڈاکٹر اقبال واہلہ

یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔

ایک روز آدمی کی ایک سٹاف کار میرے دفتر کے باہر کی اور اس میں سے تین سمارٹ آفیسر اتر کر میرے کمرے میں داخل ہوئے ان میں سے نسبتاً زیادہ سنجیدہ اور متین شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے زاہد علی اکبر کہتے ہیں پاکستان آدمی میں ہر گینگڈیز ہوں۔ ان سے ملنے یہ میں ملٹری انٹیلی جنس کے چیف ... اور یہ ہیں انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ۔“ میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ زاہد علی اکبر بیٹھ گئے لیکن دوسرے حضرات نے چل پھر کر میرے دفتر کا جائزہ لینا شروع کر دیا کھڑکیوں کے پردے پلٹ کر دیکھے۔ میز اور کرسیوں کے نیچے نظر دوڑائی اور رائٹنگ ٹیبل کی ساری درازیں کھول کر دیکھیں اس دوران میں حیرانی سے سامنے بیٹھے زاہد علی اکبر کو دیکھتا رہا وہ اس ساری کارروائی سے لائق اور پرچہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ دس پندرہ منٹ تک جاری رہا آخر کار وہ دونوں حضرات پائے زاہد علی اکبر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر مسکرائے اور میرے چہرے پر نظریں جما کر بولے۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا نیوکلیئر پلانٹ تعمیر کرنا ہے۔“ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں کے قریب کسی طاقتور بم کا دھماکا ہوا ہو میری ساری سوچیں مفلوج ہو گئیں۔ ایک طویل وقفے تک میں سامنے دیوار پر لگے وال کلاک کے پنڈولم پر نظریں جمائے بیٹھا رہا اور وہ تینوں حضرات ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ سجائے مجھے دیکھتے رہے۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے ان سے اس ”نظر انتخاب“ کی وجہ پوچھی۔ زاہد علی اکبر نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”اس لئے کہ آپ پاکستان کے واحد سٹرکچرل انجینئر ہیں جنہوں نے اس شعبے میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ دوسرا طویل تحقیق کے بعد ہمیں معلوم ہوا

ڈاکٹر اقبال ولہد ایک غیر معروف انسان ہیں۔ وہ بنیادی طور پر کچرل انجینئر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک انوکھا کام لیا۔ انہوں نے ہمارے ایٹمی پلانٹ کی عمارت ڈیزائن کی۔ اس انٹرویو میں آپ کو معلوم ہوگا کہ پاکستان نے کن حالات میں کیونکر پلانٹ بنایا تھا۔

آپ ہی پاکستان کے وہ انجینئر ہیں جو کام کے دوران ٹھیکیداروں سے کمیشن نہیں کھاتے۔" یہ الفاظ سن کر میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ "اگر میں انکار کر دوں تو" میں نے خوف اور فخر کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔ "نہیں آپ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور ویسے ہم ایک محبت وطن پاکستانی سے اس کی توقع بھی نہیں کرتے۔" زاہد علی اکبر نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ وہ لوگ مزید آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے ہم اس دوران نیوکلیئر ٹیکنالوجی اور اس کے لئے درکار تعمیراتی ساز و سامان پر گفتگو کرتے رہے جب وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے تو میں دیر تک اپنے خاموش دفتر میں بیٹھا آنے والے کل کے بارے میں سوچتا رہا ایسا کل جس میں میں نے اپنے ملک کا کل تعمیر کرنا تھا۔ مضبوطی اور یادگار کل۔ جس کے ساتھ ہی میرا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو جانا تھا۔

کہو نہ پلانٹ کے لئے تین ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ زاہد علی اکبر کی ٹیم جس کے ذمے مالی اور ٹیکنیکی ساز و سامان فراہم کرنا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ٹیم جو ہری بم بنانا جس کا کام تھا اور میری ٹیم ایٹمی پلانٹ کے لئے جگہ کا انتخاب اور عمارت کی تعمیر میرے ذمے تھی۔ بھٹو صاحب ایٹمی پروگرام کے بارے میں بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو بھٹو نے اپنے مشیروں کو بلا کر کہا "یہ سائنس کے پاس ایٹم بم ہے یہودیوں کے پاس بھی ایٹم بم ہے یہاں تک کہ ہندو بھی اس ہتھیار کے مالک ہیں اب میں ایٹم بم چاہتا ہوں۔ دی اسلامک بم" ساتھ ہی انہوں نے ماہرین کی ٹیم تشکیل دینے کا حکم دے دیا فوراً ٹیم بن گئی جس نے چند ماہ کی تحقیق کے بعد اعلان کر دیا کہ صرف پاکستان نہیں بلکہ موجودہ حالات میں تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی کا حصول ناممکن ہے۔ لیکن بھٹو صاحب نے اس رپورٹ کو بیچ مانسنے سے انکار کر دیا کچھ دنوں بعد ان کی ملاقات ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے کرائی گئی جنہوں نے از سر نو فیئر پلٹی رپورٹ تیار کرنے کی ہامی بھری۔ چھ ماہ بعد وہ دوبارہ بھٹو سے ملے اور انہیں یہ خوشخبری سنائی کہ اگر بے انتہا پیسہ بے شمار افرادی قوت اور ماہرین کی ایک وسیع ٹیم ہو تو جوہری ٹیکنالوجی کے حصول کے ۶۰ فیصد امکانات ہو سکتے ہیں۔ بھٹو نے چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کیں اور پھر بڑے عزم سے بولے "میں یہ رسک لینے کے لئے تیار ہوں" اور اگلے ہی روز اسلامی دنیا کے سب سے بڑے منصوبے پر کام شروع کرنے کا فیصلہ ہو گیا اب بھٹو کو ایک ایسا مخلص اور قابل شخص چاہیے تھا جو پورا پلانٹ اپنی نگرانی میں تیار کر سکے چنانچہ انہوں نے ایسا بندہ فراہم کرنے کی ڈیوٹی آرمی چیف جنرل ضیاء الحق کو سونپ دی۔ جنرل ضیاء نے چند دن کی محنت کے بعد انجینئر جگ کور

کے بریگیڈیئر زاہد علی اکبر کو بھٹو کے سامنے پیش کر دیا۔ وزیر اعظم نے ان کے ساتھ گپ لڑائی اور دو گھنٹے بعد رخصت کے وقت "لیس ہی از دی مین" کہہ کر جنرل ضیاء کو اس انتخاب پر مبارکباد دے دی۔ یوں زاہد علی اکبر نے کام شروع کر دیا لیکن اگلے چند روز میں ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا وہ تھا نیوکلیئر پلانٹ کے بارے میں بورڈ کا نیم دلانہ تعاون یہ بورڈ غلام اسحاق خان، آغا شامی اور این جی اے قاضی پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ کھل کر تعاون نہیں کرتے تھے۔ زاہد علی اکبر نے اس عدم تعاون کی شکایت جنرل ضیاء سے کی انہوں نے انہیں وزیر اعظم سے براہ راست بات کرنے کا مشورہ دیا۔ زاہد علی اکبر اگلے روز بھٹو کے اے ڈی سی جنرل امتیاز کے پاس حاضر ہو گئے۔ جنرل امتیاز انہیں لے کر وزیر اعظم کے پاس پہنچ گئے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی تو زاہد علی اکبر نے تمام مسائل وزیر اعظم کے گوش گزار کر دیے۔ بھٹو نے سنا اور بولے "آپ کو جو اختیارات چاہیں کل کاغذ پر لکھ کر بورڈ کے پاس لے جائیں میں غلام اسحاق سے کہہ دوں گا وہ منظوری دے دیں گے لیکن" انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور کہا "بس مجھے ایٹم بم چاہیے ہر صورت میں ہر قیمت پر" زاہد علی اکبر نے انہیں سیلوٹ کیا اور واپس آ گئے۔ اس رات انہوں نے ایک کاغذ پر پاکستان کی تاریخ کے انتخابی وسیع اختیارات کی فہرست مرتب کی اور اگلے روز لے کر نیوکلیئر بورڈ کے سامنے پیش ہو گئے۔ غلام اسحاق خان نے پیپر پڑھا تو ان کے پسینے چھوٹ گئے انہوں نے زاہد علی اکبر کو مخاطب کر کے کہا بریگیڈیئر "جو اختیارات آپ مانگ رہے ہیں وہ تو پرائم منسٹر آف پاکستان کے پاس بھی نہیں ہیں" زاہد علی اکبر نے یہ سنا تو اپنی کرسی سے کھڑے ہو کر کہا "مجھے پرائم منسٹر آف پاکستان نے ایٹمی پلانٹ کو قابل عمل بنانے کا کام سونپا ہے جو ان اختیارات کی عدم موجودگی میں ممکن نہیں اگر آپ اس کی منظوری نہیں دے سکتے تو میں ابھی جا کر وزیر اعظم سے معذرت کر لیتا ہوں۔" بقول زاہد علی اکبر غلام اسحاق خان نے آغا شامی اور قاضی کی طرف دیکھا اور پھر مایوسی کے عالم میں سر ہلا کر میری درخواست پر دستخط کر دینے جس کے بعد اس عظیم منصوبے کے لئے زاہد علی اکبر کو عظیم تر اختیارات مل گئے وزیر اعظم کے اختیارات سے بھی بڑھ کر اختیارات۔

ہمارے لئے جگہ کا انتخاب سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ زاہد علی اکبر نے چند جیالوجسٹ حضرات سے مل کر جہلم کے نزدیک سطح مرتفع پر ایک پوائنٹ پسند کیا تھا لیکن مجھے وہ جگہ سیکورٹی کے حوالے سے زیادہ پسند نہ آئی دوسرا وہ دارالحکومت سے نسبتاً دور بھی تھی سنگل ہائی وے کی وجہ سے اس پوائنٹ پر ٹریفک کا رش بھی زیادہ تھا لہذا مجھے خدشہ تھا کہ ہم اس جگہ اپنی سرگرمیاں زیادہ دیر تک

چھپا نہیں سکیں گے لہذا جب میں نے اپنی رپورٹ پیش کی تو بورڈ نے میرے اعتراضات سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد ہم زیادہ بہتر اور انتہائی محفوظ جگہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہم نے بہت سی گھانیاں واویاں اور میدان کھنگال مارے لیکن ہمیں کہوڑے سے بہتر مقام نہیں ملا۔ اس کام کے لئے کہوڑے ہی کیوں بہتر ہے؟ یہ وہ سوال تھا جو مجھ سے بورڈ کے تمام ممبران نے اس وقت پوچھا جب میں نے ”کہوڑے“ کی سفارش کی تھی میں نے پاکستان اور اسلام آباد کے نقشے نوٹس بورڈ پر لگا کر انہیں سمجھانا شروع کر دیا نمبر اکہوڑے کی زمینی ساخت ایسی ہے کہ اس پر فضا سے حملہ تقریباً ناممکن ہے۔ دشمن کے طیاروں کے لئے ایٹمی پلانٹ کی جگہ کا تعین آسان نہیں ہو گا۔ نمبر ۲ عام بڑی گزرگاہوں سے دور ہونے کے باعث ہم اس منصوبے کو اس وقت تک خفیہ رکھ سکتے ہیں جب تک ہم اپنا ہدف حاصل نہیں کر لیتے۔ نمبر ۱۳ اسلام آباد سے بہت قریب ہونے کے باعث اعلیٰ حکام بغیر کسی پروٹوکول اور شور شرابے کے کسی بھی وقت اس کا معائنہ کر سکیں گے اس کے علاوہ میں نے بورڈ کو اس جگہ کے بعض ایسے پہلو بھی بتائے جو میں سیکورٹی رسک کے باعث اخبار میں شائع نہیں کر سکتا بہر حال اس طویل میننگ اور بے شمار سوال و جواب کے بعد اسلامی دنیا کے پہلے نیوکلیئر پلانٹ کی تعمیر کے لئے ”کہوڑے“ کا تعین ہو گیا۔

میں نے اگلے چند ماہ میں ”کہوڑے پلانٹ“ کا نقشہ بنا کر پیش کر دیا ہم نے نقشے میں ایٹمی ری ایکٹر کی حفاظت کو مکمل طور پر مد نظر رکھا لہذا اب اگر بلندی سے کہوڑے پلانٹ کو دیکھا جائے تو مختلف عمارتوں میں سے اس عمارت کا تعین کرنا انتہائی مشکل ہے جس میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات ہیں دوسرا پہلو جو ہمارے مد نظر تھا وہ ایک عمارت سے دوسری عمارت کے درمیان محفوظ فاصلہ تھا تاکہ اگر خدا نخواستہ فضائی حملہ ہو تو ایک عمارت پر گرائے گئے ہم دوسری عمارت کو متاثر نہ کریں۔ بہر حال نقشہ منظور ہو گیا جس کے بعد ہم لوگوں نے ایٹمی ری ایکٹر کی تعمیر کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ خزانے کا منہ کھلا تھا افرادی اور ٹیکنیکی قوت کی فراوانی تھی۔ ہم دنیا کے کسی کونے میں بننے والی چیز کی فرمائش کرتے زاہد علی اکبر اگلے روز وہ ہمارے سامنے پیش کر دیتے۔ پاکستان کے تمام سفارتخانوں کو خصوصی حکم جاری کر دیا گیا تھا کہ ہم جس چیز کا آرڈر دیں وہ ہر قیمت پر خرید کر فوراً بھیجی جائے۔

تینوں ٹیموں کی ترتیب کچھ یوں تھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہم سب کے سربراہ تھے وہ ہمیں جو بنانے کا حکم دیتے میری ٹیم فوراً اس حصے کی تعمیر شروع کر دیتی جبکہ میری ٹیم کو اس تعمیر کے

لئے جتنا پیسہ اور جو وسائل درکار ہوتے وہ ہمیں زاہد علی اکبر فراہم کرتے بہر حال اس وقت ہم سب میں ایک لگن ایک تڑپ اور کچھ کرنے کی شدید خواہش تھی چنانچہ ہم نے دن دیکھا اور نہ ہی رات۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا کہ ہم پورا پورا دن بغیر کچھ کھائے پیئے گزار دیتے۔ رہی نیند تو جتنی دیر یہ پراجیکٹ جاری رہا ہم میں سے کسی شخص نے چار پانچ گھنٹے سے زیادہ نیند نہیں لی بہر حال ہماری محنت رنگ لائی اور ہم اسلامک دنیا کا پہلا ایٹمک ریکٹر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ نامکمل ٹیکنیکی مہارت و وسائل کی انتہائی کمی اور وسیع عالمی دباؤ کے باوجود اس منصوبے کی تکمیل کسی بڑے معجزے سے کم نہیں تھی بیسویں صدی کا وہ معجزہ جس نے نہ صرف پاکستانیوں کو حیران کر دیا بلکہ ترقی یافتہ عالمی طاقتوں کو بھی پریشان کر دیا بہر حال یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی۔ وہ اگر نہ چاہتا تو شاید ہم تیسری دنیا کے ایک انتہائی پسماندہ ملک کے باشندے اتنے بڑے معجزے کا کبھی سوچ بھی نہ سکتے؟

جن دنوں کہوڑے پلانٹ پر کام جاری تھا ان دنوں ہم نے ڈیرہ غازی خان میں بھی ایک ”انرجیٹ پلانٹ“ تعمیر کیا تھا۔ اس کی وجہ ڈی جی خان سے تھوڑی دور ”بغل چور“ کی وہ پہاڑیاں تھیں جہاں یورینیم پایا جاتا تھا اس چھوٹے سے ”انرجیٹ پلانٹ“ کی تعمیر سے اس یورینیم کو افزودہ کرنے میں سہولت ہو گئی بعد ازاں اس افزودہ یورینیم کو کہوڑے لایا جاتا تھا جہاں سے اسے مزید افزودہ کر کے ”وینین گریڈ“ تک لایا جاتا تھا۔

پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے یا نہیں؟ کیا ہمارا ایٹمی پروگرام رول بیک ہو چکا ہے؟ وغیرہ وغیرہ یہ سوال ہیں جو مجھ سے میرے اکثر ملاقاتی پوچھتے ہیں۔ میں ہنس کر جواب دیتا ہوں پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ سن کر اکثر لوگ حیران ہو جاتے ہیں لیکن میں وضاحت کر کے ان کی حیرانی دور کر دیتا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے پاکستان کے پاس ساختہ شکل میں کوئی ایٹم بم موجود نہیں لیکن پاکستان کے پاس بم بنانے کا تمام سامان موجود ہے اور وہ چند دنوں کے نوٹس پر فوراً ایٹم بم اسمبل کر سکتا ہے۔ رہا ”رول بیک“ کا سوال تو آج سے سولہ سترہ برس پہلے ہی ہم اس لیول تک پہنچ چکے تھے جہاں سے ہمارے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنا کسی مائی کے ال کے بس کی بات نہیں تھی۔ ساری جدید دنیا جانتی ہے اگر کوئی قوم ایک بار ”ایٹمک پاور“ بن جائے تو پھر اس کی وہ قوت سب نہیں کی جاسکتی لوگ مجھ سے کہوڑے پلانٹ کی سیکورٹی کے بارے میں بھی پوچھتے ہیں میں ان سے کہتا ہوں اب اگر کہوڑے پلانٹ بنانے والے بھی چاہیں تو اس ایٹمی

ری ایکٹری کی ایک اینٹ کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔ ہماری فضائیہ کے طیارے چوبیس گھنٹے فضا میں کھوٹ پلانٹ کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ عجیب و غریب سطح زمین اس کی حفاظت ہے۔ اسے کم فضا سے ٹھیک نشانہ لگانا بھی تقریباً ناممکن ہے اندر کیا ہوتا ہے اس کا علم کسی ایک شخص کو نہیں لہذا اس کی جاسوسی بھی بہت مشکل ہے اور سب سے بڑھ کر خدا ہمارا حامی و ناصر ہے چنانچہ ہمیں اور ہمارے انا تک پروگرام کو کوئی خطرہ نہیں۔

شاید ۸۹ء میں ایک تقریب میں اس وقت کی وزیراعظم مختار مدبے نظر بھٹو سے میری ملاقات ہوئی، میزبان نے جب کھوٹ پلانٹ کے حوالے سے میرا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور مجھ سے کہنے لگیں ”ڈاکٹر صاحب مجھے یقین ہے آپ نے کھوٹ پلانٹ بہت مضبوط بنایا ہوگا“ میں نے مسکرا کر کہا ”مختار مہماریت کے حوالے سے تو مجھے اس کی مضبوطی کا یقین ہے لیکن وہ سیاسی سطح پر کتنا مضبوط ہے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میرے یہ الفاظ سن کر وہ ناراض ہی ہو گئیں بہر حال مجھے ان کی ناراضگی سے کیا لینا دینا۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے انا تک پروگرام اور مسئلہ افغانستان دو ایسے ایسے تھے جنہیں اگر ہم مناسب طریقے سے استعمال کرتے تو نہ صرف پاکستان کے سارے قرضے ادا ہو سکتے تھے بلکہ ہمارا شمار دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں بھی ہوتا لیکن جنرل ضیاء الحق نے ان مواقع سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم اگر انا تک پروگرام پر اسلامی دنیا کو اعتماد میں لے لیتے اور ان پر یہ ثابت کر دیتے کہ اس ٹیکنالوجی سے ہم یورپی یلغار کو بحر ہند سے دور رکھ سکتے ہیں تو وہ یقیناً کھل کر ہماری مالی مدد کرتے یوں ہم بڑی آسانی سے ترقی کرتے چلے جاتے۔ اسی طرح افغان ایٹم کے دوران بھی جنرل ضیاء کے پاس پاکستان کے سارے قرضے معاف کرانے کا بھرپور موقع تھا۔ وہ امریکہ سے سٹیٹکریڈٹ میزائل اور ایف سولہ حاصل کر سکتے تھے تو وہ قرضے بھی معاف کرا سکتے تھے۔ ہمارے سامنے حسنی مبارک کی مثال ہے انہوں نے گلف وار کے دوران صرف غیر جانبدار رہنے کی شرط پر امریکہ سے ۷ بلین ڈالر کا قرضہ معاف کرا لیا افغانستان پر روسی حملے کے دوران تو پاکستان امریکہ اور یورپ کے لئے واحد دفاعی بارڈر تھا... لیکن افسوس ہماقت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

کھوٹ پلانٹ کی تکمیل کے بعد میں نے پاکستان کے کئی منصوبوں پر کام کیا ان میں ”لوکو موٹو“ شاف کالج کوئٹہ جیلو پارک اور چشمہ پلانٹ شامل ہیں۔ کچھ صنعتیں بھی لگائیں لیکن ملک کی سیاسی ابتری سے پریشان ہو کر میں جنوبی کوریا چلا گیا جہاں میں نے کوریا کی ترقی کے لئے

۵ بلین ڈالر کے منصوبوں پر کام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت دی کچھ عرصہ ”متزنائیہ“ میں بھی کام کیا وہاں بھی بڑی عزت تھی یورپ اور مل ایٹ کے چند ممالک میں بھی میری کمپنی نے خدمات سرانجام دیں لیکن مجھے کوریا نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان لوگوں کی ایمانداری خود کو اعلیٰ قوم بنانے کے جذبہ اور عزت نفس کا دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ اگر کوئی ترقیاتی منصوبہ مقررہ مدت سے صرف ایک دن آگے چلا جائے تو کوریا کی ساری کی ساری نیم مستعفی ہو جاتی ہے۔ ان کے ایک ایک منصوبے کی منظوری پارلیمنٹ دیتی ہے اگر کسی منصوبے کے لئے ایک ڈالر بھی اضافی خرچ آئے تو اس کی منظوری پارلیمنٹ سے لینا پڑتی ہے۔ میں وہاں کے بیوروکریٹس اور انجینئروں کو تربیت بھی دیتا رہا تھا میں نے ان جیسے ایماندار افسر پوری دنیا میں نہیں دیکھے۔ مجال ہے کوئی شخص رشوت یا بخشش کے بارے میں سوچ بھی لے کاش ہمارا ملک بھی ایسا ہی ہو میں جب بھی باہر سے لوٹتا ہوں میرے دل سے یہی آواز نکلتی ہے۔

یہ جون ۱۹۹۲ء کی بات ہے واشنگٹن میں میری رہائش گاہ پر بش سینئر کی کچن گیٹ کا ایک ممبر مجھے ملنے آیا۔ یہ دراصل چار لوگوں کا ایک گروپ تھا جن کا بش پر بہت اثر و رسوخ تھا۔ جب بش صدر بنا تو امریکہ کی دوسو بڑی اہم اور حساس پوزیشنوں پر انہی لوگوں نے تقرریاں کیں بہر حال گفتگو کے دوران پریسلر ٹریمیم اور پاکستان کی اقتصادی امداد پر گفتگو چل پڑی امریکی سینئر نے اپنے ہونٹ میرے کانوں کے نزدیک لاتے ہوئے سرگوشی کی ”ہم پریسلر ٹریمیم چندہ دن میں ختم کر سکتے ہیں“ میں چونک کر سیدھا بیٹھ گیا ”لیکن کیسے؟“ میرے جواب سے استعجاب بھلک رہا تھا ”بڑا آسان ہے اگر پاکستان فلاں کمپنی کو لاٹنگ کا ٹھیکہ دے دے۔“ سینئر نے اسی راہ دراندہ لہجے میں جواب دیا۔ میرے لئے بڑی حیران کن خبر تھی بہر حال میں نے مزید تفصیلات پوچھیں تو پتہ چلا بنیادی طور پر وہ کمپنی انہی چار لوگوں کی تھی اور وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے عموماً کام کرا لیتے تھے میں نے فیس پوچھی تو پتہ چلا صرف دس لاکھ ڈالر سالانہ بہر حال پریسلر ٹریمیم کے خاتمے کے عوض رقم کچھ زیادہ نہیں تھی میں نے دوسرے دن سیکرٹری جنرل خارجہ اکرم ذکی سے رابطہ کیا انہوں نے نواز شریف سے بات کرنے کا وعدہ کیا ایک ہفتہ گزر گیا لیکن اکرم ذکی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا میں نے دوبارہ رابطہ کیا تو اکرم ذکی نے صرف ”میاں صاحب نہیں مان رہے“ کہہ کر فون بند کر دیا مجھے بہت افسوس ہوا بہر حال میں نے امریکہ میں موجود چند دولت مند پاکستانیوں سے رابطہ کیا وہ لوگ مل کر دس لاکھ ڈالر دینے کے لئے تیار ہو گئے اسی

دوران ہمارا ایک جاننے والا پاکستانی مجھے ملاوہ گلف میں ایک بہت بڑا تعمیراتی ادارہ چلا رہا تھا اسے جب ہماری مجبوری کا پتہ چلا تو اس نے ۱۰ لاکھ ڈالر اپنی بیب سے ادا کرنے کا عندیہ دے دیا۔ یہ ہمارے لئے بڑی خوشخبری تھی ہم اگلے روز رقم کا چیک لے کر اس بینکر کے پاس چلے گئے وہ ملائین اس نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا ”پاکستان میں حکومت بدلنے والی ہے آپ یہ کام نئے لوگوں پر چھوڑ دیں“ آپ یقین کریں یہ ہمارے لئے ایک نئی خبر تھی کیونکہ اس وقت تک پاکستان کے سیاسی حالات بالکل پرسکون تھے اور دور دور تک تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں اگلے ماہ پاکستان آ گیا یہاں بھی میں نے اپنے ذرائع سے سیاسی حالات کا اندرونی جائزہ لیا تو مجھے وہاں بھی کوئی گڑبڑ نظر نہ آئی۔ مجھے اس امر کی سینیٹر کے اعتماد اور اٹل لہجے پر بڑی حیرت ہوئی لیکن جواکی کے آخر میں جب میری ملاقات اس وقت کے آرٹی چیف جنرل آصف نواز سے ہوئی تو میں نے ان کے تبدیل ہوئے لہجے سے بہت کچھ سمجھ لیا۔

میں اپنے ذرائع کا اعلان نہیں کر سکتا مگر یہ سچ ہے کہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں ایک بہت بڑا انقلاب پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا کچھ لوگ غلام اسحاق خان اور نواز شریف کی چھٹی کر کے کر ملک میں ٹیکنوکریٹس کی حکومت لانا چاہتے تھے یہ فارمولا اس حد تک مکمل ہو چکا تھا کہ ان لوگوں نے آئی ایم ایف کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو وزیراعظم بننے کے لئے تیار کر لیا تھا جس نے شیروانی بھی سلوالی تھی جبکہ وزیر خزانہ کے عہدے کے لئے شاہد جاوید پر کی تیار بیٹھے تھے مجھے اطلاعات کا وزیر بننے کی پیش کش کی گئی لیکن میں نے اس فوفی کھیل میں شرکت سے انکار کر دیا کیونکہ ان لوگوں کا پروگرام تھا کہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد پاکستان کے پانچ سو کے قریب اہم لوگوں کو گولی سے اڑا دیا جائے بعد ازاں ناجائز طریقوں سے دولت کمائے والے تمام لوگوں کو مارچریل میں بند کر کے ان سے کالا دھن وصول کیا جائے۔ گو منصوبے کے مطابق یہ بڑا آئینڈیل انقلاب تھا لیکن میں اس کشت و خون میں نہیں پڑنا چاہتا تھا کیونکہ اقتدار میرا منشا سیات نہیں تھا تاہم میں نے اس سے اس منصوبے کو صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ کر لیا میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں کیونکہ اگر کسی کو اس منصوبے کی ذرہ بھی بھنک پڑ جاتی تو پانچ سو مقتولوں میں ایک شخص کا مزید اضافہ ہو جاتا اور وہ ہوتا ڈاکٹر اقبال دہلہ۔

ہو سکتا ہے منصوبہ آگے چل کر کامیاب ہو جاتا لیکن ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو پاکستان کے ایک بہت بڑے اخبار کے چیف ایڈیٹر نے یہ ساری کہانی نواز شریف کے گوش گزار کر دی۔ اس

چیف ایڈیٹر کو ان ”انقلابیوں“ نے اپنا بندہ سمجھ کر اعتماد میں لینے کی غلطی کر لی تھی نواز شریف فوراً متحاط ہو گئے اور ”انقلابی“ فوراً بکھر گئے لیکن اس سے قبل کہ نواز شریف کے خلاف کوئی مزید سازش تیار ہوتی آصف نواز کا انتقال ہو گیا (انقلابیوں کا آج بھی یہ کہنا ہے انہیں قتل کیا گیا) اور یوں انقلاب کی وہ سازش اپنی موت آپ مر گئی اور نواز شریف کو اقتدار کے مزید چند ماہ مل گئے لیکن وہ زیادہ دیر تک اپنی پوزیشن برقرار نہیں رکھ سکے وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ دوسری دنیا کے کسی کمزور ملک کا وزیراعظم جن اقوامی سازشوں کے خلاف زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکتا اسے گمراہی تھا سو وہ گر گیا۔ جنرل آصف نواز نہیں تو کوئی اور کسی دور ہلانے والوں کے لئے چیلوں کی کمی نہیں ہوتی۔

پاکستان میں انقلاب مولوی کے بس کی بات ہے نہ سیاستدان کے کیونکہ یہ دونوں طبقے جدید دوسری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ ہم جب انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ایک دن ہمارے وائس چانسلر نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ پاکستان میں انجینئرنگ پڑھنے والے ایک ایک طالب علم پر ساٹھ ہزار روپے ماہانہ خرچ آتا ہے (یہ آئی سے ۳۵ برس پہلے کی بات ہے) آپ خود فیصلہ کریں کیا ہم مولوی کی تعلیم پر بھی اتنا ہی پیسہ خرچ کرتے ہیں؟ نہیں تو پھر روایتی تعلیم حاصل کرنے والا ایک محروم شخص قومی ترقی اور انقلاب کی بات کیسے سوچ سکتا ہے یہی حال سیاستدانوں کا ہے جس شخص کا مسئلہ روٹی نہیں وہ ۱۳ کروڑ لوگوں کی ضروریات زندگی کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں آپ یقین فرمائیں اونچی سوسائٹی کی تقریبات میں یہ لوگ شراب پی کر غیر مکیدوں کے سامنے پاکستانیوں کی وہ برائیاں کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا۔ ان ملکی سیاستدانوں کی تعداد کسی بھی طرح سو ڈیڑھ سو سے کم نہیں جنہوں نے مجھ سے یہ کہا تھا ”ڈاکٹر صاحب امریکی قونصلیٹ آپ کا دوست ہے ہمارے بیٹے بھتیجے یا بھانجے کو امریکہ کا ویزہ لگوا دیں“ یہ لوگ جن کی پاکستان سے مکمنٹ اتنی کمزور ہے یہ ملک میں کیسے انقلاب لاسکتے ہیں۔ میں جب باہر جاتا ہوں تو مجھ سے اکثر غیر ملکی پوچھتے ہیں آپ جیسے ماہرین اور دانشور اپنے ملک کے لئے کام کیوں نہیں کرتے؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب کسی بھی ایسے پڑھے لکھے پاکستانی کے پاس موجود نہیں جو اپنا ہنر اپنی محنت اور اپنا ٹیلنٹ دوسرے ملکوں میں بیچ رہا ہے کیونکہ شاید ہمارے پاکستان اور ہمارے پاکستان کے اقتدار پر قابض لوگوں کو ہماری کوئی ضرورت نہیں دیکھنے یہ ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک ان لوگوں کو واپس لا

کران سے مناسب کام نہیں لیا جاتا جن کا ٹیلنٹ یورپ امریکہ اور مشرقی بعید کی رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں پاکستان کے بنیادی مسئلے کیا ہیں؟ میں ہنس کر کہتا ہوں صرف دو۔ مردم شماری اور کرپشن لوگ حیران ہو کر سوال کرتے ہیں صرف یہی۔ تو میں کہتا ہوں ہاں یہی وہ دو مسائل ہیں جن سے سارے مسائل جنم لیتے ہیں دیکھئے جس ملک کو اپنی کل آبادی کا علم نہیں وہ مستقبل کی تعمیر کا فارمولہ کیسے تیار کرے گا اسے کیسے علم ہو گا اسے کتنی سڑکیں درکار ہیں لوگوں کے لئے کتنے ہسپتال سکول اور ٹرانسپورٹ چاہیے۔ ہر سال کتنے لوگ نوکریوں کی عمروں کو پہنچتے ہیں کتنے افراد کی شادی ہوتی ہے اور کتنے لوگ اپنی نسل کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہیں۔ آبادی کے بارے میں کم علم کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم ترقی کرنا ہی نہیں چاہتے رہی کرپشن تو یہ صرف رشوت لوٹ کھسوٹ اور چوری چکاری تک محدود نہیں اگر کوئی شخص اپنا کام لگن محنت اور ایمانداری سے نہیں کر رہا تو وہ بھی پوری طرح کرپٹ ہے اگر دیکھا جائے تو اس نوعیت کی کرپشن مالی کرپشن سے زیادہ خطرناک ہے پہلی کرپشن مال لوٹی ہے جبکہ دوسری کرپشن پورے ملک کو تباہ کر دیتی ہے۔ ہم من حیث القوم ذہنی طور پر کرپٹ ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے کون ہے جو اس ذہنی کرپشن سے بچا ہو۔ کوئی شخص کوئی ادارہ کوئی انسٹیٹیوٹ؟ نہیں کوئی نہیں لہذا اتنا ہی ہمارا مقدور ہے۔

ملک کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے پڑھ لکھ ہنرمند اور دانشور لوگ آگے آئیں اور پوری قوم کے لئے ترجیحات طے کریں۔ ایک سال تعلیم کے لئے دوسرا سال معیشت کے لئے تیسرا سال معاشرتی ترقی کے لئے اور اس طرح ہم آگے بڑھتے چلے جائیں ایک ایک قدم تھوڑا تھوڑا سفر اگر ایسا نہ ہو تو مجھے ڈر ہے ملک میں وہ خونی انقلاب آئے گا جو سب کو ہالے جائے گا مولوی بچے کا نہ سیاست دان اور نہ ہی دانشور۔

میرے دفتر کا عملہ مجھ سے اکثر پوچھتا ہے 'سر آپ اکثر بیٹھے بیٹھے چونک اٹھتے ہیں' میں یہ سن کر ایک قہقہہ لگاتا ہوں اور کہتا ہوں شاید میرا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے لیکن اسی لمحے میرے اندر بہت گہرائی میں بہت سی خواہشیں ابھرتی ہیں جیسے کسی پرسکون اٹل اور پرشکوہ چٹان کے نیچے لاوا کروٹیں لیتا ہے اور اگر کبھی یہ لاوا لفظ بن کر میرے دماغ پر دستک دے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں شاید اب کوئی زاہد علی اکبر نہیں آئے گا جو آکر مجھ سے کہے 'ڈاکٹر صاحب آپ نے

اسلامک ورلڈ کا ایک اور بڑا منصوبہ تعمیر کرنا ہے آئیے میرے ساتھ آئیے اور فریاد بن کر چنا نہیں کاٹنا شروع کریں۔' ہاں میں اکثر سوچتا ہوں شاید اب میرے مقدور میں چند صنعتیں چند پلان اور کالج سے بھاگے ہوئے لڑکے لڑکیوں کی جنسی تفریح کے لئے چند پارک بنانا ہی رہ گئے ہیں۔ اس ملک کی تعمیر کا کوئی خواب شاید اب کبھی میرے دروازے پر دستک نہ دے؟ لیکن اس کے باوجود دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی ہر چاب پر میرے کان کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں شاید اس لئے کہ میرے اندر کا انسان ابھی اس ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا۔

• • •

فجر

یہ میرے چند فیچرز ہیں۔ تمام دوسرے سٹائیوں کی طرح میری سجاوٹ کا آغاز بھی ٹیبلٹ سے ہوا تھا۔ میں جب میگزین میں گیا تو میں نے فیچر لکھنے شروع کیے۔ یہ میرے ابتدائی دنوں کے مضامین اور فیچرز ہیں۔ میرا خیال ہے یہ مضامین میرے کالموں سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ معلومات افزا ہیں۔

فیض احمد فیض  
کے  
نرم گوشے

.....

یہ میری صحافت کے ابتدائی دن تھے۔ میں ایک روز اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا، خوشبو کی آندھی سی چلی اور اخبار کے اس چھوٹے سے دفتر میں رنگوں کی برسات ہونے لگی میں ہونٹوں کی طرح اسے دیکھنے لگا اس نے میرا نام پوچھا اور پھر لمبی سی ہا کہہ کر بولی۔ ”اوسے تم تو بہت چھوٹے ہو میں کبھی کوئی بابا ہوگا۔“ یہ بیگم سرفراز اقبال سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ ساٹھ برس کی شاندار خاتون تھیں۔ سکے زئی تھیں لہذا ان کی سفید چاندنی سی جلد کے نیچے سرخ خون سرکتا تھا اور سرکتے سرکتے نظر آتا تھا۔ انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا وہ انسان کی شکل میں ایک شہکار ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہ بھی محسوس ہوتا تھا جو شہکار انسانی ہاتھوں سے بنے ہوں یا انسانی خون سے ان پر کبھی زوال نہیں آتا۔

وہ بازار روڈ پر رہتی تھیں۔ میرا دفتر ان کے گھر کے قریب تھا چنانچہ ان سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ کبھی وہ آ جاتی تھیں اور کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا تھا ان کے گھر جا کر معلوم ہوا ان کے عشاق کی فہرست بہت طویل ہے۔ فیض صاحب ہوں، صادقین ہوں، ابن انشا، محمد طفیل یا پھر احمد فراز سب ان کی زلف گرہ گیر کے امیر رہ چکے ہیں۔ فیض صاحب نے اپنی عمر عزیز کا زیادہ حصہ ان کے گھر گزار دیا۔ صادقین نے ان کے لیے سینکڑوں پورٹریٹس بنائے اور ابن انشا نے اپنی آخری نظم ان پر لکھی۔ میں نے ان کی ذات ان کی شخصیت کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا وہ بنیادی طور پر ممتا کے رس سے بھری خاتون ہیں اور ان کے دامن میں پناہ لینے والے تمام لوگ کسی نہ کسی سطح پر بچے تھے اور دانشوروں کے ساتھ ان کے تعلقات کی نیچر ماں اور بچے جیسی تھی۔ بیگم سرفراز اقبال کا دل رازوں کا

فریاد تھا وہ جب میرے سامنے کھلیں تو انہوں نے بڑی بڑی شخصیات کے پروے اٹھا دیے انہوں نے لوگوں کو ان کے اصل قد اور اصل رنگ و روغن میں میرے سامنے رکھ دیا۔ ان کے ساتھ دس سال تک میری ملاقاتیں رہیں اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ہی اسی اس نے یازدہ روز اسلام آباد کو ان کے نام سے مقرب کر دیا۔ میں آج بھی جب بیگم ہر فراز اقبال روز سے گزرتا ہوں تو انہیں گھر کے سامنے رک جاتا ہوں اور اس کی کھنکی پیلوں تلے گزرا وقت فلم کی طرح میرے دماغ میں چلنے لگتا ہے۔

فیض صاحب کی روحانوی زندگی پر مبنی اس مضمون کا محرک بیگم ہر فراز اقبال تھیں انہوں نے ایک طویل عرصہ فیض صاحب کی صحبت اور محبت میں گزارا تھا۔ جب وہ میرے سامنے فیض صاحب کا نام لیتیں تو ان کے لہجے میں محبت کے ساتھ ساتھ عقیدت آتی تھی۔ ایک روز وہ فیض صاحب کا ذکر کر رہی تھیں تو میں نے اس مضمون کی ابتدائی طریق لکھنا شروع کر دیں۔

یہ ۳۷ء کی رات تھی۔

کینیڈا میں بعض ہندوستانی گھرانوں نے فیض صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ محلے کے بعد چھ پاؤنچ خواتین اور حضرات فیض صاحب کو لے کر ایک نیم چارپے کوٹے میں بیٹھ گئے اور فرمائشوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ فیض صاحب ذرا دھڑکنے لگے۔ فیض صاحب پھر کوئی آیا دل زار "آپ نے اس روشنیوں کے شہر نہیں سنا؟" مجھے تو آپ کوئی تازہ چیز سنائیں "اور فیض صاحب رگڑ رگڑا کر گہرا کس لگاتے ٹھوڑی کے نیچے پھیلی ہمارے مسکراتے اور اپنے مخصوص کھرورے انداز سے فوراً فرمائش بجا لاتے۔ ذرا تنگ روم سے باہر ہال کی مخصوص رات قطرہ قطرہ اتر رہی تھی اور اندر بیٹانوں کی خوشبو سرمستی کے عالم میں اڑتی "لڑکھاتی اور کسی زمین پلو سے ٹکرا کر بچہ ریز ہو جاتی لیکن ذرا ٹھہرے۔ وہاں صرف خوشبو نہیں تھی چند ٹھنڈی روشنیاں فیض صاحب کی فکر کی مستی میں جھیلی چند اسیوری سرگوشیاں اور احمد و سکون بھی تو تھا اور ان سب کے درمیان اپنے وقت کا سب سے بڑا تخلیق کار شیشے میں چلتی آگ پر نظریں جمائے سرگوشیوں میں یوں بول رہا تھا کہ لفظ کیفیت بن کر ہر چہرے پر اتر رہے تھے اور پھر جب رات بڑی طرح بھیک گئی اور پلوں کا ارتعاش تک دھک کر سونے لگا تو محفل بکھرنے لگی۔ تمام ہدم ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ بیٹانوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ خوشبو ہوا کے ساتھ چل پڑی اور رات حر کے دروازے پر دستک دینے لگی وہاں صرف آخری گھونٹ آخری کش اور فیض صاحب رو گئے۔ فیض صاحب نے ایش ٹرے میں رگڑ رگڑا اور انگڑائی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس سے قبل کہ وہ دروازے پر کھڑے میزبان جوڑے سے کمرے میں جانے کی اجازت لیتے ہال میں کانچ سکا "آپ بہت مشکل لکھتے ہیں" فیض صاحب کو جھٹکا لگا اور انہوں نے مزہ چاروں طرف

دیکھا سامنے نیم تاریکی میں سرخ موم سے بنا ایک بت بیٹھا تھا۔ فیض صاحب نے بوجھل آواز میں پوچھا "تو پھر میں کیسا لکھوں" بت نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا "آپ ہماری ہندی میں بھی تو لکھا کریں نا" فیض صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھا اور شکستہ سچے شہساز کی طرح تھوڑا سا جھک کر کہا۔ "ضرورتیں ہوں گی" بت نے ایک اور قہقہہ لگایا اور اٹھ کر اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہو گیا "خدا نے پوچھا۔" آپ کیا کرتی ہیں" بت ہوا۔ "صرف باتیں۔" ہاں آپ کو صرف باتیں کرنی چاہئیں۔" بت نے ایک اور بھرپور قہقہہ لگایا اور سارے ہال میں کاٹچ کی کرچیاں بکھر گئیں۔

یہ مریم تھی۔ دہلی کی مریم بلکرامی فیض صاحب کا آخری عشق اسی رات جب اندھیرے کی کوکھ سے صبح جنم لے رہی تھی تو فیض صاحب کے شعور پر ایک گیت دستک دے رہا تھا۔

چلتے گلیں یادوں کی چٹائیں  
آؤ کوئی گیت بنا میں  
جن کی راہ نکلتے جگ جگ  
چاہے وہ آئیں نہیں آئیں  
آنکھیں موندھ کے نت پل دیکھیں  
آنکھوں میں ان کی پرچھائیں  
اپنے اوروں کا تاج سجا کر  
بے دردی کے سامنے بانیں  
جب رونا آوے مسکائیں  
جب دل توڑے ویسے جلائیں  
پریت کی ریت انوکھی سا جن  
کچھ بھی نہ مانیں سب کچھ پائیں  
فیض ان سے کیا بات چھپی ہے  
ہم کچھ کہہ کر کیوں پہچنتائیں

اسی رات ایک قطعہ بھی اُترا۔

اپنے انعام حسن کے بدلے  
ہم تھی دامنو سے کیا لینا  
آج فرقت زدوں پر اظہ کرو  
پھر کبھی صبر آزما لینا

اگلی صبح فیض نے یہ ساری واردات اور یہ گیت اپنی "بہم ویرینہ" سرفراز اقبال کو لکھ بھیجا۔ فیض کی فیض شناس خاتون کے لئے یہ انوکھی بات تھی۔ اس نے فوراً فیض کو لکھا جس کا جواب فیض نے بیروت سے دیا۔ لکھتے ہیں "تم نے چاہنے والیوں کا ذکر کیا ہے وہ تو ہیں اور اللہ انہیں خوش رکھے لیکن ہر کسی سے تو وہ کچھ نہیں مانگ سکتے نہ مل سکتا ہے جو حسن اتفاق سے وہاں میسر آ گیا تھا اور جس کی طلب ہمیشہ کی طرح باقی ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی تو باتیں کرتی ہو اور شاید اسی وجہ سے اچھی لگتی ہو۔ تم مجھے اچھی ضرور لگتی ہو لیکن اس میں باتیں کرنے کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دخل ہے۔" (دامن یوسف۔ صفحہ ۸۲)

چند دنوں کی رفاقت کے بعد مریم بلکرامی دہلی اور فیض صاحب بیروت لوٹ آئے جس کے بعد تمام تر رابطہ خط و کتابت تک سٹ گیا۔ اسی دوران ایک بار فیض صاحب نے دہلی کا چکر بھی لگایا جہاں سے واپسی پر انہوں نے سرفراز اقبال کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے "نئے تعلق" کے بارے میں پتلے پتلے صرف ایک فقرہ لکھا لیکن یہ فقرہ کس قدر خالم تھا اس کا اندازہ صرف فیض کے عشاق ہی لگا سکتے ہیں، لکھتے ہیں۔

"اور یہ تمہیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی! ابھی تو بقول نکیل تمہیں اپنے دامادوں کو رام کرنا ہے اور تمہاری یہی صورت رہی تو شاید ان کی اداؤں کو بھی۔ ہمیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آئے گا کہ اس عمر میں دنیا والوں سے منہ موڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے لیکن تم جیسے لوگ یہ کرنے ہی نہیں دیتے بلکہ اب ہم دہلی گئے تو تم جیسے لوگوں میں ایک آدھ کا اور اضافہ ہو گیا اگرچہ یہ بات تم سے کرنی نہیں چاہیے۔" (دامن یوسف۔ صفحہ ۸۸)

مریم بلکرامی وسنت پارک دہلی میں رہتی تھی۔ سرخ و سپید رنگت کی اس دھان پان سی خاتون میں بے انتہا مشرقیت تھی وہ نرم ملائم آواز میں گھنٹوں باتیں کرتی تھی اور ہلکے ہلکے احساس میں ہر لحظہ چھلکتی تھی۔ اس کی یہ ادائیں فیض کے وجود کا حصہ بن گئیں۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فیض

کی اس سے کتنی ملاقاتیں رہیں وہ کبھی پاکستان آئی یا نہیں اور فیض کی شاعری کے کتنے حصے میں وہ احساسِ ہن کر دھڑکتی ہے۔ فیض کی زندگی میں یہ رازِ احرامِ مصر کی مردہ داستان کی طرح اندھیرے میں پڑا رہا یہاں تک کہ فیض نے اپنی رازدار سرفراز اقبال کو بھی زندگی میں مریم بلگرامی کا نام نہیں بتایا ہاں البتہ انتقال سے چند روز قبل جب فیض اسلام آباد میں بازارِ روزِ پرواقع سرفراز اقبال کے گھر آئے تو رخصت سے چند لمحات قبل انہوں نے سرفراز اقبال کو ایک لفافہ دیا اس کے بارے میں ان کا حکم تھا کہ اسے ان کی زندگی میں نہ کھولا جائے۔ یہ لفافہ ایک طویل عرصے تک سرفراز اقبال کے سوٹ کیس میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ فیض کی دو تین برسیاں گزر گئیں چیزیں رکھتے اور نکالتے وقت جب بھی سرفراز اقبال کی انگلیاں اس لفافے سے ٹکراتیں وہ اسے نکال کر دیکھتی چھو کر اس کا لمس محسوس کرتی مگر اسے کھول کر نہ دیکھتی۔ میں نے جب اس سے اس واردات کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ ”مجھے اس لفافے سے بہت ڈر لگتا تھا کیونکہ میں فیض صاحب کی واحد دوست تھی جو ان کی زندگی کے زیادہ تر رازوں سے واقف تھی لیکن فیض نے کبھی زندگی میں اتنے پراسرار انداز اور اتنی یقین دہانی کے ساتھ کوئی چیز مجھے نہیں دی تھی لہذا میں گھبراتی تھی کہ معلوم نہیں اس لفافے سے کیا نکل آئے اور میں معلوم ہونے کے بعد اس راز کو کہاں تک راز رکھ سکوں۔“

”بہر حال ایک طویل عرصے تک یہ راز اس لفافے میں بند رہا۔ اب پتہ نہیں سرفراز اقبال نے کس ذاتی کیفیت یا حادثے سے مجبور ہو کر یہ لفافہ کھولا لیکن کھلنے کے بعد اس سے چار پانچ خطوط نکلے جن پر مریم بلگرامی کا نام لکھا تھا۔ یہ خطوط جہاں ایک گہرے جذبے میں ڈوب کر لکھے گئے تھے وہاں یہ چند سطریں ایک ایسی خاتون کا پیکر بھی تراشتی ہیں جو ذوقِ مطالعہ اور جرأتِ اظہار کا مکمل ملکہ رکھتی تھی۔ ان خطوط میں نہ صرف ”مین اتج“ کی گرمائش پائی جاتی تھی بلکہ ایک فکری سرشاری اور سب کچھ لٹا کر بہت کچھ پالینے کی خواہش بھی پوری قوت کے ساتھ موجود تھی۔ ان خطوط میں سے ایک خط نذرِ قارئین ہے۔

جونم

کل تمہارا محبت نامہ دیکھ کر کچھ دیر تک یقین نہ کر سکی تمہارے Optimism سے بہت ہمت بندھ رہی ہے ورنہ یہ سوچ کر اب تو آدھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نہیں ہے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ تم تو دیارِ غیر کی

بات کر رہے ہو اور میں تو سوچتی ہوں کہ کہیں پر لوک میں بھی شاید ستارے نہ مل سکیں (کیا پر لوک میں بھی ستارے ہوتے ہیں؟) اُف! کیا کیا تمہارے آنے کی آس لے کر بیٹھے تھے! یقین اس لئے تھا کہ خود ”گھوڑے“ کے منہ سے یہ خبر ملے تھی۔ کانفرنس کے شروع ہونے سے آخر ہونے تک صبح شام کاؤنٹر پر جا کر پوچھ آتی تھی یہاں تک کہ جو صاحب کاؤنٹر پر رہتے تھے اور آنے والوں کی لسٹ رکھتے تھے مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کو ان کا بہت انتظار ہے آپ ان کی کیا لگتی ہیں۔ میں نے کہا Admirer تو کہنے لگے کہ وہ تو ہم سب ہی ہیں! اب اس کا کیا جواب۔ غرض جب تمہارے نہ آنے کا یقین ہو گیا تو کچھ ایسی عجیب سی مایوس کن ناامیدی ہوئی کہ دل ہی بیٹھ گیا۔ پریشان و مایوسی اور Frustration چھپانے کے لئے بہت کچھ کام بہت جلدی کرنے کی کوشش میں سیڑھیوں سے گر گئی اور داہنا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ چھ ہفتوں کے بعد چار روز پہلے پلاسٹر نکلا ہے تو ہاتھ کچھ عجیب ٹیڑھا میڑھا ہے چونکہ کمپوٹنڈ فریکچر تھا۔ سنتے ہیں کبھی بھی بالکل Normal نہیں ہو سکتا اور تھوڑی بہت اکثرن ہمیشہ رہے گی۔ اتنے دنوں کے بعد یہ پہلا خط اس ہاتھ سے لکھ رہی ہوں اور خوش ہوں کہ یہ تم کو لکھ رہی ہوں۔ ویسے بائیں ہاتھ سے اپنی والدہ کو خط لکھا کرتی تھی۔ (جن کو پڑھ کر وہ خوش ہونے کے عوض میں نے سناوہ خوب روتی تھیں) اور سوچتی تھی کہ اگر ہاتھ کھلنے کے بعد لکھ ہی نہ سکوں تو تم کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں کیوں نہیں لکھ رہی ہوں پھر یہ سوچتی کہ چلو ہاتھ ہی تو ٹوٹا ورنہ مر جاتی تو کون سا ان کو پتہ چل جاتا! غرض پڑھنے کے قابل تو لکھ ہی لیا۔

میرا نیا گھر اور تمہارا پودا دونوں ہی اس انتظار میں ہیں کہ کب ان کی قسمت چمکے۔ پودے نے تو اپنے آپ کو خوب سجالیا تھا کہ تم دیکھ کر خوش ہو گے Blossom! تنے بھر گئے تھے کہ ایک پتا نظر نہیں آ رہا تھا اب تو اس میں پھل آ چکے ہیں۔ تمہارے لئے کمرہ تیار رکھا تھا اور اس سوچ میں تھی کہ کہیں تم ہوٹل ہی میں نہ رہ جاؤ۔ اب تو ہمارا گھر ایئر پورٹ سے بے حد قریب ہے۔ ٹیلی فون نمبر جلد ہی بدل کر 670689 ہو جائے والا ہے تم یہ نیا نمبر بھی لکھ رکھو۔ یہ

سب اس امید پر کہ وہ تین دن سے کچھ امید افزا خبریں مل رہی ہیں۔ خدا جلد ہی وہ دن لائے۔

کیا تم کو میرے پچھلے دو خط مل گئے تھے؟ میں نے ان میں بھی یہ سوال پوچھا تھا کہ تم کو اسی پتے پر خط لکھوں مگر تم نے جواب نہیں دیا۔ تمہارے دوستوں کو تمہارا پیام نہیں پہنچا سکتی ورنہ بہت کچھ Explanation کرنا پڑیں گی۔ گیت بہت خوبصورت ہے سنے بھائی نے تو یہ نہیں دیا تھا البتہ وہ عربی نظم دی تھی۔ یہ عشق آباد ہے (میرے دل کے سوا کوئی اور بھی ہے۔)

اس صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ظفر سے کتابوں کا شکریہ کہہ دینا بے حد پیار کے ساتھ۔

تمہاری  
مریم

خطوط دیکھنے کے بعد سرفراز اقبال کو مریم بلکرامی سے ملاقات کا شوق ہوا لیکن مصروفیات نے دہلی جانے کا موقع نہ دیا۔ ایک عرصے بعد جب وقت ملا تو مریم بلکرامی نے ملی کیونکہ سرفراز اقبال کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ سرفراز اقبال بھی بڑی بے وقوف ہے جو ان خطوط سے مریم کی شدت کا اندازہ کر سکی اور نہ ہی یہ جان سکی کہ جب جذبے روحوں میں سرایت کر جاتے ہیں تو پھر روہیں زیادہ دیر تک جسموں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں۔ اور یہ جان بھی کیسے سکتی تھی کیونکہ اس کے لئے تو جذباتی بلوغت درکار ہوتی ہے اور اگر یہ اس معراج پر ہوتی تو اس کا نام سرفراز اقبال نہ ہوتا مریم بلکرامی ہوتا۔

اور بہت پہلے جب ابھی پاکستان اور بھارت کی تقسیم نہیں ہوئی تھی تو سری نگر کی خشک ہواؤں برف کی سرکتی نرم ملائم چادر اور آتش دان سے اٹھتی مدھوش حدت میں بھی فیض کے لئے ایک دل دھڑکتا تھا۔ کشمیر کی سب سے بڑی دانشور خاتون بیگم محمودہ شاہ کا دل جس کی نشست گاہ میں رات گئے تک ساوار میں قبوہ اُبلتا رہتا اور فیض، تاثیر، عبداللہ شاہ اور غلام عباس اپنے اپنے پیالے پکڑے آتش دان کے قریب بیٹھے رہتے اور محمودہ شاہ گود میں کتاب رکھے آرام کرسی پر جھومتی رہتی۔ نہ بات نہ کلام بس خانگاہوں جیسی خاموشی اس دیوار سے اس دیوار تک بہتی رہتی جس

میں بھی آتش دان کی گیلی لکڑیوں کی چنگ سروں پر دستہ دیتی ہوئی گزرتی تو وہ سب چونک کر اس کی طرف دیکھتے اور کہتے ”آپ نے کچھ کہا“ اور وہ بیگم محمودہ شاہ بڑی رمان سے گردن ہلا کر کہتی ”نہیں“ تو وہ محبوبانہ غصے سے کہتے ”نہیں نہیں ہم نے ابھی آواز سنی ہے۔ وہ مسکراتی اور کہتی تم نے اپنے اپنے گمان کی آواز سنی ہے ورنہ اس دیرانے میں آواز کا کیا کام۔ برسوں بعد جب ان واقعات کا یعنی شاہ شمیم قریشی (معروف پامست اور محمودہ شاہ کا لے پالک بیٹا) مجھے یہ قصہ سنا رہا تھا تو میں نے فیض کی ابتدائی شاعری میں رچی اس اداسی کا بھید پالیا جو ہر پڑھنے والے کی آنکھوں میں اتر جاتی ہے۔ ہر گانے والے کی آواز میں ہوتی ہے اور ہر سننے والے کے وجود سے دکھوں کی چادر کی طرح لپٹ لپٹ جاتی ہے۔ محمودہ شاہ فکر سے بنی ہوئی عورت تھی اس کے تمام جذبے کہیں بہت گہرائی میں خاموش پڑے تھے اگر کبھی کوئی بیسلی دروازے پر دستک دیتا اور ان جذبوں کی میت میں کوئی حرکت بیدار ہو جاتی تو یہ لمحے جلد گزر جاتے۔ ان کی آواز ان کی حرکت ان کی تڑپ اس کے وجود سے باہر نہ چھلکتی۔ پانی برف کی تہہ توڑ کر باہر نہ اُبلتا۔ فیض جانتے تھے وہ ان کے بارے میں سوچتی ہے دل ہی دل میں ان کے شعروں پر داد دیتی ہے ان کی نیکی آنکھوں میں جذبوں کے چھوٹے چھوٹے ستارے بھی جھلکاتے ہیں لیکن اس کی زبان سے اقرار کا ذائقہ اُڑ چکا تھا وہ لفظ ہی بھول چکی تھی جن کی دستک سے بندواں کھلتے ہیں اور خون فٹ بال بن کر ٹوٹی پر ضرب لگاتا ہے۔ مجھے نہیں پتہ وہ خاتون فیض کی باقی زندگی میں سایا بن کر ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی یا وہ اس کی لاش سہی عمر کی کسی برقی صانی میں دفن کر آئے لیکن یہ بات طے ہے کہ فیض کے دوست زندگی بھر ان کی طویل اداسی خاموشی اور دنیا سے بیزارگی کی کوئی وجہ دریافت نہ کر سکے کیونکہ وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہاں لوگوں کے بعد خاموشی ہمیشہ گہری ہوتی ہے اور رونق اجڑنے کے بعد ان کی اداسی بھی اتنی جلدی نہیں جاتی۔

ادھر ایف سیون کی ایک گلی میں دھان پان سی ادھیڑ عمر خاتون ہوتی تھی۔ وقت جس کے بالوں میں سلیمنی رنگ بن کر چمکتا تھا۔ مرجھائی جلد کے نیچے بھاگتا دوڑتا لبواس کی گئی گزری شاہدانی کا ثبوت پیش کرتا تھا جس کی مرمریں انگلیوں میں سگریٹ دھواں دیتا تھا اور جس کے نرم ہونٹوں پر شاعرانہ ملاحظہ ذریعے ڈالے رہتی تھی اور یہی تھی وہ خاتون (شاید اس کا نام مسز قیوم تھا) تھی۔ جو ہر رات اس عظیم شاعر کی واوی گمان سے گزرتی اور تخلیق کے سارے بار ہلا کر چلی جاتی۔ اگر کبھی تلخی ایام فیض کے گرد گھیرا تنگ کر دیتی یا تیر و شام سینے کے آ رہا ہو جاتا تو خاک بہ ہر

اور خوں بادامین ہو کر اس کے دروازے پر آکھڑے ہوئے اور وہ اپنی نرم انگلیوں سے ایک ایک کر کے روزنامہ کام کے تمام کمانے چن لیتی۔ ایک روز سرفراز اقبال نے فیض صاحب سے پوچھا۔  
 ”آپ کی زندگی میں اور کون کون آیا؟“  
 فیض مسکرائے اور کہا۔

”دل زار میں شمار کا ہم سدا کہاں ہے۔“  
 سرفراز اقبال نے دیکھی دل کے ساتھ دوبارہ پوچھا لیکن کوئی ایک جس سے ملنے کے بعد آپ کا جی چاہا کاش ساری زندگی اس کے ساتھ گزر جاتی۔  
 ”ہاں ایک ہے۔“ فیض نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور بولے۔ ایف بیون کے اس بت نے ہمیں زندگی بھر توجہ پرست نہ ہونے دیا۔ اگر ہم ڈاکو ہوتے تو اسے ضرور اٹھا کر لے جاتے۔“  
 جب سرفراز اقبال مجھے یہ قصہ سنا رہی تھی تو میں نے ہنس کر کہا۔ فیض صاحب ڈاکو بن گئے ہونگے بیونوں سے دل نکال لینا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

• • •

## حکمرانوں کے دسترخوان

اس مضمون کا محرک بہت دلچسپ تھا ۱۹۹۶ء میں اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی اس خبر میں انکشاف ہوا۔ ”وزیراعظم نے وزیراعظم ہاؤس کا چیف شیف معطل کر دیا۔“ تفصیلات میں لکھا تھا۔ ”وزیراعظم نے اپنے لیے سویٹ ڈش تیار کرائی یہ ڈش جب وزیراعظم تک پہنچی تو انہیں ایمر جنسی میں ایک میٹنگ میں جانا پڑ گیا انہوں نے جاتے جاتے سویٹ ڈش فریج میں رکھوا دی۔ رات گئے وزیراعظم واپس آ گئے تو انہوں نے سویٹ ڈش لانے کا حکم دیا وزیراعظم ہاؤس کا عملہ پکن میں پہنچا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا وزیراعظم کی سویٹ ڈش فریج سے چوری ہو چکی ہے۔ اس ”چوری“ کی اطلاع جب وزیراعظم تک پہنچی تو انہوں نے چیف شیف کو معطل کر دیا۔ یہ خبر بہت دلچسپ تھی میں نے جونہی یہ خبر پڑھی میں نے سوچا پاکستان کے سابق اور موجودہ حکمرانوں کے دسترخوان ایک دلچسپ موضوع ہے اگر اس پر تحقیق کی جائے اور اس تحقیق کی بنیاد پر ایک طویل فیچر لکھا جائے تو قارئین اس میں دلچسپی لیں گے۔

یہ فیچر ۱۹۹۶ء میں اخبار میں شائع ہوا اور بے شمار قارئین نے اسے پسند کیا۔

قائد کی صحت بری طرح گر رہی تھی۔

کھانا پینا تقریباً بند ہو چکا تھا۔ ایک سائیکس صبح کھاتے اور ایک شام کو دودھ میں بھگو کر دیا جاتا۔ بینائی تقریباً جواب دے چکی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح اپنے عظیم بھائی اور کرنل الہی بخش اپنی زندگی کے عظیم ترین مریض کی گرتی ہوئی صحت پر بہت پریشان تھے۔ جب ثقاہت حد سے گزرنے لگی تو معالج اپنے مریض کی خوراک کے بارے میں غور کرنے لگے۔ اسی دوران انہیں بتایا گیا قائداعظم بمبئی میں ”کپور تھلہ برادرز“ کے کھانے بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ برادرز پاکستان ہجرت کر آئے اور آج کل پنجاب کے کسی شہر میں اقامت پذیر ہیں۔ کرنل الہی بخش نے فوراً کراچی بات کی جہاں سے حکومت پنجاب کو کپور تھلہ برادران کی تلاش کا حکم جاری ہو گیا۔ خفیہ ادارے حرکت میں آئے اور دو دن بعد فیصل آباد کے کسی دور افتادہ مقام سے ان دونوں بھائیوں کو برآمد کر کے زیارت بھیج دیا گیا۔ کرنل الہی بخش نے انہیں کچھ سمجھایا اور وہ باورچی خانے میں اپنے کام میں بخت گئے۔ اس شام جب قائداعظم کو کھانا پیش کیا گیا تو انہوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے روز دوبارہ کھانا پیش ہوا تو قائد نے اسی رغبت کا مظاہرہ کیا۔ شام کو جب ایک بار پھر طشتری لائی گئی تو قائداعظم کھاتے کھاتے ٹھکے اور کرنل الہی بخش کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”آج کل میرا کھانا کون بنا رہا ہے؟“ کرنل الہی بخش نے یہ الفاظ سنے تو ان کا سید فخر سے پھول گیا اور وہ سیدھے کھڑے ہو کر بولے۔ ”سر کپور تھلہ برادرز“ قائداعظم نے کھانے سے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور پوچھا ”وہ یہاں کیسے آئے؟“ جواباً الہی بخش نے بڑے پُر جوش انداز سے ساری واردات سنا دی۔

قائد اعظم کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے اسی وقت "کپور تھلہ براؤز" کو طلب کیا۔ انہیں تین دن کی تنخواہ دی، پھر فیصل آباد سے زیارت تک ان کے سفر پر اٹھنے والے اخراجات کا چیک کاٹا، وہ چیک خزانے میں جمع کرائے کا حکم دیا اور پھر فرمایا۔ "ایک غریب ملک کا غریب گورنر جنرل اس عیاشی کا قائل نہیں ہو سکتا۔"

ذوالفقار علی بھٹو تک پاکستان کے حکمرانوں کے باورچی خانوں اور دسترخوانوں کی تاریخ خاموش تھی۔ نہ میٹونہ باورچی خانہ لمبے چوڑے پیرے اور نہ ہی سینکڑوں ہزاروں برتن۔ زیادہ تر حکمران جب گورنر جنرل ہاؤس، قائد اعظم ہاؤس، ایوان صدر یا وزیر اعلیٰ ہاؤس منتقل ہوتے تو اپنا باورچی ساتھ لاتے جسے اپنی ذاتی جیب سے تنخواہ دیتے تھے۔ باورچی گورنر جنرل ہاؤس کے کسی بیلدار چچہ اسی یا چوکیدار کو اپنی مدد کے لئے شامل کر لیتا جو "روٹی" کے لالچ میں ہنریاں کاٹتا، گوشت صاف کرتا، آلو پیاز کھرتا اور گرم مصالحے پیٹتا۔ صاحب کے کھانے کا وقت ہوتا تو ٹیبل پر پلیٹیں، گلاس، نیپکین اور چھری کاٹنے رکھتا جبکہ کھانا سرو کرنے کی تمام ذمہ داری خود باورچی کی ہوتی تھی۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا جب کھانے پر صاحب کا کوئی دوست مدعو نہ ہوتا تو وہ اپنے تمام ملازمین کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے دیتے جسے وہ لوگ فوراً قبول کر لیتے تھے لیکن یہ روایات بھی دوسری روایات کی طرح آہستہ آہستہ دم توڑتی چلی گئیں اور اب وزیر اعظم ہاؤس، ایوان صدر، گورنر ہاؤس اور وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہوں کے باورچی خانوں کے ماہانہ اخراجات کروڑوں تک چلے جاتے ہیں جو براہ راست سرکاری خزانے سے ادا کئے جاتے ہیں۔

خان لیاقت علی خان کے پاس جموں کا ایک کشمیری باورچی ہوتا تھا جس کا اصل نام یوسف پانڈے تھا لیکن اسے سب صرف "پانڈے" کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ باورچی زندگی بھر قائد ملت کی خدمت کرتا رہا۔ جب خان صاحب طالب علم تھے تو یہ ان کے ساتھ ہاسٹلوں میں رہا۔ بعد ازاں جب وہ عملی سیاست میں آئے تو بھی یہ ان کی مسلسل خدمت کرتا رہا۔ پاکستان بننے کے بعد اس نے جموں واپس جانے کی بجائے خان صاحب کے خاندان کے ساتھ کراچی آنے کو فوقیت دی۔ "پانڈے" نہ صرف خان صاحب کی پسندیدہ ڈشوں کے بارے میں جانتا تھا بلکہ اسے یہ بھی علم تھا کہ صاحب کس وقت کیا پسند کرتے ہیں اور کتنی مقدار میں۔ لیاقت علی خان اپنے باورچی خانے کے تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ صبح ناشتا گھر بھر کے ساتھ کرتے، وہ چہرہ کا کھانا پانڈے سے سائیکل پر ان کے دفتر پہنچاتا اور رات کو اگر وہ جلدی فارغ ہو جاتے تو گھر آ

کر کھانا کھا لیتے، بصورت دیگر مختلف تقریبات میں ہی تھوڑا بہت کھایا کرتے تھے۔ بال البتہ وہ جتنی دیر گھر رہتے پانڈے سے بار بار قبو و طلب کرتے تھے اور وہ ان کا اس قدر مزاج آشنا تھا کہ جوں ہی کال بیل بجتی وہ قبوے سے لبالب کیتٹی، چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں اور شکر دان ترے میں سجا کر حاضر ہو جاتا۔ خان صاحب اس سارے سامان کو دیکھ کر ہر بار پوچھتے پانڈے تمہیں کیسے علم ہوا میں قبوہ پینا چاہتا ہوں۔ پانڈے کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ "خضور ساری زندگی آپ کی چاکری میں گزری اگر اب بھی آپ کی عادتوں کا پتہ نہ چلے تو لعنت ہو ہم پر۔" خان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد بھی پانڈے ان کے خاندان کے ساتھ ہی رہا بلکہ جب بیگم رونا لیاقت علی خان شیر بن کر ملک سے باہر گئیں تو پانڈے کو اپنے ساتھ روم لے گئیں۔

گورنر جنرل غلام محمد کے پاس سرکاری باورچی تھا جو گریڈ ۱۴ کے سرکاری اہلکار کی تنخواہ پاتا تھا۔ تاہم کھانے اور مشروبات کے تمام اخراجات گورنر جنرل اپنی ذاتی جیب سے ادا کرتے تھے البتہ کراچی گورنر جنرل ہاؤس کی ملکیت تھی جس کی پشت پر ہنر رنگ کا نیپکین لگا ہوتا تھا جس پر "حکومت پاکستان" درج ہوتا تھا۔ گورنر جنرل ہاؤس میں سرکاری تقریبات کے دوران آدمی کے باورچی اور پیرے منگوائے جاتے تھے جو تقریب کے بعد واپس یونٹوں میں چلے جاتے تھے۔ غلام محمد جب زیادہ بیمار ہوئے تو ان کی خوراک "سوپ" تک محدود ہو کر رہ گئی چنانچہ باورچی خانے میں ہر وقت مختلف دیگچوں میں مختلف قسم کے سوپ تیار پڑے رہتے تھے جنہیں گورنر جنرل کو پلانے کی ذمہ داری ان کی سٹس سیکرٹری مس روتھ بورل کی تھی۔ وہ بڑے اہتمام سے سوپ ٹرے میں رکھتی غلام محمد کی "ڈبیل چیئر" کے نزدیک لاتی۔ اسے ڈی سی فوراً گورنر جنرل کے سامنے چھوٹی سی میز رکھتا، مس بورل ٹرے اس پر ہما کر غلام محمد کے سینے پر سفید براق نیپکین پھیلاتی اور پھر چینی کی نیپس چمچ کے ساتھ گورنر جنرل کو سوپ پلانے لگتی۔ فائج کے بعد گورنر جنرل سوپ پینے کی زیادہ تر "استطاعت" کھو چکے تھے لہذا سوپ کا زیادہ حصہ ان کے نیپکین پر آگرتا اور ہر چمچ کے بعد گورنر جنرل کی سوپ میں تھڑی بانٹھیں اور ٹھوڑی صاف کرنا بھی مس روتھ بورل کے فرائض میں شامل تھا جسے وہ بڑی نفاست سے نبھاتی تھی۔ گورنر جنرل کے علاوہ مس روتھ بورل اس کی بوڑھی والدہ اور باورچی غلام محمد کے بچن سے کھانا کھاتے تھے جبکہ کسی دوسرے رکن مملکت یا گورنر جنرل ہاؤس کے ملازم کو بچن سے کوئی چیز حاصل کرنے کی سختی سے ممانعت تھی جس پر باورچی سختی سے کاربند رہتا تھا لیکن اس کے باوجود ماہ کے آخر میں جب غلام محمد بلوں کی پڑتال کرتے تو باورچی کو بل کر ضرور

ڈالتے تھے۔ اس دوران ان کا موقف عموماً یہ ہوتا تھا کہ چار افراد کا جن میں ایک تقریباً معذور دوسرا بوڑھا (مس بول کی والدہ) ایک سمارٹ خاتون جو پیٹ بھر کر کھانے کی عادی نہیں اور ایک سوکھے مڑے باورچی کے کھانے کا بل اتنا زیادہ کیسے آسکتا ہے؟ اس کا مطلب ہے تم وہ باورچی کو مخاطب کرتے ہاں تم اپنی سرکاری ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہے اور دوسرے لوگ کچن میں گھس کر "گورنر جنرل آف پاکستان" کے کھانے کی اشیاء چوری کرتے رہتے ہیں۔ اس دوران باورچی لاکھ صفائیاں پیش کرتا لیکن غلام محمد فریق مخالف کی بات سننے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ یوں ایک آدھ گھنٹے کی یہ ایک طرف ذرا انت اس حکم پر ختم ہوتی کہ باورچی آئندہ مزید احتیاط سے کام لے گا۔ اس دور کے اکثر ملازمین کا یہ بھی کہنا تھا کہ لُچ نام پر گورنر جنرل کچن کا اچانک دورہ بھی کیا کرتے تھے تاکہ ان لوگوں کو موقع واردات پر ہی پکڑ لیں جو ان کے کھانے کی اشیاء چوری کر کے کھا جاتے ہیں لیکن انہیں عموماً مانا کام ہی لوٹا جاتا تھا۔ سرکاری تقریبات کے دوران جب آرمی کے باورچی آتے اور تمام سامان خورد و نوش حکومتی فنڈ سے خریدا جاتا تھا تو گورنر جنرل اپنے باورچی کو کچن سے ہدایات کرتے تھے کہ وہ بیچ جانے والا کھانا فریج میں محفوظ کر لے اور آئندہ پورا غصہ وہ لوگ بھی کھانا کھائیں گے۔ ان تقریبات میں گورنر جنرل کے لئے خصوصی طور پر سوپ تیار ہوتا تھا جس کی اچھی خاصی مقدار وہ محفوظ کرا لیتے تھے اور پھر دنوں تک پیتے رہتے۔

سکندر مرزا کے کچن کا سارا انتظام و انصرام بیگم ناہید مرزا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خود ملازمین کے ساتھ بازار جاتی تھیں۔ پوری تسلی کر کے سامان خورد و نوش خریدتی تھیں اور بعد ازاں ہفتے ہفتے سے کچن میں جا کر ایک ایک چیز کا حساب نوٹ بک میں درج کرتی رہتی تھیں۔ اس دور میں گورنر جنرل باؤس میں تقریبات بہت ہوتی تھیں لہذا کچن کو و حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ سرکاری تقریبات کے لئے کھانے اور مشروبات کا اہتمام کرتا تھا جس کے تمام تر اخراجات گورنر جنرل باؤس کے فنڈز سے ادا کئے جاتے تھے جبکہ دوسرا حصہ سکندر مرزا کا ذاتی کچن کہلاتا تھا جس کے اخراجات گورنر جنرل کی تنخواہ سے منہا ہوتے تھے۔ سکندر مرزا عموماً اپنے ذاتی کچن سے نئی کھانا کھاتے تھے۔ عام طور پر ناشتے میں میٹھا و تیز ذائقہ والے کھانے اور کافی کا ایک پیو ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی دو اپنے خاندان کے ساتھ ٹیبل پر کھاتے تھے جو تھوڑی سی ترکاری پھینکی کے ایک آدھ پیس اور کبھی تھوڑے سے گوشت اور چپاٹیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ شام کے کھانے میں دو اپنے چاول، مرغی کا شوربا اور تھوڑا سا میٹھا پسند کرتے تھے جبکہ

"مشروبات" کا سارا کنٹرول براہ راست خاتون اول کے ہاتھ میں تھا جو گورنر جنرل کے تیزی سے بڑھتے ہوئے وزن، دل کے امراض کے غلبے اور سانس کے مسائل کے باعث انہیں بڑی احتیاط سے "مشروب" بنا کر دیتی تھی جس پر سکندر مرزا کو عموماً شکایت رہتی تھی۔ دفتر میں ان کا کافی اور چائے کا سامان الگ تھا جب مہمان آتے تھے تو سرکاری خرچ پر ان کی تواضع کی جاتی تھی۔ جبکہ گورنر جنرل کا کپ ان کے ذاتی خرچ سے نیا کیا جاتا تھا۔ بیگم ناہید مرزا اس کا بھی بڑا حساب رکھتی تھی۔ ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ کے یہ احکامات اس وقت سکندر مرزا کو بڑی طرح کھلتے ہوں لیکن آخری عمر میں یہی پابندیاں ان کے لئے بڑی آسودگیاں لے کر آئیں کیونکہ جب انہیں معزول کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور وہ لندن کے ایک معمولی سے فلیٹ میں مقیم ہوئے تو بیگم ناہید مرزا کو ایک ہوٹل کے ماس سے ملازم کی تنخواہ میں گزارا کرتے ہوئے زیادہ مسائل کا شکار نہ ہوا۔ یہ معمولی تنخواہ پانے والا ملازم پاکستان کا سابق گورنر جنرل اور صدر سکندر مرزا تھا۔

چوہدری محمد علی بڑے صابر سیر چشم اور درویش صفت شخص تھے وہ اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں وزیراعظم باؤس منتقل ہونے کی بجائے اپنے نجی فلیٹ ہی میں مقیم رہے جہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ تین کمروں کے اس فلیٹ کا سارا کام "خاتون اول" کو خود اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتا تھا جب چودھری صاحب وزیراعظم بنے تو خاتون کو گمان نہ رہا کہ شاید اب ان کے خاوند کی تنخواہ بڑھ جائے گی اور وہ انہیں کام کاج کے لئے ایک ملازم رکھ دیں گے لیکن جب "وزیراعظم" نے انہیں یہ بتایا کہ ان کی تنخواہ میں اضافے کی بجائے کمی آچکی ہے تو ان کے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی اور وہ دوبارہ کچن میں گھس کر "ہانڈی روٹی" کے دھندے میں الجھ گئیں۔ چودھری صاحب صبح دفتر آتے وقت اپنا لٹن ساٹھ لاتے تھے جس میں عموماً ساگ، آلو، بھجیا، تدریلے گوشت یا کبھی کبھار مرغی کے چند بھنے ہوئے ٹکڑے ہوتے تھے ریش روٹیاں تو وہ چودھری صاحب تنور سے منگوا لیتے تھے۔ لُچ کے دوران اگر کوئی مہمان وہاں موجود ہوتا تو چودھری محمد علی اپنی روایتی گرم جوشی سے اسے بھی تناول یا حضرت کی دعوت دے دیتے تھے جسے عموماً لوگ "وزیراعظم پاکستان" کی دعوت سمجھ کر قبول کر لیتے تھے پھر تنور سے چار پانچ روٹیاں منگوائی جاتیں ٹیبل پر "پرائم مشر" کا لُچ جس کو ہلا جاتا جسے پیر و گرم کر کے جب کھانا سرو کرنے کا وقت آتا خاتون اول کھانے کی ٹرے لاتی اور مرد اول ٹیبل پر ٹیبل "لُچ" کاٹنے اور پیالیاں سجاتے کھانے کے دوران پانی عثم ہو جاتا تو وزیراعظم خود جگ بھر کر لاتے اور ایک ایک مہمان کے گلاس میں پانی اُٹھالیتے سرکاری تقریبات میں کھانا

چودھری صاحب و اچھا نہیں لگتا تھا بڑا اس وقت جب سارے اہلکار مہنگی کھانوں کی قابووں کے پیچھے لپک رہے ہوتے یا گلاس سے گلاس کمرہ رہے ہوتے چودھری محمد علی چائے کی چھوٹی سی پیالی ہونٹوں سے لگائے بیٹھے رہتے یا ایک پلیٹ میں تھوڑے سے خشک چاول ڈال کر آہستہ آہستہ چبا رہے ہوتے۔ وہ پیٹ بھر کر کھانا اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ گھر میں ان کی اہلیہ میز پر کھانا لگانے ان کا انتظار کر رہی ہو جس چنانچہ انہیں خواہ کام میں رات کے بارہ بجے کیوں نہ بن جاتے وہ کھانا گھر جا کر ہی کھاتے تھے۔

سہ روزی ٹیل پھر کر کھانے کے قائل تھے۔ جہاں بچ کا وقت ہو گیا وہیں کھانا منگووا کر کھالیا۔ رات ان کی عموما "خضیرہ لڑکیوں" میں ضرورتی تھی لہذا وہاں کھانے پینے کا کسے ہوش نہ تھا ہاں البتہ وہ صبح ناشتا وزیراعظم ہاؤس میں ہی کرتے تھے جہاں ان کی بیٹی ان کا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ وہ ناشتے کی ٹیبل ہی پر انتظامیہ کے افسروں کو ایک ایک کر کے غلبہ کرتے اور رات کے سارے احکامات منسوخ کر کے نئے حکم جاری کرتے۔ اس دوران وہ اگر کسی افسر سے خوش ہوتے (ایسا موقع کبھی کبھی ہی آتا تھا) تو اسے اپنے ساتھ ناشتے کی دعوت دیتے جسے وہ اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھ کر فوراً قبول کر لیتا تھا۔ اس دور میں وزیراعظم ہاؤس کا کچن کچھ کچھ ہرل تھا۔ سٹاف کو بھی وہاں سے کھانا اور مشروبات مل جاتے تھے لیکن ایک حد تک کیونکہ اس کے بعد بل کی منظوری وزیراعظم سے لینا پڑتی تھی جس کے امکانات بہت کم ہوتے تھے۔

غیر وزراتیوں کا اپنا ذاتی باورچی تھا جو کراچی میں ان کے ذاتی گھر میں رہتا تھا۔ ان میں دو مرتبہ وزیراعظم اور ان کے سارے عملے کا کھانا دفتر پہنچانا اس کی ذمہ داری ہوتی تھی جسے دو وزارت عظمیٰ کے آخری وقت تک نبھاتا رہا۔ اس سارے کچن کا خرچ وزیراعظم اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے ادا کرتے تھے اور اس ضمن میں سرکاری خزانے سے ایک پیسہ وصول نہیں کرتے تھے۔ ان کے ٹیکرڈریٹ الٹاف کوہرنے ایک بار جب ان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی تو وہ نہیں کر بولے۔ "بالشبہ روٹی پانی کھلانے چلانے سے رزق کم نہیں ہوتا" بڑھتا ہے۔ میری جاگیریں جتنا اناج پیدا کرتی ہیں وہ میں کہاں لے جاؤں گا۔ اچھا ہے کچھ حصہ آپ لوگوں کے کام بھی آ جائے۔" ان کے دو راقمذکر میں ہونے والی نوے فیصد تقریبات کے اخراجات بھی انہوں نے خود ہی برداشت کئے۔ جبکہ مہینے میں ایک یا دو بار سارے سٹاف کی دعوت کرنا بھی ان کی زندگی کا معمول تھا۔ جس میں وہ پر تکلف کھانے کے دوران سب کو خوب لطیفے سناتے ان کے زیادہ تر

لطیفے جاگیردار طبقے کی حماقتوں اور سیاستدانوں کی بے وقوفیوں کے گرد گھومتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک عجیب شوق تھا۔ وہ نئے شاہی خدمتہ جواڑوں کو کھانے کی دعوت دیتے تھے چنانچہ سرکاری حلقوں میں جتنی شادیاں ان کے دور میں ہوئیں وہ شاید ہی کسی دوسرے عہد میں ہوئی ہوں۔

ایوب خان کا عہد ساوگی کا دور تھا۔ صدر رہنشا چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جہاں ان کے تمام تر اخراجات ذاتی اکاؤنٹ سے ادا کئے جاتے تھے۔ گھر کا سارا انتظام و انصرام بیگم ایوب کے ہاتھ میں تھا وہ کچن کو بھی خود ہی چلاتی تھیں۔ سودا سلف ذاتی باورچی اور ایک آدھ دوسرا ملازم لاتے تھا۔ کھانے کے کمرے کے لئے صرف ایک ویٹر تھا جو بیچ و بھر کے دوران کھانا سرور کرتا اور باقی اوقات میں ایوب خاندان کے ذاتی مہمانوں کی تواضع کرتا۔ سرکاری تقریبات کا شعبہ گھریلو کچن سے بالکل الگ تھا اور اسے براہ راست صدر کا سیکرٹری چلاتا تھا۔ بجٹ سے رقم کی ڈیپانڈ کرنا ملازمین رکھنا مینو تیار کرنا اور تقریب کے دوران آرائش و زیبائش کا انتظام اسی سیکرٹری کی ذمہ داری تھی جس میں صدر حصہ نہیں لیتے تھے۔ دفتر میں صدر کے ذاتی اور سرکاری مہمانوں کی تواضع سرکاری رقم سے کی جاتی تھی ہاں البتہ صدر صبح اور شام کا کھانا اپنے گھر کھاتے تھے جس کا اہتمام ان کی ٹیلی گراف تھی۔

صوبائی حکومتوں کی تاریخ میں عبدالرب نشتر اور ملک امیر محمد خان دو ایسے گورنر گزرسے ہیں جن کے دور میں گورنر ہاؤس پنجاب کا کچن عملاً بند رہا۔ نشتر دوسرے سے ایک سرکاری پیسہ بھی اپنے اور اپنے خاندان پر خرچ کرنے کے روادار نہیں تھے چنانچہ سرکاری خدمات کے دوران وہ جو چائے یا کافی پیتے تھے شام کو اس کا ٹی ادا کر دیتے تھے۔ رہے ملک امیر محمد خان تو انہوں نے ایک حکم کے تحت سرکاری کچن بند کر دیا اور عملے کو دوسرے شعبہ جات میں بھیج دیا تھا۔ ان کا کھانا ان کا ذاتی ملازم بناتا تھا جسے وہ کالا باغ سے اپنے ساتھ لاتے تھے۔ ذاتی مہمانوں کے لئے نواب صاحب اپنی جیب سے بازار سے کھانا منگواتے تھے جبکہ گورنر ہاؤس کے چائے پانی کا سارا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔ رہا ان کا عملہ تو وہ اپنا کھانا روزانہ گھر سے لاتا تھا۔

یگی خان کے دور میں ایوان صدر کے کچن کے اخراجات یکدم بڑھ گئے کیونکہ یہ وہ دور تھا جب "مشروبات مغرب" کو کچن کا باقاعدہ حصہ بنادیا گیا تھا۔ ڈائننگ ہال میں ایک خوبصورت بار بنایا گیا تھا جس میں صبح دوپہر شام اور رات کے مختلف قسم کے مشروبات کی درجنوں بوتلیں رکھوائی گئیں۔ جن کے بارے میں سختی سے آرڈر تھا کہ یہ ختم نہیں ہونی چاہئیں اگر کسی بوتل میں

گلاس بھر مشروب ہے تو اسے فوراً ہٹا کر اس کی جگہ بھری ہوئی بوتل رکھ دی جاتی۔ ان مشروبات کو "سرو" کرنے کے لئے پڑھ لکھے سمارٹ باورچی اور خوبصورت پیرے رکھے گئے۔ جو سارا دن پیرس کے نازک گلاسوں میں معزز مہمانوں کی تواضع کرتے رہتے۔ اس دور میں پہلی مرتبہ ایوان صدر کے مینو میں چائیز پورچین اور ویسی کھانے شامل کئے گئے جو بغیر کسی پیشگی نوٹس کے فوراً پیش کئے جاسکتے تھے۔ اسی دور میں کچن کے شاف میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ کچن کے انتظامات چلانے کے لئے ایک چھوٹی سی باؤی بنائی گئی جو تین افراد پر مشتمل تھی۔ تمام مالی اور انتظامی معاملات کی رکھوالی ان کی ذمہ داری تھی۔ ایک پرچیزنگ کمیٹی تھی جو مارکیٹ سے مختلف اشیاء خریدتی تھی جبکہ بیروں کی وردیوں، چھٹیوں اور ڈیوٹیوں کا حساب رکھنے کے لئے الگ شاف رکھا تھا۔

گو بیجی خان کے دور میں ایوان صدر کا کچن بڑی حد تک شاہی خاندان کا باورچی خانہ بن گیا تھا۔ لیکن اسے جو عروج ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں حاصل ہوا وہ اس سے پہلے حاصل ہوا اور وہی بعد ازاں اولیٰ ایوان صدر اور ثانیاً وزیراعظم ہاؤس میں دنیا کے تین اعلیٰ تربیت یافتہ شیف رکھے گئے جن کے گریڈ اور سہولتیں وفاقی حکومت کے ایڈیشنل سیکرٹریوں کے برابر تھیں۔ ان میں سے ایک ویسی کھانوں، دوسرا چائیز کھانوں اور تیسرا اولیٰ کھانوں کا ماہر تھا۔ ہر شیف کے پاس ۱۲ بیرے تھے جو مخصوص کھانوں کو مخصوص روایتی انداز سے پیش کرنے میں ہر تھے۔ ہر نشست پر سارے کھانے پیش کئے جاتے تھے۔ وزیراعظم ان میں سے جو پسند کرتے تھے لچک پاتی کھانے بعد ازاں شاف آپس میں تقسیم کر لیتا تھا۔ جب وزیراعظم کھانے کی میز پر آکر بیٹھتے تھے تو ایک کلرک ہاتھ میں کاپی پنل اٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور وزیراعظم کھانے کے دوران اسے ایسی ڈشوں کا نام لکھواتے رہتے جو وہ اگلے کھانے کے دوران کھانا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں کلرک ان ڈشوں کے نام بھی نوٹ کرتا رہتا جنہیں اس وقت وزیراعظم نے ایک سے زیادہ بار شرف قبولیت بخشا۔ بعد ازاں یہ سٹ شیف حضرات کو دے دی جاتی جس سے وہ کھانوں کے نام پڑھ کر انہیں آئندہ کے مینو میں مستقل طور پر شامل کر لیتے تھے۔ بھٹو صاحب کھانے کے سلسلے میں اس قدر "صاحب ذوق" تھے کہ انہیں اگر کسی تقریب میں کوئی کھانا پسند آ جاتا تو وہ میزبان سے "خانساں" سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے جو یقیناً فوراً پوری کر دی جاتی، بھٹو صاحب اس کے ہنر کی کھل کر تعریف کرتے اور آخر میں میزبان سے اسے چند روز کے لئے "مانگ" لیتے۔ وزیراعظم ہاؤس آکر وہ خانساں اس وقت تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہتا جب تک بھٹو صاحب کا جی اس ڈش سے نہ

اوب جاتا۔ بھٹو صاحب اپنے مہمانوں کو بھی منفرد اور خوش ذائقہ کھانے کھلانے کے شوقین تھے۔ غیر ملکی مہمانوں کو تو وہ خصوصی طور پر بلا کرنے سے کھانے کھلاتے تھے۔ اس دور میں زیادہ تر اجلاس کھانے کی میزوں پر ہوتے یا اجلاس کا اختتام کھانے پر ہوتا تھا۔ اس دور میں کابینہ کے ارکان اور اعلیٰ سول اور فوجی حکام کا خیال تھا کہ جب وزیراعظم کسی کو خصوصی طور پر رات کو کھانے پر بلائیں تو اس کا مطلب ہے وہ اس سے کسی خاص مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں لہذا سہاوشی حضرات ہر گز ریشہ شب کا "شیڈول" منگوا کر وزیراعظم کے مہمانوں کے نام پڑھتے اور پھر گفتگو کا اندازہ لگاتے۔ بھٹو سے جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھی کو رکماندرز کی آخری ملاقات بھی کھانے کی میز پر ہوئی تھی جس میں ناکامی کے بعد ملک میں مارشل لا لگ گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کھانے اور کھلانے کے کسی قدر شوقین تھے اس کا اندازہ فقط ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اپنے دورہ امریکہ کے دوران بھٹو نے ہنری کسنجر کو پاکستانی سفارتخانے میں رات کے کھانے کی دعوت دی جسے امریکی سیکرٹری خارجہ نے قبول کر لیا۔ دن طے ہو گیا تو بھٹو نے سارے عملے کو جمع کر کے معزز مہمان کے لئے مینو پر مشاورت شروع کر دی۔ کسی نے کہا کسنجر چائیز کھانے بہت پسند کرتے ہیں۔ کسی نے کہا وہ ایک بار مجھ سے سندھ کی روایتی ڈشوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ کسی نے کہا ایک سفارتی تقریب میں انہوں نے فرائی چھلی دو بار لی تھی۔ ایک صاحب نے کہا وہ جب بھی کسی عرب ملک جاتے ہیں تو ہرن کا گوشت خصوصی فرمائش پر طلب کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بھٹو نے ساری تجاویز مسترد کر دیں کیونکہ وہ اپنے معزز مہمان کو ایسا کھانا کھانا چاہتے تھے جو انہوں نے اس سے قبل کبھی نہ چکھا ہو، بہر حال دواڑ حائی گھنٹے کی بحث کے بعد کسی طرف سے "بھٹو ہوائے بیڑ" کی تجویز آئی۔ بھٹو نے سنا تو چونک کر تجویز کنندہ کو دیکھا اور گردن ہلا کر بولے "لیس ہیئر از دی آئٹم" بھٹو کی منظوری ملے ہی سارا عملہ کالے بیروں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سارے واشنگٹن کی ٹولٹن مارکیٹیں کھنگال ڈالی گئیں دوسرے شہروں میں فون کئے گئے۔ بڑے ہوٹلوں کی انتظامیہ سے پوچھا گیا لیکن پورے امریکہ میں کہیں کالے بیڑ دستیاب نہ ہوئے لہذا رات کو مجبوراً کراچی سے بیڑ منگوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اگلے روز وزیراعظم کا خصوصی طیارہ پاکستان آیا اور یہاں سے دو ہزار کالے بیڑ لے کر واپس چلا گیا۔ لیکن بیڑ آئے تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا وہ تھا انہیں پکانے کے لئے کسی ماہر کی ضرورت جو امریکہ میں دستیاب نہیں تھا۔ اس مسئلے پر ایک اور اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ فوری طور پر پاکستان سے



سرکاری خزانے سے پورے کرتے تھے بلکہ انہوں نے عوام کی رنگوں سے کشید ہونے والی دولت کو ذاتی آرام آسائش اور عیاشی پر صرف کیا۔

آخر میں اپنی تاریخ سے صرف دو سوال کرنے کی جسارت کروں گا۔ حکمران عوام کے رکھوالے ہوتے ہیں یا عوام حکمرانوں کی آیتیں؟ اور دوسرا وہ رکھوالا جو خود ہی اپنے گھر کو لوٹے گئے اس سے بڑا چور دنیا میں کوئی اور ہوتا ہے؟

اور لوگو! جس ملک میں گونگے بہرے لوگ رہتے ہوں وہاں کے وزیر اعظم ہاؤسوں میں ہر سال دس پندرہ کروڑ روپے چولہوں میں پھونک دیئے جائیں تو کوئی بڑی بات نہیں اور وہاں کا وزیر اعظم دس لاکھ روپے کے بیڑیوں کو مہمانوں کے حضور پیش کر دے تو بھی کوئی بڑی بات نہیں اور یہ بھی تو کوئی بڑی بات نہیں کہ اس غریب ملک کو قائد اعظم کے بعد کوئی غریب حکمران نہیں ملا جو افلاس اور بیماری کے ہاتھوں دم توڑ دے لیکن عوامی خزانے کو چند سو روپوں کے نقصان سے بچا لے۔



پروفیسر احمد رفیق اختر

پروفیسر احمد رفیق آج لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہیں اس وقت پاکستان اور بیرون ملک ان کے لاکھوں "سریڈ" موجود ہیں میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۹۳ء میں گوجرانہ میں ہوئی تھی اس ملاقات کا محرک جناب ممتاز مفتی تھے مفتی صاحب پروفیسر صاحب سے بہت متاثر تھے وہ اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے میں نے ایک دن ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تو مفتی صاحب نے مجھے ان کا ٹیلی فون نمبر دے دیا میں نے پروفیسر صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی انہوں نے مجھے "گوجرانہ بلا لیا" زیر نظر مضمون اس پہلی ملاقات کا احوال ہے میں نے یہ مضمون ۱۹۹۵ء میں لکھا تھا یہ مضمون میڈیا میں پروفیسر صاحب کا پہلا تعارف ثابت ہوا۔ آج پروفیسر صاحب کے پرستاروں کی تعداد گنتا ہائے ممکن ہے۔ ان بے شمار پرستاروں میں ان کا ایک پرستار میں بھی ہوں ان سے میری محبت اب ۳۰ اور برس میں داخل ہو گئی ہے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے وہ پروفیسر صاحب جو کبھی صرف ہمارے ہوتے تھے وہ اب پوری دنیا کے پروفیسر صاحب ہو چکے ہیں۔ دوسب کے پروفیسر صاحب بن چکے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ جی خوشی ہوتی ہے اب ان سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

.....

اکیسویں صدی پروفیسر احمد رفیق کی صدی ہے۔  
دو برس پہلے گوجرانہ میں ان کے گھر داخل ہوا تو ایک کلین شیو شخص کو پٹنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھا۔ ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ ایش ٹرے ٹوٹوں سے لبالب بھری تھی۔ سامنے ڈش پر سی این این کا کوئی پروگرام چل رہا تھا اور "کلین شیو" اس میں بڑی طرح منہمک تھا۔ میں بھی بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ پروگرام امریکہ میں ہم جنس پرستی پر تھا وقفہ ہوا تو "کلین شیو" نے میری طرف دیکھ کر ریوٹ کنٹرول کا ہن دیا اور کہا۔ "آپ کو معلوم ہے ہم جنس پرستی کا آغاز کہاں سے ہوا؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح انہی میں سر ہلا دیا۔ "ہوں" کلین شیو نے ہنکارا بھرا لباس سائش لیا اور کہا۔ سپارٹا میں ایک بار۔ اور پھر دنیا کے قدیم اور جدید جنسی رجحانات پر ایک طویل لیکچر شروع ہو گیا۔ درمیان میں کلین شیو پانی پینے یا سگریٹ سلگانے کے لئے رکتا اور خاموشی کے چند لمحات کے بعد دوبارہ شروع ہو جاتا۔ ایک گھنٹے بعد جب اس کی طرف سے خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں اس کے علم دانائی زروانی اور خوبصورت انگریزی کے اثر میں بھیگ چکا تھا۔ کلین شیو نے سگریٹ کا آخری کش لیا۔ فلٹر تک جلتے ٹوٹے کو ایش ٹرے میں مسلا اور مجھ سے پوچھا۔ "جی علم کیجئے۔" میں نے عرض کیا۔ "پروفیسر احمد رفیق سے ملاقات کا شوق یہاں کبھی لایا۔ اگر ہیں تو ملا دیں۔" کلین شیو نے قہقہہ لگایا اور ذرا سارک کر جواب دیا۔ "جی مل لیں مجھے ہی احمد رفیق کہتے ہیں۔" یہ سن کر مجھے شدید دھچکا لگا۔ میں وہاں کسی "بزرگ" سے ملنے گیا تھا۔ لیکن وہاں تو کوئی اور جی شخص بیٹھا تھا انھیک ہے وہ صاحب علم ہے انگریزی بہت خوبصورت بولتا ہے لہجہ میں محاسن اور اثر کی محتاط سیست ہے گرم جوش ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسے "بزرگ" مان لیا

جائے۔ میں اسی مایوسی کے عالم میں اُنھہ کر پتل پڑا تو چائے آگئی۔ مجبوراً مجھے بیٹھنا پڑ گیا اور آج سوچتا ہوں اگر زمین موقع پر چائے نہ آتی تو میں زندگی کے حیرت انگیز تجربے سے محروم رہ جاتا میں پروفیسر احمد رفیق سے محروم رہ جاتا۔

پروفیسر احمد رفیق میں ”بزرگوں“ والی کوئی بات نہیں چہرے پر گھنی داڑھی نہ آنکھوں میں سرے کی دم دار لکیر تن پر ہنر چو غائب ہاتھ میں عصا بات بات پر استغفر اللہ کی دلدوز چیخ نہ اللہ ہو کا جگر پاش نعرہ اگر بتی کی خوشبو نہ گلاب کا عطر فرش پر قالین نہ دیواروں کے ساتھ گاؤں کیوں کی باڑا اب و آداب نہ حاضرین میں گناہ کا تاسف وہاں بزرگی کی کوئی نشانی نہیں اگر ہے تو صرف بات بے بات قہقہہ لگاتا ایک تروتازہ چہرہ ۵۵ برس کا چٹکے چھوڑتا شوخ نوجوان کوئی آ جائے تو آ جائے چائے ہوگی تو آ جائے گی نہیں ہوگی تو خوبصورت خیال کو باتوں میں جھگو بھگو کر کھاتے رہیں کھاتے رہیں جب تھک جائیں تو اُنھہ کر چلے جائیں۔ وہاں آنے پر پریشانی ہوگی نہ جانے پر خوشی آپ برسوں آتے جاتے رہیں اسے کبھی ”بزرگ“ نہیں پائیں گے۔ اس پر کبھی ”حال“ طاری نہیں ہوگا۔ کبھی ”ذکر“ کا کرب نہیں ہوگا کبھی نیکی کا تقاضا نہیں ملے گا۔ اگر ملے گی تو انتہائی ذہانت ملے گی بے انتہا علم ملے گا لامحدود اپنائیت اور اس افق سے اس افق تک پھیلی محبت ملے گی۔

پروفیسر احمد رفیق کا کشف کشف نہیں فراست ہے فراست کشف کی ریاضان قسم ہے جس میں ”سالک“ کو یک سوئی کی ضرورت نہیں پڑتی کائنات خود ہی سٹ کر بتیلی پر رانی بن جاتی ہے لہذا جوں ہی کسی شخص کی آواز پروفیسر کے کانوں سے ٹکراتی ہے ذات کے ساتوں پر دے اُنھہ جاتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی کیفیات کھل کر سامنے آ جاتی ہیں جیسے روشنی کا وجود سات رنگوں میں تقسیم ہو جائے اور مخاطب اُنھتے وقت یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو مجھ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہے لیکن جب پروفیسر سے پوچھا جائے تو وہ مسکرا کر کہتا ہے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں صرف ریاضت ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے علم اسماء عنایت کیا۔ ”یہ علم اسماء کیا ہے؟“ وہ کہتا ہے یہ علم ایک ہزار برس پہلے حضرت محی الدین عربی نے دریافت کیا۔ ان کے بعد کسی صوفی نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ اس میں قرآن فہمی اور انسانی ذات کی باریکیوں پر عبور کے ساتھ ساتھ تمام جدید علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے اور صوفیاء کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا لہذا وہ سیدھے سادھے کشف سے کام چلا لیتے تھے لیکن میری مشکل پسند طبیعت مجھے اس طرف لے آئی۔ خدا نے

رہنمائی کی اور یہ علم میری ذات کا حصہ بن گیا۔ مزید وضاحت مانگی جائے تو وہ کہتا ہے قرآن مجید میں ۱۴ مقطعات ہیں مثلاً ص، قاف، طہ، حم، یسین، الہم، الر، طسم، عشق، المر، المص، کھنص۔ یہ ۱۴ مقطعات قدرت کی ۱۴ ہارڈ ڈسکیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے پوری نسل انسانی کے احوال درج کر دیئے ہیں۔ بس جو اللہ تعالیٰ کے کمپیوٹر کو چلانا سیکھ جائے اس پر قدرت کے اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔ پوچھا جائے۔ ”آپ قدرت کا یہ کمپیوٹر کیسے چلاتے ہیں؟“ تو وہ کہتا ہے کہ جب کوئی شخص ملتا ہے تو میں اپنے حواس کا مشاہدہ صفر پر لے آتا ہوں۔ دماغ میں روشنی کی پٹی سی نظر آتی ہے جس میں سوال کا جواب ہوتا ہے۔ پوچھا جائے کبھی آپ کو قدرت کے کمپیوٹر نے غلط اطلاع بھی دی تو وہ ہنس کر کہتا ہے نہیں کیونکہ جب خدا کسی شخص کی ذات کا حصہ بنتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان بن جاتا ہے اور خدا کی زبان سے غلط اطلاع نشر نہیں ہو سکتی۔ میں نے پروفیسر سے دس برس کی رفاقت میں قدرت کے اس کمپیوٹر کے کئی مظاہر دیکھے جن کا ذکر ممکن نہیں کیونکہ اس سے مضمون کے افسانوی بن جانے کا خدشہ ہے۔

پروفیسر نماز روزے اور حج کی تلقین نہیں کرتا۔ پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے تصور خدا کے بغیر نماز نماز نہیں ایکس سائز ہوتی ہے۔ مذہب میں اس قدر بگاڑ آ چکا ہے کہ لوگوں کے خدا اور اصل خدا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پوچھا جائے اصل خدا کی بیعت کیا ہے؟ وہ کہتا ہے خدا کی بیعت دکھائی نہیں جاسکتی صرف سمجھائی جاسکتی ہے کہا جائے سمجھائی دیں تو وہ کہتا ہے۔ ”جہاں خدا ہوتا ہے وہاں خوف اور دکھ نہیں ہوتا اور مسجدوں سے باہر نکلنے والوں میں سے کتنے ہیں جن کی ذات میں خوف اور دکھ نہیں؟“ پوچھا جائے آپ کون ہیں؟ وہ کہتا ہے میں خدا کا ایجنٹ ہوں۔ لوگوں کو جھوٹے خداؤں سے الگ کر کے اصل خدا کی پہچان کرانا ہوں پھر انہیں خدا کے راستے پر ڈال کر خود واپس گھر آ جاتا ہوں۔ وہ کامیاب ہو جائیں تو ان کا نصیب نہ تو خدا کی مرضی میری ذیونی ختم۔ پوچھا جائے اور نماز؟ تو وہ کہتا ہے جب درخت پر پھل تیار ہو جائے تو نہیں خود ہی جھک جاتی ہے۔ خدا ایک بار انسان کی ذات کا حصہ بن جائے تو پیشانی سجدے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ میرا کام انسان کو خدا کے سامنے کھڑا کرنا ہے ان کے درمیان آشنائی کا ٹوٹا رشتہ بحال کرنا ہے۔ انہیں سجدوں پر مجبور کرنا نہیں کیونکہ یہ اس کا کام ہے جس نے پیشانیاں بنائیں اور سجدے بھی جس کا کام اسی کو سنا مجھے۔

پروفیسر تصوف کے سارے مروجہ نظام کو ہی یک جنبش قلم مسترد کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے

نشر انسان کا شروع سے مسئلہ رہا ہے۔ انسان سرمست ہونا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کے دکھوں سے بھاگنا چاہتا ہے اور نشہ و عمل ہے جو انسان کے یہ دونوں اذلی مسائل حل کر دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے جب نشی کا نشہ نوتا ہے تو زندگی کے دکھ پہاڑ بن کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ نشہ کیسے شروع ہوا؟ یہ سوال آج کے انسان کو اکثر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے اس فہر میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔

باروت اور ماروت نے شراب کو حقیر چیز جان کر منہ سے لگا لیا تو بابل کی زہرہ دیوی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ نادان فرشتو! تم پر زمین کا جادو چل چکا ہے۔ اب تم قتل بھی کرو گے بدکاری بھی کرو گے اور مجھے اسم اعظم بھی سکھاؤ گے۔ اور فرشتوں جن کے ہونٹوں پر شراب کی سرخی اور زبان پر ترشی کا احساس ابھی گہرا نہیں ہوا تھا اور معدوں کے اندر تڑپنے والی حدت نسوں تک نہیں پہنچی تھی انہوں نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ ہم فرشتے ہیں اور دنیا کی حقیر چیزیں فرشتوں کے ایمان کی فسیلیں عبور نہیں کیا کرتیں۔ لیکن جب نشے نے شعور کے دروازے پر دستک دی تو زبان نے سینہ قدرت کے سارے راز فاش کر دیے اور جسم غلاظتوں کے جزو بن گئے۔ ہوش آنے پر دونوں فرشتے چاہ بابل میں اُلٹے لٹکتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے سزا تھی اور روز محشر تک انہوں نے یہ سزا بھگتنا تھی۔ کیونکہ یہ شراب نوشی کی سزا تھی جسے منہ لگانے کے بعد سینوں کے سارے راز اہل پڑتے ہیں اور اخلاقیات کی ساری بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات کی بجائے صرف خطا بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی تاریخ انسانی کا متفقہ نتیجہ ہے۔

خود فراموشی کے لئے شراب دنیا کا قدیم ترین ذریعہ ہے۔ تمام مقدس کتابوں اور تمام تہذیبی آثار میں شراب نوشی کے حوالے ملتے ہیں۔ مصر، روم، یونان اور ہندوستان کی تہذیبوں میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ فراعنہ مصر کے احرام کی کھدائی کی گئی تو پرانے زیورات، سحائف، ملبوسات اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں آلات سے کشی بھی برآمد ہوئے۔ اہل روم انکور کی شراب کشید کر کے اس میں سرخ رنگ ملا تے تھے اور پھر پورے شہر میں سے نوشی کی اجتماعی تقریبات ہوتیں۔ جب نشے کی دیوی اہل شہر کے بالوں میں نرم اٹھکیاں پھیلتی تو تمام عجائبات اُٹھ جاتے۔ میں تو اور تو میں کی کیفیت وارد ہوتی اور جب صبح کی روشنی پھیلتی تو ہر بی بی باپ

اور ہر بھائی بہن سے آنکھ چراہا ہوتا۔ یونانی اپنی دیویوں اور دیوتاؤں کو شراب میں غسل دے کر مذہبی فریضہ انجام دیتے اور پھر سنگی مجسموں کے پیروں کے قریب گری متبرک شراب کے حصول کے لئے تلواریں سونت لیتے۔ سقراط اور اس کے شاگرد شراب کے گھڑے کے گھڑے چڑھا کر ننگے پاؤں برف پر پھرتے رہتے اور اسطو کا دانشور جنگجو سکندر عظیم کا باپ ایک بار پی کر لڑھک گیا تو سکندر نے شاہی محل کی چھت پر کھڑے ہو کر اعلان کیا 'مقدونیہ کی مائیں دیکھیں کہ وہ اپنے بچوں کو جس شخص کی شجاعت اور بہادری کی داستانیں سناتی ہیں آج وہ ایک پیالہ شراب سے شکست کھا گیا۔ اے اہل مقدونیہ! دیکھو تمہارے سپہ سالار کی ٹانگوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ بستر تک پہنچنے کے لئے اس کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اے مقدونیہ کے لوگو گواہ رہنا سکندر شراب نہیں پئے گا کیونکہ سکندر کو شکست سے نفرت ہے۔ جزیرہ نما عرب کے بدو مٹی کے پیالوں میں بدبودار شراب ڈال کر پیتے اور جب مرد و زن ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتے تو کپڑے اتار کر طواف کعبہ میں مصروف ہو جاتے کیونکہ ان کی نظر میں عبادت و ریاضت کا اس سے زیادہ معتبر ذریعہ کوئی اور نہیں تھا۔ اور ہندوستان جب چنگے شانوں اور چوڑے جڑوں والے آریاؤں کے بھاری بھر کم دھڑکے تو ان پر بڑے بڑے منکوں میں 'سوم رس' بھی تھا۔ جس سے بدبو کے جھمکے اٹھتے تھے اور ان پر بیٹھنے والی کھیاں پرواز کا قرینہ بھول جاتی تھیں۔ آریائی لوگ جب ان منکوں سے 'سوم رس' کے پیالے بھر بھر کر پیتے تو ان کے تمام فکر اندیشے اور خوف کند ہو جاتے۔ رات کی سیاہی چاندنی کی چادر بن جاتی۔ تیز چھیننے والی گرم ہوائیں نسیم سحر کے جھونکوں کا روپ دھار لیتیں اور ہمالیہ کی سرو ہوائیں الاؤ میں ڈھل جاتیں۔ مقامی باشندوں نے آقاؤں کے ساتھ ساتھ اس متبرک مشروب کا بھی آگے بڑھ کر سواگت کیا شراب کی اثر پذیر ویدیوں کا حصہ بن گئی۔ ہندومت کی پرانی کتابوں میں شراب کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان میں دیوی اور دیوتا شراب کے گھروں میں رہتے ہیں۔ شراب ہی اوزھتے اور شراب ہی بچھا کر سوتے ہیں اور خوش ہونے پر شراب ہی کی شکل میں انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔

ہندوستان کے مغل شہنشاہوں میں بھی شراب بہت مقبول تھی۔ ظہیر الدین بابر بلا کا سے نوش تھا۔ اس کے لئے سرقند سے شراب 'درآمد' کی جاتی تھی جو سرقند کے مخصوص انگوروں سے کشید کی جاتی تھی لیکن 'کنواہ' کی لڑائی میں جب اسے مضبوط فوجوں کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے منت مانی کہ اگر اس معرکے میں اسے فتح نصیب ہوئی تو وہ کبھی شراب کو منہ نہیں لگائے گا۔ منت

پوری ہوئی اور اس نے سارے لشکر کے سامنے آلات سے نوشی توڑ کر ہمیشہ ہمیش کے لئے شراب سے توبہ کر لی لیکن اس کی اولاد اس قسم کے دائرے میں نہیں آتی تھی چنانچہ اس کے بعد مغل شہنشاہ شہزادے امراء اور درباری اہلکار زندگی بھر 'لال پری' کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے۔ شہنشاہ جہانگیر روزانہ ۱۹ تولے دو آتشہ شراب پیتا تھا۔ اس کثرت استعمال سے اس کا جگر جواب دے گیا۔ سانس لینے میں دشواری رہنے لگی لہذا مجبوراً وہ شراب نوشی کے بعد اونٹنی کا دودھ پیتا۔ اس نسخہ سے اس کی سانس تو بحال ہو جاتی لیکن جسم نرمی طرح ناطقی کا شکار ہو جاتا۔ شہنشاہ ہندوستان جس کی مملکت خدا داد کی سرحدیں برما چین اور ایران تک وسیع تھیں اس کو چار کبار ڈولی میں بٹھا کر دربار لاتے جہاں شہنشاہ کو چند الفاظ کی اداسگی کے بعد کھانسی کا دورہ پڑتا اور انہیں سہارے کے لئے ملکہ عالیہ نور جہاں کے دست خیریں کی ضرورت پڑتی۔ شہنشاہ کی قوت فیصلہ عملاً جواب دے چکی تھی چنانچہ بات کرنے کے دوران شہنشاہ ملکہ عالیہ کا رخ انوار کو دیکھتا رہتا جہاں رخ نریا پر نگاروں کے اثرات ظاہر ہوتے وہیں عالم پناہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دیتے۔ جہانگیر بڑی فراخ دلی سے شراب کو اپنی تمام تر ناطقی کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ اس لئے ہندوستان میں اس کے دور میں شراب بنانے، بیچنے اور پینے کی سزا موت رکھی گئی تھی۔ لیکن جہاں 'زنجیر عدل' ہی شراب میں بیگی ہو وہاں عوام کو ساقی گرمی سے کون روک سکتا ہے۔ اور آخر میں ایک پیالہ شراب 'سیخ کباب' اور ملکہ نور جہاں کا دیدار عالم پناہ کی آخری خواہش تھی۔ شاہ جہاں اور ان کے ایک آدھ بیٹے کے سوا ساری اولاد کی شامیں باد و ساغر کی روشنی میں گزرتیں اور جنسیں نشاط نو کا پیغام لے کر طلوع ہوتیں۔ اور نگ زیب کے دور میں نسبتاً سکون رہا۔ عالم پناہ کے مذہبی رجحانات کے باعث کاروبار سے زیر زمین چلا گیا۔ امراء مخبروں سے بیخ بچا کر گھروں میں شراب پیتے اور منہ کی بدبو چھپانے کے لئے پیاز استعمال کرتے لیکن اورنگزیب کے بعد ہندوستان میں ایسا دور بھی آیا جب محمد شاہ رنگیلا شراب پی کر دربار میں سرعام پیشاب کرتا تھا اور درباری اس انداز خسروانہ پر خوشی سے ناچنا شروع کر دیتے تھے جبکہ آخری شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کی غیرت و حمیت کو شراب کی ویک اس قدر چاٹ چکی تھی کہ فدر کے دوران جب شاہ اسلامی لشکر کی قیادت کے لئے نکلے تو الال قلعے کے سامنے ہی گھوڑے سے گر گئے۔

جنگ عظیم دوم میں پے در پے شکستوں کے بعد جب اتحادی فوجیں ہمت ہار گئیں اور فوجی 'بلڈی وار' سے جان چھڑانے کی کوشش کرنے لگے تو برطانوی حکومت نے ان کا شراب کا

کو نہ بڑھا دیا۔ گلگت کی سرحد پر تعینات امریکی فوجیوں کو ”رم“ فراہم کی گئی۔ بریلی ہواؤں میں دشمن کا انتظار کرنے والے امریکی فوجیوں پر اس نشتے نے بڑے خوش کن اثرات مرتب کئے۔ جلد ہی رم فوجی شجروں کو بھی پلائی جانے لگی اس سے ان کی کارکردگی بھی بڑھ گئی۔ انگریز سرکار مشرق وسطیٰ، برصغیر اور یورپ کے محاذوں پر لڑنے والے دیسی سپاہیوں کو لڑنے مرنے پر اُکسانے کے لئے بے تحاشا شراب پلائی تھی اور فوجی نشے کی ترنگ میں ”دشمن“ کے کیمپوں میں داخل ہو جاتے تھے نتیجتاً جان سے جاتے تھے۔ یہ تجربہ زیادہ عرصہ تک کامیاب نہ رہا کیونکہ کثرت شراب نوشی اور خوراک کی کمی کے باعث بہت جلد فوجوں کی قوت مدافعت جواب دے گئی۔ سانس کی بیماری اور نمویہ کے حملے ہونے لگے۔ نتیجتاً ہر کیمپ کی پچیس سے تیس فیصد نفری ہسپتالوں تک جا پہنچی۔ مجبوراً جنگ کے آخر میں شراب کے کوئے میں تخفیف کرنا پڑی اور سرد علاقوں کے فوجی ٹھکانوں پر رم کی ترسیل عملاً روک دی گئی۔ اس اقدام سے فوجیوں میں مزید بے دلی پھیلی انگریز دور کے بعد ایک لمبے عرصے تک پاکستان آرمی کو شراب کا کوئے ملتا رہا جبکہ بھارتی فوجی کیمپوں اور میسوں میں شراب کا استعمال ابھی تک جاری ہے۔

صدیوں سے پنجاب کے جاگیردار اپنے کیمپوں کو شراب پلا کر دشمن پر وار کرنے کے لئے بھیجتے آ رہے ہیں۔ اس اقدام سے دشمن مر جاتے تو ست بسم اللہ دوسری صورت میں کمی مر جاتے تو بھی دشمن کو مقدمات میں پھنسا کر انتقام لے لیا جاتا۔ سکھ بھی باہم لڑائی جھگڑوں سے پہلے دماغ ”گرم“ کرنے کے لئے اجتماعی شراب پیتے تھے۔ ”جنیال“ پیالے بھر بھر کر گھبرو نو جوانوں کو پلائی جاتیں اور ساتھ ڈھول پیٹ پیٹ کر بہادری اور شجاعت کے گیت گاتی جاتیں۔ اس عمل سے سکھ جتوں کا دماغ مزید ”سردارانہ“ ہو جاتا اور پھر وہ گھمسان کارن پڑتا کہ اللہ کی پناہ۔ کسی کا بازو سلامت نہیں تو کسی کی ٹانگ غائب کوئی وہیں میدان کارزار میں جان دے گیا اور کوئی گھر پہنچ کر بڑھوں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ غرض پنجاب کے سکھوں کی تمام تر بہادری شراب کے مہون منت تھی۔

شراب کے بعد پوست دنیا کا دوسرا بڑا نشہ ہے۔ جس سے نشے کی ۱۸ اقسام کشید کی جاتی ہیں۔ ان میں افیون پہلے نمبر پر ہے۔ پوست کی فصل تیار ہونے کے بعد اس کے ڈوڈوں کو چھوٹے چھوٹے چیرے دے دیئے جاتے ہیں۔ جن سے لیس دار مواد بننے لگتا ہے۔ اس مواد کو جمع کر کے خشک کر لیا جائے تو سیاہ رنگ کی برنی سی بن جاتی ہے اسے افیون کا نام دے دیا جاتا ہے۔

یہ نام کس نے کب اور کیوں رکھا اس کا تو علم نہیں لیکن زمانہ قدیم سے افیون کا استعمال ہندوستان میں جاری ہے۔ نشے باز افیون کی گولی دودھ یا پانی کے ساتھ نگل جاتے ہیں جو معدے میں جا کر نشی پر اونگھ طاری کر دیتی ہے چمکیں بو بھل ہو کر آنکھوں پر گر جاتی ہیں قدم بہکنے لگتے ہیں اور آواز بھر جاتی ہے۔ نشی اس کیفیت کو ترنگ کہتے ہیں۔ اس حالت کے خاتمے کے بعد بھی دیر تک جسم میں ہلکی ہلکی سنسناہٹ ہوتی رہتی ہے جو دراصل ”مل من مزید“ کا نقارہ ہوتی ہے۔ مغل شہنشاہ ہمایوں خان اس لت کا بری طرح شکار تھا۔ شاہ کو سونے کی پیالی میں افیون گھول کر پلائی جاتی تھی۔ جس کے بعد تاجدار ہند ایک پلیٹ دودھ کی بالائی نوش جاں فرما کر لیٹ جاتے اور کاروبار سلطنت مصاصین کے ہاتھ میں چلا جاتا۔ ہمایوں خان اس لت کی وجہ سے جسمانی غلاظت کنبوی بزدلی اور کالہ کی سرب المثال تھا۔ اس کا انتقال بھی افیون کے نشے میں سیڑھیوں سے گر کر ہوا۔ نوابین اودھ میں بھی افیون کھانے کا رواج عام پایا جاتا تھا۔ نوابین خود کو افیونی کی بجائے ”چنیا بیگم کے عشاق“ کہلاتے تھے۔ افیون خوردنی کے لئے نواب شائقین کے لئے تقریبات کا اہتمام کرتے جہاں اجتماعی طور پر اس کا نشہ کیا جاتا اور چنیا بیگم کے عشاق ترنگ میں کیا کیا حرکات کرتے اس کا تصور تک محال ہے تاہم پنڈت رتن ناتھ سرشار کا سدا بہار تاول ”فسانہ آزاد“ کا لکھنوی کردار ”خونی“ اپنی حرکات و سکنات سے افیون خوردنی کی کیفیات کی کسی نہ کسی حد تک تشریح ضرور کرتا ہے۔

چین میں افیون بہت کم پیدا ہوتی تھی۔ ۱۷ویں صدی کے شروع میں برطانوی اور فرانسیسی تاجروں نے چین میں افیون خوردنی پر لگا دیا۔ نشہ عام ہوا تو چینی حکمران مانچو نے ۱۸۳۸ء میں اس پر پابندی لگا دی۔ نتیجتاً برطانیہ نے چین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۸۳۹ء میں چین میں افیون کی جنگ لڑی گئی جس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔ جس کے بعد برطانوی تاجر بڑی خوش اسلوبی سے چین کو بھارت سے افیون اور کوکین فراہم کرنے لگے یہاں تک کہ پوری قوم افیونی ہو گئی۔

افیون کے علاوہ پوست کے بے شمار استعمال ہیں۔ جن میں کچھ کا احوال درج ذیل ہے۔

پوست کے ڈوڈے گھوٹ کر پئے جاتے ہیں۔ اس کے پتوں کا حلوہ بنایا جاتا ہے ڈوڈوں سے نکلنے والے باریک دانوں ”خشخاش“ کو باریک نہیں کر اس میں دودھ ملا کر پیا جاتا

ہے۔ پوست کو پانی میں اُبال کر صاف کیا جاتا ہے پھر اس کی گولیاں بنائی جاتی ہیں جن کو خاص قسم کے حقے میں لپیٹ کر بھی پیا جاتا ہے اسے "چائڈ" کہتے ہیں۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے لاہور میں مزنگ، گئی سمیاں اور حکیموں بازاروں کے خستہ حال بھلے مکانات میں درجنوں چائڈ خانے قائم تھے۔ یہاں نشے باز گندی زمین پر لیٹ کر سر کے نیچے اینٹ رکھتے دو روپے دے کر "چائڈ" لگاتے اور تین گھنٹے تک ماؤف العقل ہو کر "سو" جاتے۔ پاکستان میں نشوں کے جدید طریقے آنے کے بعد یہ چائڈ خانے بند ہو گئے لیکن مشرق بعید اور یورپ میں یہ ابھی تک قائم ہیں۔ لندن کے مضافات میں چینیوں نے کئی چائڈ خانے بنا رکھے ہیں جہاں گوروں کی لا پرواہ نسل "اویم سوکنگ ڈیز" کے مزے لیتی رہتی ہے۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں پوست سے دو نئے کیمیائی عناصر کشید کئے گئے یہ عناصر Demerol اور Codein کے نام سے مشہور ہوئے۔ کوڈین کے بارے میں ابتدائی تصور تھا کہ یہ کھانسی میں افاقہ دیتی ہے لہذا کوڈین کھانسی کے تمام شربتوں کا لازمی جزو بن گئی۔ پاکستان میں جب منشیات پر پابندی لگائی گئی تو نشے باز "کف سیرپ" کی طرف دوڑ پڑے۔ لوگ سچے روپے کی شیشی لے کر منہ سے لگا کر پوری پی جاتے۔ بعض نشے باز تو نیند کی گولیوں کے ساتھ چار چار بوتلیں چڑھا جاتے۔

افیون کو ایک کیمیائی عمل سے گزار کر اس سے مارفین الگ کر لی جاتی ہے۔ یہ مارفین نیچے کے ذریعے جسم میں داخل کی جاتی ہے جس کے بعد مارفین کی جسمانی دروس تھوڑی دیر کے لئے ختم ہو جاتی ہیں۔ ابتدا مارفین طبی نقطہ نظر سے استعمال کی جاتی رہی لیکن بعد ازاں نشے بازوں نے اس کو بھی نشے کی شکل دے دی۔ پاکستان کے شہروں اور قصبہ جات میں اکثر ایسے نشی نظر آنے لگے جن کی جیبوں میں مارفین کی بوتل ہوتی اور انہیں جہاں ضرورت پڑتی خود ہی انجکشن تیار کر کے لگا لیتے۔

دنیا میں منشیات نے باقاعدہ کاروبار کی شکل اختیار کی تو سسلی کا جزیرہ "ہلمر مو" ڈرگز کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ منشیات فروشوں نے یہاں "ڈرگ مافیا" کے نام سے ایک زیر زمین سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا کنگ "گاؤ فادر" کہلانے لگا۔ مافیا نے تمام جدید سائنسی سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منشیات کا زہر پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ہر ملک میں ان کے اڈے تھے اور ہر ملک میں ان کے ایجنٹ۔ "پیداواری" اہمیت کے حامل ممالک میں مافیا نے سیاست دانوں کو خریدا۔ بیورو کریسی، عدلیہ اور فوج میں اپنے بندے بھرتی کرائے اور پھر اپنی مرضی کی حکومتیں بنوا کر گندم

پنے اور گئے کے کھیتوں میں پوست بھنگ اور کوکا کاشت کرائی۔ گاؤ فادر کے اثر نفوذ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی حکمران کو چند منٹ کے نوٹس پر قتل کر سکتا ہے اور کسی بھی علاقے کو مکمل طور پر صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔

۱۹۷۸ء میں "ہلمر مو" کی خفیہ لیبارٹری میں ایک کیمیادان کام کرتا تھا۔ لوگ اسے جسمانی بد صورتی کے باعث "ہیرو" کہتے تھے اس نے ۱۹۷۸ء میں مارفین اور سرکہ کے تیزاب کے کیمیائی عمل سے ایک نیا عذاب دریافت کر لیا۔ اس وقت کے علم تھا کہ ایلیو سلیم کے نرے میں پڑا یہ مٹھی بھر سفید سفوف چند برس بعد دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہو گا اور لاس اینجلس سے لے کر پولینڈ اور خرہ اسود سے لے کر بحیرہ عرب تک کروڑوں لوگ اس زہر کا شکار ہو کر زندگی سے موت کی بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ اس سفوف کو ابتداً "سنو" کا نام دیا گیا لیکن جب وزن میں ہلکی ڈالتے ہیں تلخ اور بد بو میں سرکے سے ملتی جلتی اس سنو کو دنیا جہاں سے پڑیرائی ملی تو اسے خالق کے نام کی مناسبت سے "ہیروئن" کا نام دے دیا گیا۔ ڈرگ مافیا نے ہیروئن سازی کے لئے اعلیٰ اور فرانس میں وسیع پیمانے پر پوست کی کاشت شروع کرادی۔ مافیا کے کارندے مظلوم الحال کسانوں کو اغوا کر کے لاتے اور انہیں خنجر زمینوں پر مل چلا کر موت کی کاشت پر مامور کر دیا جاتا تھا۔ جب یورپ میں سختی ہوئی تو ڈرگ مافیا کے اہلکار ترکی اور شام سے افیون لے کر اس سے مارفین کشید کرتے اور اسے اپنے ذاتی بحری جہازوں میں یورپ لے جاتے جہاں اس میں کیمیائی اجزاء ملا کر ہیروئن تیار کر لی جاتی۔ امریکہ میں ہیروئن فردشی کا سارا حندہ اطالوی سمگلروں کے ہاتھ میں تھا جہاں یہ لوگ دو کروڑ روپے کلو کے حساب سے ہیروئن فروخت کرتے تھے۔ انتہائی منفعت بخش کام دیکھ کر مشرق بعید کے کسانوں نے بھی اپنے کھیتوں میں پوست کی کاشت شروع کر دی اور جلد ہی تھائی لینڈ، کمبوڈیا اور مکاؤ منشیات کی سنہری مثلث بن گئی۔ ادھر بھی پابندیاں سخت ہوئیں یہ تو کاروبار پاکستان کے شمال مغربی علاقوں اور افغانستان کی سرحدوں پر پہنچ گیا۔ جہاں کے غریب قبائلی کاشتکاروں نے اپنے مچھوٹے گھروں کو ہیروئن کی لیبارٹریاں بنا لیا۔ دنیا جہاں کے سمگلروں نے کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں اپنے اڈے قائم کئے اور ہماری "پراڈکٹ" دنیا کے تمام جدید ممالک کی مارکیٹوں میں پہنچنے لگی۔ پاکستان میں ہیروئن پر مزید تحقیق ہوئی اور اس میں چند دیکھی اشیا بھی ڈال دی گئیں جس سے اس کی رنگت نیالی ہو گئی اور اس کی ٹیکنی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

حسن بن صباح کے قلعہ الموت میں پہلی مرتبہ بھنگ کو بطور نشہ متعارف کرایا گیا۔ اس نے ایک جنت تعمیر کرائی جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بھی تھیں اور سفید سنگ مرمر کی بارہ دریاں بھی اور ان بارہ دریوں میں سفید براق لباس میں ملیں جوڑیں بھی حسن کے کارندے مضامقات سے مضبوط تن و توش کے دیہاتی پکڑ کر لاتے اور انہیں بے ہوش کر کے جنت میں پھینک دیا جاتا۔ ہوش آنے پر انہیں جنتی ہونے کی نوید سنائی جاتی۔ پھر جوڑیں بھنگ کے پیالوں سے ”جنتی“ کی پرورش شروع کر دیتیں چند ہفتوں کے بعد خوشخبری سنائی جاتی کہ انہیں چند روز کی آزمائش کے لئے دوبارہ زمین پر بھیجا جا رہا ہے۔ جنتی خوش ہو جاتا اسے زہر میں بھجا خجروں سے کرکسی مسلم عالم یا سپہ سالار کے قتل کے لئے روانہ کر دیا جاتا اور وہ بھنگی اسے حکم خداوندی سمجھ کر جان لٹا دیتا۔ بعد ازاں مسلم رہنماؤں کی دعوت پر ہلاکو خان نے حملہ کر کے یہ جنت تاراج کر دی۔ حسن بن صباح مارا گیا اور قلعہ الموت کھنڈ رہن گیا لیکن بھنگ کی وبا پوری دنیا میں پھیل گئی۔ ہر ایک ہڑپنوں والے اس پستہ قامت پوئے سے نشے کی تپہ اقسام کشید کی جاتی ہیں۔ بھنگی اس کے خشک پتے گھونٹ کر ان میں بادام اور چار مغز ملا کر پیتے ہیں۔ ان کے پتوں کو تمباکو کی طرح کاغذ میں لپیٹ کر پیا جاتا ہے جبکہ چرسا گانجا اور مدھک بھی اسی سے اخذ کی جاتی ہے۔

میکسیکو میں زمانہ قدیم سے Cactus نامی کانٹے دار درخت کے پتے کھانا اور جزیں اُبال کر چٹا مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کو بعض لوگ ”مٹبرک کھمبی“ اور اکثر God's Flash کا نام دیتے ہیں جبکہ عربی میں اسے رقوم اور اردو میں تھوہر کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں چار مختلف مقامات پر تھوہر کا نام آتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کناؤ گاروں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے وہاں کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو اذیت رسائی کے لئے تھوہر کھلایا جائے گا۔ ۶۰ کی دہائی میں کولمبیا کے سمگلروں نے طویل ”ریسرچ“ کے بعد دوزخیوں کی اسی خوراک سے ایل۔ ایس۔ ڈی نامی سفوف اخذ کیا جو انتہائی مہلک نشہ ثابت ہوا۔ یہ سفوف قرآن مجید کی پیشگوئی کے عین مطابق پیٹ میں جا کر کھولتا ہے۔ دماغ میں پہنچ کر تمام اعصاب کو سن کر دیتا ہے اور نشی دنیا و مافیہا سے اُتعلق ہو جاتا ہے۔ ایل۔ ایس۔ ڈی کی دریافت کے بعد کولمبیا کے سمگلر اس قدر فائدہ مند ہو گئے تھے کہ انہوں نے سزا سنانے والے متعدد جج ہلاک کر دیے۔

کوکین کی دریافت بھی کم عجیب نہیں۔ برازیل کے جنگلوں میں ”کوکا“ نام کا ایک پودا کثرت سے اگتا ہے۔ پرانے زمانے میں یہاں کے باسی اس پودے کی جزیں اُبال کر جانوروں

کے زخموں پر لگاتے تھے جس سے دُشور و نگروں کا درد فوراً رفع ہو جاتا تھا۔ دنیا میں منشیات کی ترویج کے ساتھ ہی کیمیا دان ”کوکا“ کی طرف متوجہ ہو گئے اور جلد ہی اس کے سرت سے ”کوکین“ تیار کر لی گئی۔ یہ سفید سفوف ابتداً جنسی ادویات میں استعمال ہوا لیکن بعد ازاں مخصوص امراض کے ماہرین نے اس کا براہ راست استعمال شروع کر دیا جس کے بعد یہ نشے کی حالت میں مارکیٹ میں آ گیا۔ ۱۹۶۴ء میں لاہور کے بازار حسن کے ایک پان فروش نے پہلی مرتبہ پان کے ذریعے کوکین متعارف کرائی اس کے ”مخصوص“ گاہکوں کی پذیرائی کے بعد پان فروش کے کاروبار کو چار پانڈلگ گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں بید کھل گیا اور پان فروش کو پولیس پکڑ کر لے گئی لیکن یہ فارمولا دوسرے پان فروشوں کے ہاتھ جا لگا اور یوں لاہور کے ۲۰ فیصد پان فروش یہ دھندہ کرنے لگے۔ ۶۶، ۶۷ء میں بڑا ہتھ روڈ کا ایک پان فروش اس نسخے کے لئے بڑا مشہور تھا وہ مخصوص پان ”کوکیم“ کہتا تھا اور کوئی بھی گاہک سوارو پیہ دے کر یہ ہم خرید سکتا تھا۔ یہ پان کھانے کے فوراً بعد گاہک کی زبان سو جھ جاتی اور وہ دو گھنٹے تک بولنے سے محذور ہو جاتا ہاں البتہ اس کی جنسی طاقت میں ضرور اضافہ ہو جاتا۔

ادویات میں نشہ آور اجزاء کے استعمال کا آغاز ویدک طب سے ہوا جس سے متاثر ہو کر مسلم اطباء نے بھی اپنے نسخوں میں منشیات کا بلا جواز استعمال شروع کر دیا۔ اس طرح دانت درد سے زکام آشوب چشم سے جسمانی کمزوری تک کی زیادہ تر ادویات میں پوست اور بھنگ استعمال ہونے لگی۔ میڈیکل سائنس اور سرجری کے آغاز کے ساتھ ہی طبی نکتہ نظر سے منشیات کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ حادثے کے بعد اور آپریشن کے دوران مریض کا احساس درد دور کرنے کے لئے اسے مارفین اور پینتھین کا انجکشن لگایا جانے لگا۔ گو چند روپے کے اس ٹیکے کے بعد مریض درد کے احساس سے آزاد ہو جاتا تھا لیکن انجکشن کا اثر ختم ہونے کے بعد تکلیف زیادہ شدت سے وار کرتی تھی لہذا مجبوراً مریض کو پھر انجکشن دینا پڑتا۔ اس عمل کے دوران مارفین کی لذت بعض مریضوں کی تسوں میں رچ بس جاتی اور وہ اس کے مستقل عادی ہو جاتے جس کے بعد ان کی باقی زندگی منشیات کے ارد گرد گھومتی رہتی۔ یہاں تک تو بات قابل قبول تھی کیونکہ مارفین کی زہر میں آنے والی آباوی کسی بھی طرح اشاریہ ۵ سے زائد نہیں تھی لیکن نیند کی ادویات کی ایجاد کے بعد غیر محسوس طریقے سے عام آدمی کی زندگی میں بھی منشیات داخل ہو گئیں مسکن ادویات کا استعمال ابتداً اعلیٰ سوسائٹی سے شروع ہوا جہاں بزنس مین سیاست دان وکلاء اور زندگی کے دوسرے مصروف

شعبوں سے وابستہ وہ لوگ یہ ادویات لینے لگے جنہیں کسر نیند کی شکایت تھی۔ ظاہر ہے ان ادویات کے استعمال کے بعد ان کی یہ شکایت رفع ہو گئی تو ان لوگوں نے اپنی فحش محفلوں میں بڑے فخر سے ان جادوئی گولیوں کا ذکر شروع کر دیا جس سے سننے والوں کا متاثر ہونا قدرتی امر تھا لہذا خواب آور ادویات کے استعمال کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ جلد ہی ترقی یافتہ ممالک میں مسکن ادویات فیشن بن گئیں لوگ سنے سے قبل گولی کھانا قابل فخر سمجھنے لگے اور جن لوگوں کو دوا کے بغیر نیند آ جاتی انہیں غریب اور گنوار تصور کیا جانے لگا۔ دوا ساز کمپنیوں نے مارکیٹ دیکھ کر دھڑا دھڑ مسکن ادویات بنانا شروع کر دیں۔ آج یہ گولی تو کل فلاں گولی اسی دوا میں پانچ سات برس قبل جرمنی میں نیند کی ایک ایسی حیرت انگیز دوا دریافت ہوئی جو نہ صرف تھکے ہوئے اعصاب کو سکون دیتی تھی بلکہ ”مریض“ اگلے روز خود کو ہشاش بشاش بھی محسوس کرتا تھا۔ اس گولی نے یورپ میں تھمک مچا دیا۔ ہر مرد کے کوٹ کی جیب اور ہر خاتون کے پرس میں یہ گولی ضرور ہوتی تھی۔ اس تریاق کی شہرت یورپ سے نکلی تو امریکہ، مشرق وسطیٰ، آسٹریلیا اور مشرق بعید میں بھی ان گولیوں کی تیاری شروع ہو گئی لیکن پھر ایک حادثہ ہو گیا۔ فرانس کی ایک حاملہ عورت نے کچھ عرصہ تک دوا کھائی جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس کی ٹانگیں اور ہاتھ غائب تھے۔ چند روز بعد اسی محلے کی ایک عورت نے بھی معذور بچے کو جنم دیا۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا وہ بھی یہی دوا استعمال کر رہی تھی۔ اس کے بعد پوری دنیا سے معذور بچوں کی پیدائش کی اطلاعات آنے لگیں۔ جنم کی ایک عورت نے اپنے معذور بچے کو قتل کر دیا۔ ایک امریکی عورت نے ہسپتال کی انتظامیہ کو استعطا حمل پر مجبور کیا انکار پر وہ اس کام کے لئے سویڈن چلی گئی۔ اس خوفناک تجربے کے بعد حاملہ عورتوں کے لئے خواب آور ادویات کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔

ڈیپریشن اور فرسٹریشن کی دریافت کے بعد مسکن ادویات کا استعمال مزید بڑھ گیا کیونکہ ان نشئی مرکبات کے استعمال سے اضطراری کیفیت کے شکار شخص کی حیات کند ہو جاتی ہیں اور وہ دوا کے اثر تک پرسکون رہتا ہے۔ ان مرکبات کو نشے کی گولیاں یا خواب آور ادویات کے نام سے پچانے کے لئے ”نرسنگ ہاؤسز“ کا نام دے دیا گیا۔ اس وقت ۱۵۰ ایسی ادویات مارکیٹ میں موجود ہیں جو سکون یا غندائے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ طبی نسخوں میں کثرت استعمال اور دوا ساز اداروں کی پبلسٹی کے باعث معمولی گھبراہٹ بے قراری اور ذہنی خلجان میں ان ادویات کا استعمال ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ ۸۰ فیصد پڑھے لکھے لوگوں کو ان ادویات کے نام تک

حفظ ہیں جو نہی کوئی شخص پریشانی محسوس کرتا ہے فوراً بازار سے گولی خرید کر کھا لیتا ہے اور کیوتربلی کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن ”نشہ اترنے“ کے بعد ذہنی پریشانی دو گنی جسامت میں بدستور سامنے کھڑی ہوتی ہے۔

نشے کے خلاف اسلام کی خدمات کا ذکر کئے بغیر یہ کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ نبی کریم ﷺ نے جب دعوت اسلام شروع کی تو عرب معاشرے میں شراب سمیت ہر قسم کی مروجہ منشیات عام تھیں۔ لوگ (بشمول مسلمان) پی کر بہک جانا عیب نہیں سمجھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں جب ان شرابیوں کے ہاتھوں امن کے مسائل پیدا ہونے لگے تو ارشاد باری تعالیٰ کی گونج سنائی دی۔ ”تم سے شراب اور جوا کے بارے میں پوچھا جاتا ہے ان کو بتاؤ کہ ان میں بہت زیادہ نقصان اور گناہ ہے اگرچہ فوائد بھی ہیں۔“ (البقرہ ۲۱۹) اس آیت کے اترنے کے بعد لوگوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ شراب اور جوا نقصان دہ ہیں مگر ابھی یہ صرف اطلاع تھی کچھ دنوں بعد جب مسلمانوں کا ایک گروہ محفل ناؤ نوش میں مصروف تھا تو نماز کا وقت ہو گیا۔ ان لوگوں نے اسی حالت میں نماز شروع کر دی لیکن نشے کے غلبے کے باعث ترتیب بگڑ گئی۔ رکوع کی جگہ سجدہ کی جگہ قیام ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے بندوں کی یہ حالت دیکھی تو فوراً حکم فرمایا۔ ”تم لوگ نشے کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جایا کرو۔“ (النساء ۴۳) فرمان خداوندی بہت واضح تھا لہذا کوئی مسلمان سر تابی کا سوچ تک نہیں سلکتا تھا لیکن یہاں ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ مے نوشی کے تمام اوقات میں کوئی نہ کوئی نماز آتی تھی لہذا شرابیوں کے لیے ساغر و مینا سے پرہیز ممکن تھا اور نہ قضا و رکوع و سجود قبول تھی اسی دوران جب ایک دن مسلمانوں کا ایک گروہ مے نوشی میں مصروف تھا۔ حضرت انسؓ ساقی گری کر رہے تھے تو ایک شخص نے آ کر کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے شراب اسلام میں حرام قرار دے دی گئی ہے۔ ہاتھ دین رک گئے۔ پیالے ہونٹوں سے الگ ہو گئے۔ جس کے من میں شراب کا گھونٹ تھا اس نے وہیں اگل دیا اور جس کے معدے سے شراب کی بو اٹھ رہی تھی اس نے فوراً حلق میں انگلی ڈال کرتے کر دی۔ صرف یہی نہیں پورے مدینہ منورہ میں جس گھر میں بھی شراب کا مدکا موجود تھا اہل خانہ نے باہر لا پٹھا پھر اس دن سارے شہر سے شراب کی بو اٹھ رہی تھی لیکن یہ بو زیادہ دیر تک قائم نہ رہی چند ہی لمحوں بعد صبح کی ہوا اسے ساتھ لے اڑی اور باقی رہ گئی ایمان کی خوشبو جس نے ایک عرصے تک گلستان رسالت کو مہکائے رکھا۔

رسول کریم ﷺ کے ایک دوست ثقیف روس میں تھے۔ یوم الفتح پر وہ شراب کا تحفہ لے

کر آئے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم کو علم نہیں اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے تو اس نے فوراً اپنے غلام کے کان میں کہا تم یہ شراب بازار میں جا کر فروخت کر دو۔ نبی کریمؐ کو اس کی سرکشی کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا۔ ”جس نے اس کا پینا حرام کیا اس نے اس کی فروخت بھی حرام قرار دی۔“ لہذا وہ شراب بطحا میں بہا دی گئی۔ (مسلم احمد نسائی)

حضرت ابو طلحہؓ کی پرورش میں ایک یتیم بچہ تھا انہوں نے اس کی وراثت سے فصل کے موقع پر شراب خرید لی تاکہ قیمت بڑھنے پر فروخت کر کے یتیم کو رقم دے دی جائے لیکن اس دوران شراب حرام ہو گئی تو وہ نبی اکرمؐ کے پاس آئے آپؐ نے سارا قصہ سن کر فرمایا۔ ”اسے جلا دو“ حضرت ابو طلحہؓ نے پھر پوچھا۔ ”اس کا سرکہ نہ بنالوں“ تو فرمایا۔ ”نہیں“ (احمد ابو داؤد) ایک اور جگہ نبی اکرمؐ نے یہ فرما کر کہ ہر نشا اور چیز خمر ہے اور ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے تمام تر منشیات کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہوتا ہے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہوتی ہے۔ (ابن ماجہ) حضرت طارق بن سویدؓ نے ایک بار نبی اکرمؐ سے پوچھا ہمارے ملک میں انگور بہت ہوتے ہیں کیا ہم ان کو نچوڑ کر استعمال کر لیں تو آپؐ نے فرمایا۔ ”نہیں“ انہوں نے پھر دریافت کیا ہم اس سے بیماریوں کا علاج کرتے ہیں؟ آپؐ نے کہا یہ وہ انہیں بلکہ بذات خود ایک بیماری ہے۔“ (مختلف مسلم احمد)

مختلف امراض میں منشیات کے استعمال سے مریض کو وقتی فائدہ ضرور ہوتا ہے لیکن بعد ازاں یہی فائدہ مرض کو مزید بگاڑ دیتا ہے مثلاً غموں اور کھانسی کے ہر مریض کو برانڈی پانی جاتی تھی پھر تجربات سے معلوم ہوا برانڈی کی وجہ سے پیچھے والوں میں خون کے سفید ٹپے کم ہو جاتے ہیں نتیجتاً قوت مدافعت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پیچھے والوں میں زخم اور پلوری پیدا ہو جاتی ہے جس سے مریض مرض موت کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح زکام میں برانڈی استعمال کرنے والوں میں دیکھا گیا کہ جو زکام عام حالات میں صرف تین روز میں ٹھیک ہو جاتا تھا وہ ۹ دن تک طویل ہو گیا۔ ایک دور میں دل کے امراض میں وہکی استعمال کرائی جاتی تھی لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس ”علاج“ سے خون کی نالیاں سکڑ جاتی ہیں اور دماغ کو خون کی مظلومہ مقدار نہیں ملتی جس سے فشار خون لاحق ہو جاتا ہے۔ بعض اطباء کھانسی کے دوران پوست کے مرکبات استعمال کراتے ہیں لیکن اس سے کھانسی تو درست ہو جاتی ہے لیکن پیچھے والوں میں ٹخم جم جانے کے باعث سانس کی بندش ہو جاتی ہے۔ عام دردوں کا علاج جس بھی تجویز کیا جاتا ہے لیکن اس علاج سے جسم کے دیگر

مقامات پر بھی دریں شروع ہو جاتی ہیں جس کا واحد علاج یہ جس کے بہت سے سگریٹ ہوتا ہے۔ اس طرح کے پیدورے علاج کے بعد جسم تو زچھوڑ کا شکار ہو جاتا اور معدے میں ایک دائمی سوزش آستوں میں جلن، قبض، بواسیر، جگر کی خرابی، پیٹ میں پانی، خون کی نالیوں کا سکڑاؤ، بلڈ پریشر، دل کا درد، چڑچڑاپن، غصہ، اشتعال، ڈپریشن، فرسٹریشن، بے ہمتی، ناکامی کا گہرا احساس اور مظلومیت طاری ہو جاتی ہے۔ منشیات استعمال کرنے والے لوگ اخلاقی انحطاط کا بھی شکار ہو جاتے ہیں، بصورتِ دھوکا دہنی، چوری، چکاری، بھٹی، قسمیں اٹھانا، گالیاں دینا اور عزیز رشتہ داروں کی تذلیل ان لوگوں کا طریقہ زندگی بن جاتا ہے۔ صاحبو یہ کیسا علاج ہے جس سے خرابی کی پینکڑوں میں ملا تھکتی اٹھتی ہیں۔

اس وقت منشیات دنیا کا سب سے بڑا بزنس ہے امریکہ میں ہر شہری سال میں سو گیلن شراب پیتا ہے دنیا کے ۳۳ ممالک میں بڑے پیمانے پر پوست اور بھنگ کاشت کی جاتی ہے جنوبی امریکہ کے تقریباً تمام ممالک میں تھوہر موجود ہے جہاں سے ایل۔ ایس۔ ڈی سٹوف کشید ہو رہا ہے سٹیکروں، دوا ساز کمپنیاں مسکن ادویات کی شکل میں نشہ آور مرکبات مارکیٹ میں بچ رہی ہیں اور یہ سب مل کر انسانی زندگی میں وہ آلودگی پھیلا رہی ہیں جس سے بچ کر انسان کے بس کی بات نہیں۔ اور یہ حقیقت ہے منشیات اکیسویں صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہو گا ایٹم بم اور ایڈز سے بھی بڑا مسئلہ کیونکہ یہ جسم سے پہلے دماغ پر اثر کرتی ہیں۔ سوچ کا عمل تباہ کرتی ہیں، نیکی اور بدی کا احساس ختم کرتی ہیں، موت سے محبت اور زندگی سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔ اور جب یہ سب کچھ ہو جائے تو انسان کو موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ قتل بھی نہیں، قانون بھی نہیں اور جمہوریت بھی نہیں۔ اور یہ لوگ کتنے بے وقوف ہیں جو اس انسان کو ایٹم بم اور ایڈز سے ڈرا رہے ہیں جو اپنے ہی ابو کی حدت سے پگھل رہا ہے جو پہلے سے ہی موت کا انتخاب کر چکا ہے۔ بے شک زمانے ہی کی قسم انسان خسارے میں ہے۔

• • •

ہم جنوں کی دنیا میں رہتے ہیں

..... اور پھر تخلیق کا مرحلہ آ گیا

تو رب العزت نے آگ جلائی یہ بڑا سالاؤ جس کے شعلوں کی کوئی حد نہ تھی اور جس کی تپش قرب و جوار کی ہر چیز کو پگھلا رہی تھی۔ پھر اذن خداوندی ہوا اور اس آگ کے نور سے ملائکہ تخلیق پا گئے اور اُنہی شعلوں سے جنات بنادیئے گئے۔ سیاہ و صومیس کے مرغوں لے دیو بن گئے اور یوں کائنات پر تخلیق کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ (عجائب القمص)

جنات کا پہلا جن مارح تھا پھر اس کی بیوی مریہ پیدا کی گئی وہ دونوں قریب آئے تو پہلے حمل سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی پھر حمل ٹھہرا تو ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یوں ہر ملاپ سے ایک جوڑا پیدا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد ۷۰ ہزار تک جا پہنچی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر عالمی قانون نافذ کر دیا۔ نر اور مادہ کے جوڑے بنادیئے گئے۔ انہیں عقد کے بندھن میں باندھ دیا گیا اور وہ خاندان گرد ہوں اور قبیلوں میں بننے لگے پھر ایک وقت آیا جب ان کی نسل کا کوئی شمار و قطار نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں رتبوں کے لحاظ سے زمین ہوا اور آسمان پر آباد کیا جو زمین پر آئے وہ بہت جلد شرمیر ہو گئے۔ کفر و شرک کو اپنا شعار بنایا اور قتل و غارت گری کو پیشہ اور جو ہوا میں تھے ان میں سے کچھ شریعت تھے اور کچھ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار جبکہ آسمان پر آباد ہونے والے فوراً ذکر الہی میں ڈوب گئے اور فکر یزداں میں بھیگ گئے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے مقرب ”بندے“ تھے۔ اور انہی میں سے ایک عزرائیل (شیطان) بھی تھا جس نے بنو الجان کی لڑکی سے شادی کی تو اسے اللہ تعالیٰ نے کثرت اولاد سے نوازا۔ اس کے ہزاروں بیٹے اور ہزاروں

جن کون ہیں یہ ہیں بھی یا نہیں اور اگر یہ ہیں تو یہ کہاں رہتے ہیں یہ وہ سوال ہیں جو اکثر ہمارے ذہنوں پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ یہ سوال میرے ذہن میں بھی اٹھتے رہتے تھے۔ میں ان سوالوں کے جواب تلاش کرتے نکلا تو میں حیرت کی ایک ایسی دنیا میں چلا گیا جس نے مجھے مزید الجھا دیا۔ میں اس خواہش کی تمام آنکھیں آپ کے حوالے کر رہا ہوں کہ شاید آپ میں سے کوئی شخص آگے بڑھے۔ اس موضوع پر مزید تحقیق کرے اور ہزاروں لاکھوں برسوں کے ان سلسلے سوالوں کی آگ بجھا دے۔

بیٹیاں تھیں وہ رب العزت کے اس انعام کا حق دار بھی تھا کیونکہ اس کی پلکیں ہر لمحہ عبادت و ریاضت سے بوجھل اور ہونٹ ذکر الہی سے لرزیدہ رہتے تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار برس کی عبادت کے بعد اس کا درجہ بلند کیا اور وہ دوسرے آسمان پر آنکھیں اتار کر اس نے مزید شد و مد سے عبادت شروع کر دی پھر ہزار برس بعد اس کے لئے تیسرے آسمان کے دروازے بھی وا ہو گئے تو اس کی گروں کثرت عبادت سے مزید جھک گئی اور پیشانی جہدوں کی تاریخ بن گئی یوں اس کے درجے بلند ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ اسے ساتویں آسمان پر قرب الہی نصیب ہو گیا (القدس و الخلیل)

ایک روز زمین رب العزت کے حضور شکوہ کناں ہوئی۔ یا باری تعالیٰ یہ تم نے کس مخلوق کو میرے اوپر سوار کر دیا جس نے قتل و غارت گری کو اپنا شعار اور شر انگیزی کو عادت بنا رکھا ہے۔ جس نے میرے سینے میں تباہی و بربادی کا بیج بویا اور جو ہر روز اس بربادی کی فصل کاٹتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عامر بن عبید بن الجان کو بھیج کر قوم جن پر اتارا لیکن ان بد بختوں نے اقرار نبوت کے چند روز بعد ہی انہیں شہید کر دیا پھر حضرت صامق بن ماعق بن مارد بن الجان نبی بن کر اترے وہ بھی چند روز بعد ہی ان "شیطانوں" کی فتنہ پروری کا شکار ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ ہر برس ایک نبی اتارتا اور وہ چند روز بعد اسے قتل کر دیتے۔ یہاں تک کہ ۸ سو برسوں میں ۸ سو انبیاء ان کے ہاتھوں شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کی وعید سنائی۔ قہار نے اپنے قہار ہونے کا ثبوت دیا تو زمین پر جنات کی ایک وسیع آبادی صاف ہو گئی جو چند صالحین بچے انہوں نے غاروں میں چھپ کر جان بچائی پھر ایک صالح شخص کو حاکم مقرر کر دیا گیا اور ۳۶ ہزار برس تک زمین پر امن و امان رہا لیکن جب ان کی تعداد دوبارہ بڑھ گئی تو انہوں نے اپنی پرانی روش اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر عذاب اتارا اور چند صالحین نے غاروں میں چھپ کر جان بچائی اور ان پر بھی ایک صالح شخص کو حاکم مقرر کر دیا گیا پھر ۳۶ ہزار برس تک زمین پر امن رہا لیکن... اور یہ عمل ایک لاکھ ۳۲ برس تک جاری رہا لیکن جنات کی سرشت تبدیل نہ ہوئی آخر کار اللہ تعالیٰ نے "عزائیل" کو فرشتوں کی فوج کے ساتھ زمین پر بھیجا انہوں نے جنات اور دیوؤں کی بڑی تعداد کو قتل کر دیا جو باقی بچے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت قبول کر لی (نصرت کعب احبار) آئمہ کرام اس دور کو حضرت آدم کی پیدائش کا سن قرار دیتے ہیں۔

عزائیل حضرت آدم کو مجروح کرنے کی پاداش میں "ابلیس" بنا تو وہ اپنے ۹ بیٹوں کو

ساتھ لے کر زمین پر اتر آیا۔ "حیوۃ الحیوان" کے مطابق شیطان نے اپنے بیٹے ہفاف کو صحرا میں شر پھیلانے لاقس اور دلہان کو نمازوں کے دوران وسوسے پیدا کرنے، زلیخو کو جھوٹی تعریف اور جھوٹی قسموں کے لئے اکسانے، ہنتر کو ماتم گریبان پھاڑنے اور سینہ کو پی کے لئے تیار کرنے، اینٹ کو انبیاء کے دلوں میں وسوسے ڈالنے، عورتوں کو زنا کاری پر اکسانے، واسم کو گھروں میں فساد ڈالنے اور مٹوس کو افواہ سازی پر لگا دیا۔ شیطان کے زمین پر اترنے کے بعد جنات کو اپنے برادر بزرگ کی رہنمائی مل گئی وہ اس کے گرد جمع ہو گئے اس نے تمام جنات اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیئے یوں زمین پر شر، گمراہی اور سفلی طاقتوں کی تاریخ کا آغاز ہو گیا۔

شیطان نے سب سے پہلے بنی قاتیل کے کچھ لوگوں کو جنات قابو کرنے کا عمل سکھایا۔ انہوں نے چلہ کشی سے اس سرکش مخلوق پر قابو پا لیا۔ حامل اپنے ان جنات کے ذریعے غائب کے احوال جمع کرتے دشمنوں کی کھیتیاں جلاتے، مال مویشی مرواٹے، بستیوں میں ویاہیں پھیلاتے، لوگوں میں نفسانی خواہشات ابھارتے، گروہوں اور خاندانوں میں غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں لڑاتے اور انبیاء کے خلاف عوامی رائے ابھارتے۔ یہ حامل اپنی ان "طاقتوں" کے ذریعے اس وقت کے معاشرے میں بڑے ممتاز تھے لہذا وہ مرنے سے قبل اپنے جنات اپنی آل اولاد میں تقسیم کر جاتے یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفلی علوم کے ماہرین کی ایک جماعت الگ ہوتی چلی گئی اور یہی لوگ بعد ازاں کاہن کہلائے۔

حضرت سلیمان تک انسانی تاریخ جنات، دیو، بھوت اور چڑیلوں کی شر انگیزیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ لوگ بارہک ٹوک انسانی بستیوں میں داخل ہوتے اور تباہی و بربادی پھیلا کر چلے جاتے۔ تیار کھیتیاں اجاڑ دیتے، مال مویشی مار دیتے، گھر کا ساز و سامان توڑ پھوڑ دیتے، خوبصورت خواتین اور مردوں پر اپنا "سایا" ڈال کر انہیں اپنا غلام بنا لیتے لیکن حضرت سلیمان کی آمد کے فوراً بعد ان کی کارروائیوں میں کمی آ گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو صرف انسانوں پر نبی نہیں بنایا تھا بلکہ جنات سمیت تمام مخلوقات پر حکمران بنا کر بھیجا تھا اور انہوں نے آتے ہی جنات، دیو، پری اور دوسری مخفی مخلوقات کے لئے حدود قیود طے کر دیں جن کی خلاف ورزی پر ان کو کڑی سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان سزاؤں میں سزائے موت، عمر قید، انسانی بستیوں سے ہمیشہ کے لئے جلا وطنی اور جسمانی اذیت بھی شامل تھیں۔ اگر تمام آسمانی کتب اور صحائف ربانی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان ہی انسانی تاریخ کے پہلے

انسان تھے جو پہلی مرتبہ ان مخفی طاقتوں کو انسان کے زیر اطاعت لائے جبکہ ان سے قبل جن دیو اور چڑیلوں انسانی ہستیوں کے لئے ہوا ہوتی تھیں۔ حضرت سلیمان موقع بہ موقع انسانی طاقتوں کا مظاہرہ کر کے جنات کا اعتماد توڑتے اور انہیں ان کی حیثیت کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں ملکہ بلقیس کا واقعہ بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ سورۃ النمل کے مطابق جب حضرت سلیمان نے سبا کی ملکہ بلقیس کا تخت منگوانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ کے دربار میں بیٹھے دیو/جن ”راکس“ نے کہا میں دربار پر حاکم ہونے سے قبل آپ کے حضور پیش کر سکتا ہوں لیکن حضرت سلیمان کے زیر آصف بن برخیا جو انسان (بعض مفسرین انہیں آپ کا چچا زاد بھائی قرار دیتے ہیں) اور اسم اعظم کے ماہر تھے، نے اپنی روحانی طاقت سے پلک جھپکنے سے قبل تحت حاضر کر دیا۔ جنات پر حضرت سلیمان کے وہ بے کاہ عالم ہے کہ آج بھی اگر کسی ویران جگہ پر کوئی مخفی مخلوق کسی شخص کو گھیرے اور دو حضرت سلیمان کو آواز دے تو وہ بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

کاہنیت کو باقاعدہ پیٹھے کی شکل مصریوں نے دی۔ دریائے نیل کی وادیوں میں انسانی ہنگاموں سے دور ویرانوں میں کاہنوں کے معبد ہوتے تھے جہاں دور دور سے غرض مند آتے اور کاہن اپنے جنات سے ان کا احوال سن کر بیان کر دیتے اور خوب جی بھر کر سونا چاندی لوٹتے۔ یہ کاہن زرخیز کے عوض اپنے زائرین کے تمام جائز و ناجائز کام بھی کرتے تھے جن میں دشمن کی نسل کشی مالی بریادی اور قتل تک شامل ہوتا تھا۔ مصری معاشرے میں کاہنوں کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ مصری خاندان اپنے کاہنوں سے پہچانے جاتے تھے۔ جس کا کاہن مضبوط با اصول اور زیادہ روحانی اثر و رسوخ والا ہوتا اس کی معاشرے میں بڑی توقیر ہوتی لوگ اپنی امارت ظاہر کرنے کے لئے ایک سے زائد کاہنوں سے بھی ربط جوڑتے تھے جبکہ بعض کتب میں آیا ہے کہ قدیم مصر کے شاہی خاندان کے بعض افراد کے پاس پانچ پانچ سو کاہن تھے۔ اس دور میں اگر کوئی کاہن مرجاتا تو اس سے وابستہ تمام خاندانوں میں صاف ماتم بچھ جاتی کیونکہ انہیں یقین ہوتا کہ جوں ہی اس واقعہ کی خبر ان کے دشمن کو ہوگی اس کا کاہن ان پر حملہ کر دے گا لہذا کسی کاہن کی بیماری یا بوجھاپے کی صورت میں اس کے ”گاہک“ احتیاطاً دوسرے کاہن کا بندوبست کر لیتے تاکہ اس کاہن کی موت کی صورت میں دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لے۔ رہی کاہنوں کی بات تو جس کاہن کے پاس زیادہ جنات، دیو، بدروحیں اور چڑیلیں ہوتیں وہ اعلیٰ اور بلند مرتبہ کاہن سمجھا جاتا خود فرعون بھی اپنے درباری کاہنوں کے سامنے اس قدر راچار تھا کہ ان کی اجازت کے

بغیر کوئی فرمان جاری نہیں کرتا تھا۔

اہل یونان اور بائبل کے کاہنوں نے جنات قابو کرنے کا طریقہ مصریوں سے سیکھا اور اس میں علم نجوم، قیافہ اور دست شناسی شامل کر کے اسے دو آتشہ بنا دیا۔ اہل بائبل جنات کی تسخیر کا اقرار نہیں کرتے کیونکہ وہاں اسے برا سمجھا جاتا تھا لہذا وہ جنات کے ذریعے حاصل ہونے والی تمام تر معلومات کو علم نجوم اور دست شناسی کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ ان کے جنات اس قدر طاقتور تھے کہ وہ لوگوں کا مقدر تک پڑھ لیتے تھے اور کاہن زمین پر چند آدمی ترچھی لکیریں کھینچ کر تمام کچا چٹھیا بیان کر دیتے۔ ان کی اسی دسترس کے باعث اہل بائبل پر عذاب اترا اور ان کی چھتیں بنیادوں پر الٹا دی گئیں۔

عربی میں ہر نظر نہ آنے والی چیز کو جن کہا جاتا ہے اسی لئے نظر نہ آنے کی خصوصیت کے باعث بہشت کو ”جنت“ کا نام دیا گیا۔ اہل عرب نے تسخیر جنات کا قاعدہ دجلہ و فرات کے کاہنوں سے سیکھا اور شروع شروع میں یہ بھی ان سے وہی کام لیتے تھے جو دیگر اقوام کے کاہن لیتے لیکن جنات کی ماورائی طاقت سے متاثر ہو کر چند نسلوں کے بعد لوگوں نے ان کی باقاعدہ پرستش شروع کر دی۔ مقاتل کہتے ہیں عرب میں جنوں کی پرستش کا آغاز اہل یمن نے کیا جہاں ابتدا لوگوں نے سفر کے دوران یا واز بلند جنات کی پناہ لینا شروع کر دی وہاں سے یہ عادت قبیلہ بنی حنیفہ تک پہنچی جس کے ایک گروہ نے اسے معمول بنالیا اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد پورے عرب میں جنوں کے نام کی نذر چڑھانے اور نیاز دینے کا رواج پکڑا گیا۔ نبی اکرم کی تشریف آوری سے قبل تو یہ صورت حال تھی کہ عرب میں دوران سفر جب کوئی خوفناک مقام آتا، اندھی ملعون یا بارش گھیر لیتی تو اہل قافلہ یا واز بلند کہتے ”ہم اس علاقے کے جنات کے سردار کی پناہ مانگتے ہیں وہ آئے اور اپنے ماتحت جنوں سے ہمیں بچائے۔“ عرب کے تمام لوگ نظر بد سے حفاظت اور جائز و ناجائز کاموں کی بجا آوری کے لئے جنات کے چڑھاوے چڑھاتے اور فتیں مانگتے۔ علامہ نسفی کا کہنا ہے عرب جب نیامکان بناتے، زمین خریدتے یا ان کے ہاتھ کوئی خزانہ آگاتا تو وہ جنات کو خوش کرنے کے لئے جانوروں کی قربانی دیتے تھے عربوں کی ان حرکات کے باعث۔۔۔ جنات اس قدر متکبر ہو گئے کہ وہ خود کو انسانوں کا بھی سردار سمجھتے گئے اور ان سے وہی سلوک کرنے لگے جو حقیر مخلوقات سے کیا جاتا ہے۔

نبی اکرم کی بعثت سے قبل کاہنوں کے حکم پر جنات آسمانوں تک چلے جاتے تھے جہاں

وہ فرشتوں کی گفتگو سن کر ان میں اپنی طرف سے مبالغہ شامل کرتے اور آ کر اپنے آقاؤں کو بتا دیتے اور کہا کہ ان معلومات کی بناء پر پیش گوئی کر دیتے جن میں سے کچھ سچ ثابت ہوتیں اور کچھ غلط لیکن جب نبی اکرمؐ پر پہلی وحی اتری تو آسمان کے گرد آگ کا ایک حصار کھینچ دیا گیا جسے عبور کرنا جنات کے بس کی بات نہیں تھی اس روز جو بھی جن آسمان کی طرف بڑھا اسے چنگاریوں نے آگھیرا اور وہ زخمی ہو کر واپس زمین پر آگرا۔ اس حادثے نے جنات کی سلطنت میں کھلبلی مچا دی۔ وہ سب بزرگ ابلیس کی طرف بھاگے تو اس نے کہا ہونہ ہو ضرور زمین پر کوئی بڑا واقعہ پیش آیا ہے تم پوری دنیا میں پھیل جاؤ اور اس کا کھوج لگاؤ (عبداللہ بن عباس، مسند احمد) جنات حکم کے مطابق پوری زمین پر پھیل گئے لیکن بڑے عرصے تک انہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ اسی دوران جب نبی اکرمؐ اہل طائف کو دعوت اسلام دینے کے لئے نکلے تو راستے میں "بلن خلد" کے مقام پر رات بسر کی۔ صبح نماز فجر کے بعد آپ تلاوت قرآن مجید فرما رہے تھے تو وہاں سے جنات کے قبیلے نصیبین کے سات جنوں کا گزر ہوا۔ آنحضرتؐ ان جنوں کا نام جساد، مہبا، شامرہ، ابن لاریب، امین، انھضم اور آئے لکھتے ہیں۔ ان جنات نے نبی اکرمؐ کو دیکھا تو فوراً ایمان لے آئے۔ (قرآن مجید کی سورۃ احقاف اور سورۃ جن میں اس واقعے کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے) ان جنوں نے اپنے قبیلے میں واپس جا کر نبی اکرمؐ کا تذکرہ کیا اور دوسروں کو بھی ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس واقعے کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ایک بار مکہ مکرمہ کے اندر درجن میں اور دو مرتبہ مدینہ کے میدان بقیع وغیرہ میں (حضرت عبداللہ بن مسعود بھی آپ کے ہمراہ تھے) نبی اکرمؐ نے جنات کو درس و تدریس سے قبل حصار کھینچ کر انہیں اس میں بٹھا دیا دوسری صبح حضرت عبداللہ بن مسعود نے میدان میں ۱۰ لے اونٹوں کے بیٹھنے کے نشان دیکھے۔ ایک بار نبی اکرمؐ اچانک مفقود ہو گئے تو صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے لیکن دوسری صبح آپ کو غار حرا کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا گیا، ایک بار مکہ کے اونچے علاقے میں جنات سے ملاقات ہوئی۔ ایک بار مدینہ کے باہر (حضرت زبیرؓ آپ کے ساتھ تھے) اور آخری بار ایک سفر کے دوران جب حضرت بلالؓ بن عمارؓ آپ کے ہمراہ تھے۔

بعثت رسولؐ کے بعد جنات کی دنیا میں تین بڑی تبدیلیاں آئیں۔ ایک ان کی مستقبل بیان کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی اور وہ گزرے ہوئے کل اور حال کی باتیں بیان کرنے تک محدود ہو گئے۔ دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی کہ ان میں مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جو نہ صرف

دوسرے جنات کو نیکی کی تلقین کرتی تھی بلکہ صالح مسلمان انسانوں کو ان کے شر سے بھی محفوظ رکھتی اور تیسری تبدیلی خدا پر کامل یقین رکھنے اور نبی اکرمؐ کے عشق کی شمع اپنے سینے میں جلائے رکھنے والے تمام مسلمان ان سفلی طاقتوں کے شر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔ اور اب کسی بھی شخص پر کوئی سفلی، غیر مرمی یا ناری مخلوق حملہ کرنے تو وہ کسی عامل کی مدد کے بغیر آیت الکرسی، چاروں قل، سورۃ جن یا سورۃ نمل کی تلاوت شروع کر دے تو وہ فوراً اس سایہ بد سے محفوظ ہو جاتا ہے لیکن اگر ایمان ہی کمزور ہو تو۔۔ تو شاید کلام حق ساتھ نہیں دیتا۔

جناب مجید الحسن جنات کے موکلات اور روحانیت کے ماہر ہیں وہ اپنے عملی تجربے اور روحانی مشاہدے کی بنیاد پر جنات کے بارے میں کہتے ہیں۔

غیر مرمی مخلوق کی چھ اقسام ہیں فرشتے، جنات، دیو، پری، چڑیل اور بھتے فرشتے نوری مخلوق ہیں لہذا وہ تودار و بخت سے بے باہر ہیں رسی۔ ناری مخلوق تو یہ قبیلوں کی شکل میں رہتی ہے۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار اور بادشاہ ہوتا ہے ان کا کوئی سنٹرل نظام تو نہیں لیکن ان کی اپنی بیوروکریسی ضرور ہے۔ ان کے بھی دفتر ہیں۔ سیکرٹریٹ عداوتیں اور جیلیں ہیں۔ ان کے بھی سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں ان میں بھی ہندو، عیسائی، یہودی اور کیونست ہیں۔ ان میں بھی غمخوار، بد معاش، نیک اور بد ہیں۔ ان میں بھی طاقتور کمزور پر ظلم کرتا ہے مثلاً میرے پاس ایک جن تھا وہ ذرا بڑھ برس غائب رہا میں نے بہت تلاش کرایا لیکن نہ ملا۔ ایک دن میں نے مراقبہ کیا تو دیکھا اسے ایک چڑیل نے غار میں قید کر رکھا ہے۔

یہ لوگ آجائے، بیابان، کلم آباد اور سرسبز و شاداب علاقوں میں رہتے ہیں آپ نے اکثر ویرانوں میں دیکھا ہو گا کہ ایک جگہ بہت صاف ستھری ہے جیسے ابھی ابھی جھاڑو دیا گیا ہے اور یہاں گھاس کا ایک تنکا تک نہیں یہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ اس حد میں داخل ہونے پر شباب کرنے یا تھوکنے والا پوری زندگی ان کے مذاہب کا نشانہ بن رہا ہے۔ یہ پھولوں کے تیز خوشبودار پودوں اور پکے پھلوں کے درختوں پر بھی ہوتے ہیں لہذا بھری دوپہر اور اندھیری راتوں میں ان درختوں کے قریب جانے والے ان کے دامن میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کے ٹھکانے کی ایک بڑی نشانی خوف ہے۔ آپ کو کسی جگہ پر اچانک خوف آگھیرے اور اس جگہ سے بننے کے بعد وہ خوف بتدریج کم ہو جائے تو سمجھ لیں وہ جنات کی جگہ تھی۔

اسلام آباد جنات کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں ہر گھر میں جن رہتے ہیں۔ یہاں جنوں کی دو

ہستیاں ہیں۔ ایک بری امام کی طرف وہاں نیک اور مسلم جن رہتے ہیں دوسری سر یا چوک کی طرف جاتے ہیں تو قبرستان کے قریب یہاں بری چیزیں رہتی ہیں جو رات بارہ بجے کے بعد کتوں، بلیوں، سوروں اور پرندوں کی شکل میں باہر نکل آتی ہیں۔

تمام تر وہاں چڑیلیں پھیلاتی ہیں۔ ان میں "املا صلیب" نامی چڑیل دوران حمل بچوں کو معذور بناتی ہے اور باقی عام زندگی میں ان گندی چڑیلوں کے جسم سے بدبو اٹھتی اور وائرس نکلتے ہیں جو فضا میں داخل ہو کر لوگوں کو مریض بناتے ہیں۔ ایک بار میری بیٹی کو خارش ہو گئی میں نے بہت علاج کرایا لیکن بے سود مجبوراً میں نے ٹیبلٹ کیا تو میرے سامنے چڑیل آگئی اس کا پورا جسم گلا ہوا تھا اور اس سے سر اُٹھ آتی تھی۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگی "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے" میں نے اپنی طاقتوں کو حاضر کیا تو انہوں نے بتایا کہ تم واقعی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ یہ امر ربی سے شہر میں آئی ہے۔ بہر حال میں نے دیکھا وہ جس علاقے سے گزرتی وائرس پھیلاتی چلی جاتی اور اس علاقے کے تمام لوگ خارش کے مریض ہوتے چلے جاتے۔ وہ چھ ماہ تک یہاں رہی کائنات میں ایسی چڑیلیں بھی ہیں جن کے جسم سے ریچھ جیسی بو اُٹھتی ہے یہ جہاں سے گزرتی ہیں وہاں سانس کی بیماریاں پھیلاتی جاتی ہیں۔

ہر پانچ برس بعد قدرت ایک مخصوص مخلوق کو چند گھنٹوں کے لئے آزاد کرتی ہے تو یہ چنگھاڑتے ہوئے شہروں کی طرف بھاگتے ہیں جس کے بعد بڑی تیز آمدھی آتی ہے درخت جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں پول الٹ جاتے ہیں اور زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس مخلوق کی واحد نشانی تیز سیٹی کی آواز ہے جو آمدھی کے ساتھ ساتھ پورے شہر میں سنائی دیتی ہے۔ اس سیٹی اور آمدھی میں ایک خوف ہوتا ہے جسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس مخلوق کو اکثر دیکھا۔ یہ ہوا میں بازو چلاتے ہوئے آتی ہے اور تباہی پھیلا کر واپس چلی جاتی ہے اب پتہ نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے۔

جنات کی شکلیں بالکل انسانوں کی طرح ہوتی ہیں یہ عام آدمی کو نظر نہیں آتے لیکن یہ جب چاہیں کسی بھی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ہم پہچان نہیں سکتے اس ضمن میں نبی اکرمؐ کا فرمان ہے۔ جنات تین حالتوں میں رہتے ہیں: حشرات الارض کی شکل میں، ہوا میں ہوا کی طرح اور زمین پر بنی نوع انسان کی شکل میں۔ ان کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں میرے پاس ایک جن آیا اس کی عمر پندرہ سو سال سے زائد تھی اور اسے نبی اکرمؐ کی زیارت کا شرف حاصل تھا ان کی

تعداد انسانوں سے زیادہ ہے اور یہ دنیا کے تمام قطعوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی عادات اور معیار بھی انسانوں جیسے ہوتے ہیں۔ شہروں کے جن پڑھے لکھے اور کھداری ہوتے ہیں۔ جنگ و بیہات صحرا اور دیوانوں کے ان پڑھ گنوار میرے پاس جڑنی سے ایک جن آیا بڑا دانشور اور سائنسی عہد کا ماہر جن تھا مجھے اس سے گفتگو کرتے وقت بڑی وقت ہوئی۔

ان کی خوراک انسانوں جیسی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی الگ کاشکاری باغبانی اور کھیل فارمنگ کرتے ہیں۔ بعض شہر جن انسانوں کی چیزیں بھی چھوڑ کر کھا جاتے ہیں لیکن ان کے معاشرے میں اس حرکت کو بہت برا تصور کیا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو عامل جن قابو کرتا ہے اس جن کے ہاں نفقے کی ذمہ داری اس کے کندھے پر آ پڑتی ہے اور وہ مسائل سے حاصل ہونے والی رقم سے جن کو بھی کمیٹن دیتا ہے یہ جنات انسانی شکل میں بازاروں سے خریداری بھی کرتے ہیں۔

ہر جن کا ایک کوڈ اور ہوتا ہے۔ یہ ایک لفظ بھی ہو سکتا ہے اور الفاظ کا مجموعہ بھی عامل جن قابو کرنے کے لئے مخصوص وقت مخصوص جگہ پر یہ مخصوص کوڈ اور مخصوص تعداد میں دہراتا ہے۔ ایک تو اتر سے یہ عمل کرنے سے جن عامل کے قبضے میں آ جاتا ہے تاہم اس دوران اس عامل کی جان کو بہت خطرہ ہوتا ہے۔ اگر اس کے پیچھے اس کا استاد نہ ہو تو معمولی سی غلطی سے وہ جان سے جاتا ہے یہ پائل ہو جاتا ہے مثلاً ایک جننی "توت ہوتی" ہے جب بھی کوئی اسے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کے سامنے بندے تیل میں بھون کر کھانا شروع کر دیتی ہے اس دوران اگر عامل ڈر جائے تو یہ اسے فوراً مار دیتی ہے۔

جنوں کے پاس ریڈیائی طاقت ہوتی ہے۔ یہ سارے کام اسی سے لیتے ہیں۔ بہت تیز پرواز کرتے ہیں اور چند ہی سیکنڈ میں مطلوبہ معلومات لے آتے ہیں میرے پاس ایک دیو "کرتاس" ہے وہ چند سیکنڈ میں جہلم سے ایک بدعاش جن کو پکڑ کر میرے پاس لے آیا۔ یہ ریڈیائی لہروں سے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ طاقتور جن کمزور جن کو جلا کر جسم کر دیتا ہے اسی طاقت سے انسانوں کے دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعے بیماریاں پھیلاتے ہیں یہ علم غائب بالکل نہیں جانتے صرف حال اور گزرے کل کا احوال بیان کر سکتے ہیں۔

عامل ابتداً انہیں آنکھیں بند کر کے دماغ کی سکریں پر دیکھتے ہیں لیکن جوں جوں ان کا مشاہدہ اور علم بڑھتا جاتا ہے تو انہیں وہ کھلی آنکھوں سے بھی انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ تین قسم کے

لوگوں کو تنگ کرتے ہیں ایک وہ جنہوں نے دانش یا نادانستان کی "پرائیویسی" خراب کی تو دوسرے کمزور ایمان اور کمزور نفسیات کے لوگ اور تیسرے وہ خوبصورت مرد و زن جن پر ان کا دل آجاتے لیونگ جنات۔ ایک وقت مادی اور غیر مادی خصوصیات کے باعث جس جمال بھی رکھتے ہیں لہذا وہ پوری طرح ان جذبات سے ماری نہیں جو انسانوں کا خاصا ہیں۔

• • •

خان لیاقت علی خان

”بیگم رونا لیاقت علی خان ان دنوں روم میں پاکستان کی سفیر تھی، حکومت نے خان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ان کے خاندان کے لیے پانچ ہزار روپے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ یہ رقم اخراجات کے لیے بہت کم تھی لہذا ان کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے بیگم صاحبہ کو روم میں سفیر لگا دیا۔ بیگم صاحبہ کو پینے کی عادت تھی۔ میں اس وقت روم کے پاکستانی سفارتخانے میں تحریر ڈیکریٹری تھا، میں فارن سروس کا ایک جونیئر آفیسر تھا۔ بیگم صاحبہ کے جگر پر درم آچکا تھا، لہذا ڈاکٹروں نے انہیں ”مشروبات مغرب“ سے پرہیز کا پابند بنا دیا تھا۔ ان دنوں ان کی شامیں بڑی اداں ہوتی تھیں۔ لوگوں سے میل ملاقات بند ہو چکی تھی۔ سفارتی تقریبات میں بھی ہم سے کوئی شخص ان کی بیماری کا بہانہ کر کے نہ آتا تھا، آفس کے امور میں بھی وہ کم ہی دلچسپی لیتی تھیں۔ ہاں البتہ وہ ہر شام اپنے گھر کی بالکونی میں ”میز“ بٹھا کر بیٹھ جاتیں اور ”آنکھوں میں تو دم ہے“ کی تصویر بن کر پانی میں چھپی آگ کو حسرت سے دیکھتی رہتیں۔ ایک روز میں نہایت ہی اہم فائل پر ان کے دستخط لینے کے لئے بالکونی میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور سری منگوا کر مجھے سامنے بٹھا لیا۔ فائل کے مطالعے کے بعد انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”مسز ڈکی، جو شخص تو جوانی میں خوشی کے گھونٹ نہیں بھرتا وہ باقی زندگی دکھوں کا پیالہ منہ سے لگا لے بیٹھا رہتا ہے۔ تمہارے سامنے دنیا کے بہترین مشروبات پڑے ہیں انجوائے یور سیلف“ لیکن میں نے بڑی شائستگی سے انکار کر دیا ”تو آپ نہیں پیتے؟“ کوہ مسکرا کر بولیں ”ہی میں پیتا ہوں لیکن کام کے دوران نہیں۔“ میں نے پھر شائستگی سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں آج سے یہ بھی تمہاری آفیشل ذیوتی میں شامل ہے۔“ اب میرے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پھر یہ معمول بن گیا اور میں اور میرا ایک دوسرا استاذ تیار ساتھی ہر شام یہ ”ذیوتی“ سرانجام دینے بالکونی میں آتے اور ”خوشیوں“ کے گھونٹ بھرتے رہتے

خان لیاقت علی خان کا قتل ہماری تاریخ کا وہ راز ہے جو آج تک نہیں کھل سکا۔ دنیا یہ کہتی ہے جو قوم ۵۵ برسوں میں اپنے پہلے وزیراعظم کے مجرموں کا فیصلہ نہیں کر سکی وہ آئندہ کون سے ستاروں پر کندہ لے گی۔ اس مضمون میں اس قتل کی چند گریں نکلتی ہیں۔ اس مضمون کی بنیاد ہماری وزارت خارجہ کے ایک ریٹائرڈ سیکرٹری ہیں۔ یہ صاحب روم میں بیگم رونا لیاقت علی خان کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ اپنی معلومات شیئر کرتی رہیں۔ انہوں نے آگے چل کر یہ معلومات میرے ساتھ شیئر کیں اور یوں یہ مضمون بن گیا۔

اور وہ ہمیں سرت سے دیکھتی رہیں۔ جب ان کے تئیں ہماری آنکھوں اور کانوں کا ہمارے شعور سے رشتہ کٹ رہا تھا تو وہ بولنے لگیں۔ اپنی ابتدائی زندگی کی باتیں، خان رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب رستم علی خان کے دوسرے ہانکے چیلے بیٹے اور اپنے شاندار خاوند کی باتیں، پھر محلاتی سازشوں اور سیاستدانوں کی بے رحمی کے قصے اور جب رات بالکلونی میں اترنے لگتی تو وہ اپنے خاوند کے قاتلوں کا ذکر لے بیٹھتی۔ اس دوران ان کی آنکھیں ہمارے چہرے ٹوٹتی رہتی تھیں۔ مجھے یقین ہے اگر کسی لمحے انہیں ذرا سا بھی شک نہ رہتا کہ ان دو مدبوسوں میں سے ایک نہ صرف پوری طرح سواں میں ہے بلکہ ان کی ایک ایک بات اپنے حلقے کے روزنامے میں درج کر دیا ہے تو یہ راز ان کے سینے میں ہی دفن رہ جاتا وہ کچھ نہ کہتیں، وہ کبھی نہ بولتیں۔

آنکھیں رنگت کے بوڑھے سفارٹکار نے ہاتھ کا پینچا چہرے سے ہٹا کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ وہ خاموش کو اپنے خاوند کا قاتل سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا سکندر مرزا، مشتاق گورمانی اور ایوب خان بھی اس سازش میں برابر کے شریک تھے۔ "وہ اکثر بتاتے ہیں ۱۹۵۰ء کے آخر میں سیکرٹری دفاع سکندر مرزا اپنی اہلیہ کے ساتھ جیل ایوب خان کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس آئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ موسم سرما کے آغا کی ایک شام تھی۔ خان صاحب ان دونوں کے ہمراہ سفی میں چلے گئے۔ جہاں وہ دو گھنٹے تک پتہ نہیں کیا باتیں کرتے رہے لیکن جب وہ لوگ واپس چلے گئے تو میں نے اپنے میاں کو بڑا مضطرب پایا۔ وہ رات گئے تک قہوہ پیتے رہے اور ڈرائنگ روم میں ٹہکتے رہے۔ ان کی پریشانی دیکھ کر میرا دل خوف سے لرزتا رہا لیکن میرے اندر خان صاحب سے سوال کا حوصلہ نہیں تھا کیونکہ اس قسم کی کیفیت میں وہ مزید گہرے ہو جاتے تھے۔ صبح فجر کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے چونک کر آگے پیچھے دیکھا تو مجھے صوفے پر پریشان پایا۔ وہ مسکرائے اور مجھے مخاطب کر کے بولے "رہنما تم ابھی تک جاگ رہی ہو" میں اپنی نشست سے اٹھی اور ان کے قریب جا کر بولی۔ "جب ملک کا وزیراعظم اتنا پریشان ہو کہ اسے رات دن تک کا احساس نہ ہو تو رعایا کیسے سونے لگی؟" انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا نہیں زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ فوج کے کچھ لوگ ہماری فائرل پالیسی سے مطمئن نہیں ہیں، وہ چاہتے ہیں ہم روس کو دوست بنالیں، یہ لوگ ہمارے مسائل نہیں سمجھتے، بہر حال سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ذرا وضو کر آؤں۔ میں اگلے چند روز بہت مصروف رہی۔ لہذا اس بے چین رات کو بھول گئی لیکن جب جنوری ۵۱ء میں ایوب خان کو اچانک پاک آرمی کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تو بے اختیار مجھے وہ بے چین

رات یاد آگئی جب سکندر مرزا اور ایوب خان لیاقت علی خان سے رخصت ہوتے وقت سینے پر ہاتھ باندھ کر رکوع کی حالت میں جھکے تھے اور ان کے جانے کے بعد وزیراعظم نے ٹہل کر ساری رات گزار دی تھی۔ مجھے یقین تھا ایوب خان کی تقرری اور اس رات کا آپس میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ رات جب لیاقت علی خان دفتر سے واپس آئے تو میں نے ان کی شیروانی اترواتے وقت اپنے شک کا اظہار کیا وہ مسکرائے اور کہا۔ "میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا" اور ساتھ ہی وہ وضو کے لئے چلے گئے۔ ابھی انہوں نے عشاء کی نماز پڑھنا تھی۔ پھر میں نے ان سے اس سلسلے میں بھی بات نہیں کی کیونکہ مجھے پتہ تھا اب وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔

ٹھیک تین ماہ بعد ہمارے "نئے آرمی چیف" نے جنرل اکبر سمیت دوسرے ایسے فوجی اور سول لوگ وزیراعظم کو پیش کر دیے جو ملک میں اشتراکی فوجی حکومت لانے کے لئے تختہ اُلٹنے کی سازش کر رہے تھے۔ سکندر مرزا نے "مجرموں" کی فائل وزیراعظم کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے بچے ہمارا انتخاب غلط ثابت نہیں ہوا" خان صاحب نے فائل پلڑتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں بے اختیار مسکرائی۔ خان صاحب نے لٹی میں گردن ہلاتی اور سکندر مرزا کو ساتھ لے کر سفی میں چلے گئے۔ چند روز بعد ان "مجرموں" کے خلاف پٹری سازش کیس کے تحت مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ فوج نے خصوصی تربیت یافتہ پولیس کے کمرہ قاعدہ سماعت شروع کر دی۔ "پٹری سازش کیس" افشا ہونے کے بعد حالات بظاہر ٹھیک ہو گئے لیکن اس کے باوجود مجھے ایوان اقتدار میں سازش کی محسوس ہو رہی تھی۔ عوام میں مسلم لیگ کا وقار ختم ہوتا جا رہا تھا۔ بعض وزراء لیاقت علی خان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ کچھ مفاد پرست جاگیردار بھی حکومت کا دھڑ بن چکے تھے۔ دوسرا میں نے لیاقت علی خان کی ذات میں بھی بعض تبدیلیاں محسوس کیں۔ وہ رات دیر تک جاگتے رہتے، قہوہ پیتے رہتے، بعض اوقات پوری پوری رات نوافل پڑھتے رہتے۔ انہی دنوں سی آئی ڈی کا چیف بھی کثرت سے وزیراعظم ہاؤس آتا رہتا۔ ان تبدیلیوں سے میرا دل بہت گھبراہٹا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی طوفان میرے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کوئی بھونچال بنیادوں کے نیچے پروان چڑھ رہا ہے، لیکن میں سوائے دعا کے کچھ نہیں کر سکتی تھی، سو وہ میں کرتی رہتی۔

۱۹۵۱ء میں گرمیوں کی ایک شام کو لیاقت علی خان جب دفتر سے واپس لوٹے تو بڑے تھکے تھکے سے تھے۔ انہوں نے آتے ہی وضو کیا اور نماز عصر ادا کر کے لان میں میرے پاس آ کر

بیٹھ گئے۔ میں نے چائے کا کپ تیار کر کے انہیں پیش کیا وہ خاموشی سے چائے پینے لگے۔ اس شام کراچی میں کچھ زیادہ ہی جھس تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مانی کیاریوں میں پانی لگا کر گیا تھا لہذا فضا میں جھس کے ساتھ ساتھ گیلی مٹی کی مہک بھی اڑ رہی تھی۔ میں نے خان صاحب کو مخاطب کر کے کہا ”مٹی کی خوشبو کتنی اچھی ہوتی ہے۔“

”ہوں۔“ انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور چند لمحوں تک استغراق میں رہنے کے بعد بولے۔ ”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو“ مسرڈ کی تم یقین کرو مجھے ان سے اس قدر ٹھنڈے جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اس کے باوجود مجھے غصہ نہیں آیا کیونکہ مجھے احساس تھا اس وقت میرے خاوند شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ وہ ذہنی خلجان کی حالت میں ہمیشہ خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ غصہ انہیں بھرنا دیتا تھا۔ وہ پھٹے نہیں تھے، بولتے نہیں تھے، اس لمحے ان کا ایک ہی ملان ہوتا تھا۔ تھائی، خاموشی اور طویل وقفہ اور میں نے ایک اچھے معالج کی طرح برتن سینے اور دہن کو بلانے کی بجائے خود ہی اٹھا کر اندر جانے کا فیصلہ کیا لیکن میں جوں ہی کرسی سے اٹھی، انہوں نے مجھے روک لیا۔

”تم میرے پاس بیٹھو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں“ میرے خاوند کے لہجے میں کوئی بات تھی جس سے ایک کچی سی میری ریزہ کی ہڈی سے گزر گئی، میں بیٹھ گئی تو وہ بڑے طویل وقفے تک خالی کپ ہاتھ میں پکڑے مجھے دیکھتے رہے۔ اسی دوران وزیراعظم ہاؤس کی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دی تو وہ چونک پڑے اور مجھے مخاطب کر کے بولے۔ ”کچھ لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔“ مسرڈ کی آپ یقین کرو ان کے یہ الفاظ ہم کی طرح مجھ پر گرنے اور میں چیخ کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے آگے پیچھے دیکھا اور مجھے اطمینان سے بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔ میں کرسی پر ٹک تو گئی لیکن اپنا آپ سنبھالنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں جب ساڑھی کے پلو سے چہرے کا پینہ پوچھ رہی تھی تو مجھے نہیں پتہ تھا اس میں میرے کتنے آنسو شامل تھے۔ یہ میری ازدواجی زندگی کا پہلا واقعہ تھا، جب خان لیاقت علی خان نے مجھ سے کھل کر بات کی تھی۔ ان کے خلاف کون کیا سازش کر رہا ہے؟ کون قاتلوں سے بات چیت کر رہا ہے؟ سازشیوں کے ساتھ کون کون شریک ہے؟ وہ بر بات کے بعد غلام محمد اور گورمانی کا ذکر کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے مجھے بتایا انہوں نے آج کاہنہ کے اجلاس میں غلام محمد اور گورمانی کو بڑی جھاڑ پلائی جبکہ انہوں نے (غلام محمد اور گورمانی) نے مجھ سے صفائی کے لئے کچھ مہلت طلب کی ہے جو میں نے دے دی ہے لیکن میں انہیں جلد ہی

فارغ کردوں گا۔ ساتھ ہی وہ نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن میں اسی ان میں بیٹھی رات کے بطن میں اترتی شام کو دیکھتی رہی۔

ستمبر ۵۱ء میں جب لیاقت علی خان نے ملک بھر میں طوفانی دوروں کا پروگرام بنایا تو میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا اہل ارادہ توڑنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہذا مجبوراً میں نے حفاظتی نکتہ نظر سے ان کے ساتھ کچھ لوگ لگا دیے۔ یہ لوگ سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے تھے اور ہر شام مجھے رپورٹ دیتے تھے۔ جب وہ اہور کے جلسے میں گئے اور کچھ شہر پسندوں نے جلسہ الٹ دیا اور ان پر حملہ کیا تو مجھے ان لوگوں نے اطلاع دی کہ آپ خان صاحب کو روکیں ان کے لئے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے خلاف خونی سازشیں تیار کر رہے ہیں۔ میں نے لیاقت علی خان کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان پر پاکستان کو دنیا کے بہترین ممالک کی فہرست میں اکھڑا کرنے کا جنون سوار تھا۔ وہ ملک کے لئے اپنی جان کو حقیر نذرانہ قرار دے رہے تھے۔ میں رنج ہو کر رہ گئی۔ ۱۱ اکتوبر کی صبح جب وہ راولپنڈی جانے کے لئے تیار ہوئے تو بڑے خوش تھے۔ جب وہ سٹاف کار میں بیٹھنے لگے تو میرے دونوں بیٹے اشرف اور اکبر بھی سکول جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے بچوں کو پیار کیا تو دونوں ساتھ جانے کے لئے ضد کرنے لگے لیکن خان صاحب نے بڑی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ”بیٹا بڑھائی پہلے سیر بعد آپ اس عمر میں صرف سکول جاسکتے ہیں۔“ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا میں آج قوم کو اپنا راز دار بنا کر سارے دکھوں سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں ان سب کے نام دے دوں گا جو ملک کی جزیں کاٹنا چاہتے ہیں، تم میرے لئے دعا کرنا اور ساتھ ہی وہ سٹاف کار میں بیٹھ گئے۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی تو انہوں نے ہاتھ شیشے سے باہر نکال کر ہلایا۔ جواب میں ہم تینوں نے بھی ہاتھ فضا میں لہرا دیے۔ اس لمحے ہمیں کیا معلوم تھا یہ ان سے ہماری آخری ملاقات ہے۔ ورنہ ہم پورچ میں گاڑی کے ٹائروں کے نشان گنت رہنے کی بجائے انہیں روک لیتے خواہ ہمیں کچھ بھی کرنا پڑتا۔

اسی شام مجھے اطلاع ملی ہمارا سہاگ اُجڑ گیا ہے۔ میرے بچے یتیم ہو چکے ہیں، لیکن میں روئی بالکل نہیں، کیوں؟ کیونکہ جس شخص کو پوری قوم رو رہی تھی اس کی مرگ میرے آنسوؤں کی جمان نہیں تھی۔ وہ ہیرو تھا، پوری قوم کا ہیرو۔ معمار۔ رہنما قائد اعظم کے بعد دوسرا قائد اعظم۔ لہذا میں اس کی نعش پر ان پڑھ جا ملی عورتوں کی طرح آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی۔ رجز نہیں پڑھنا

چاہتی تھی۔ بس میں نے اپنے بچے لئے اور خاموشی سے وزیر اعظم ہاؤس چھوڑ کر آگئی۔ غلام محمد گورنر جنرل بن گیا۔ ان کے حواریوں کو بڑے بڑے عہدے مل گئے۔ قوم کو بے وقوف بنانے کے لئے ایک انٹواری کمیشن بنا دیا گیا اور بس۔ میرے خاوند یوپی اور کربلا کے نواب تھے لیکن پاکستان آکر انہوں نے جاسید اوکا کوئی کلیم جمع نہیں کرایا تھا لہذا جب وہ شہید ہوئے تو پورے ملک میں ہمارے لیے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ رقم وہی تھی جو مرحوم کی اپکن سے نکلی۔ لہذا میں نے سوچا بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کہیں نوکری کر لوں۔ انہی دنوں سکندر مرزا میرے پاس آئے تو میں ان سے بڑی نفی سے پیش آئی، کیونکہ وہ بھی لیاقت علی کی شہادت کے بعد موقع سے فائدہ اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ وہ بڑے قتل سے میری بات سنتے رہے آخر میں وہ مجھے قائل کر کے غلام محمد کے پاس لے گئے۔ وہ بڑی فرعونیت سے مجھے ملے اور کہنے لگے۔ ”مجھے پتہ ہے آپ کے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں، کھانے کے لئے کوئی رقم نہیں لیکن میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ آپ کے خاوند نے کلیم جمع کرانے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔“ مجھے بڑا فضا آیا اور میں انہیں خوب برا بھلا کہہ کر پٹلی آئی۔ باہر کو دروازے میں سکندر مرزا نے مجھ سے بڑی معذرت کی لیکن میں جواب میں کیا کہہ سکتی تھی، ایک مرحوم بے آسرا بیوہ کیا کہہ سکتی تھی۔

ایک روز لیاقت علی قتل کیس کی تفتیش کرنے والے اعجاز الدین (اس وقت کے آئی بی سپیشل برانچ) کراچی میں میرے گھر آئے وہ بڑے وضع دار اور محب وطن شخص تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ قاتل تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر وہ چند دن مزید زندہ رہے تو زیادہ دیر تک یہ راز انہیں رہے گا۔ میں نے ان سے تفصیلات پوچھیں تو کہنے لگے سید اکبر (لیاقت علی خان کے قاتل) کو سی آئی ڈی کا ایک اہلکار ۱۵ اکتوبر کو ایٹ آباد سے راولپنڈی لایا تھا۔ بوٹ کے رجسٹر میں اس اہلکار کا نام بھی درج ہے۔ اسے اس کام کے لئے ۱۵ ہزار روپے دیئے گئے۔ ۱۰ ہزار اس کے گھر اور تین ہزار اس کی جیب سے برآمد ہوئے۔ باقی دو ہزار کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔ ۱۶ اکتوبر کو وہ اور اس کا بیٹا سب سے پہلے پنڈال میں داخل ہوئے اور پہلی قطار میں سٹیج کے بالکل سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت اس سارے پنڈال کو پولیس اوری آئی ڈی کے اہلکاروں نے گھیر رکھا تھا پھر اس مشکوک حرکت پر اس سے پوچھ پڑتال کیوں نہیں کی گئی؟ جلد شروع ہونے سے پہلے جب سارے پنڈال کی تلاشی لی گئی تو پولیس نے اس کی ”ذہب“ سے پتہ چل برآمد کیوں نہیں کیا؟ خان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد جب سید اکبر کے قریب بیٹھے قصاب نے اسے دبوچ لیا تو پھر شاہ محمد اے

ایس آئی نے اسے گرفتار کرنے کی بجائے نواری طور پر گولی کیوں مار دی؟ قتل کے روز غلام محمد اور مشتاق گورمانی راولپنڈی میں ہونے کے باوجود وزیر اعظم کے جلسے میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ غلام محمد نے گورنر جنرل بنتے ہی آئی جی پنجاب قربان علی خان کو گورنر بلوچستان کیوں بنا دیا؟ اور پھر موت ہر وقت سامنے کی طرح میرا پیچھا کیوں کرتی رہتی ہے؟ روز روڈ پر میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ کیوں ہو جاتا ہے؟ مچھت کا پتکھا میرے اوپر کیوں کر جاتا ہے؟ سارے سوالوں کے جواب واضح ہیں، بس مجھے ایک ثبوت کی تلاش ہے جو چند روز تک مل جائے گا۔ اس کے بعد میں اپنی رپورٹ اعلیٰ حکام کی بجائے اخبارات کو پیش کروں گا تاکہ مجرموں کو سزا ملنے سے قبل ہی یہ رپورٹ تاریخ کا حصہ بن جائے۔ اعجاز الدین سے اس ملاقات کے بعد میرے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ مجھے اپنے خاوند کے قاتلوں کا یقین ہو گیا اور میں بڑی شدت سے اعجاز الدین کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگی لیکن چند روز بعد جب اس کی رپورٹ عمل ہو گئی تو اس طیارے کو اعجاز الدین اور اس کی رپورٹ سمیت ٹائم بم سے اڑا دیا گیا۔ یوں میری آخری امید بھی دم توڑ گئی۔

۵۲ء کے شروع میں سکندر مرزا میرے پاس ملک غلام محمد کا پیغام لے کر آئے کہ ”اگر آپ پسند کریں تو آپ کو سفیر بنا کر بیرون ملک بھیجا جاسکتا ہے۔“ میں نے انکار کر دیا لیکن سکندر مرزا بولے یہ آپ اور آپ کے بچوں کے لئے بہتر ہے کیونکہ یہ لوگ واردات کا ہر نشان منا دینا چاہتے ہیں۔ مجھے مسز ڈی آپ کے سامنے یہ اعتراض کرتے ہوئے کوئی شرمندگی نہیں کہ میں ڈر کئی اور میں نے ان کی یہ آفر قبول کر لی۔ یوں چند ہی روز میں مجھے یہاں روم بھیج دیا گیا۔ جہاں میں اور میرے بچے فطرت سے بہت دور ہیں لیکن کل کلاں غلام محمد گورمانی سکندر اور ایوب خان نے بھی مر جانا ہے۔ ان کا اقتدار بھی زوال پذیر ہوگا۔ ان کی فرعونیت بھی ختم ہوگی، تو کیا اس وقت کچھ درد مند لوگ اپنے ہیرو کی موت کی تحقیقات نہیں کریں گے؟ مجھے یقین ہے کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہوگا؟ کیونکہ شہیدوں کا لبوز من پر جم جایا کرتا ہے اسے کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی خواہ اس پر کتنی ہی گرد کیوں نہ پڑ جائے۔ میں تم لوگوں سے اس لئے بات کر رہی ہوں کہ مدہوشی میں سنی یہ باتیں کبھی شعور اگل دے تو شاید ان لوگوں کے کام آسکیں جو اپنے اس عظیم ہیرو کے قتل پر تحقیقات کریں گے۔“

کمرے میں اندھیرا اتر چکا تھا۔ کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس میرے کان آتشیں ہتکت کے اس بوڑھے غارتگر کی آواز سن رہے تھے۔ جو غارتکاروں کی روایتی احتیاط سے سوچ

سوختا کرتا ہوتا رہتا ہوتا رہتا رہتا۔ بات ختم ہوئی تو اندھیرے کا احساس بھی بیدار ہو گیا وہ اٹھا اور  
 بلب کا بٹن دبا دیا۔ ساتھ ہی پورے کمرے میں روشنی جاگ اٹھی۔ ہر چیز چمکا چوندا ہوئی کتابوں کی  
 ساری شلکیں رسالوں کے سارے ریک اور بوڑھے سفارحکار کی آتشیں رنگت جس پر پسینے کے  
 قطرے نہانے کب سے لکیریں بنا رہے تھے۔ پھر اس نے کہا میں نے تمہیں یہ سب کچھ اس لئے  
 بتایا ہے کہ تم میرا نام کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو وہ ہوا اس لئے کہ ابھی تک  
 ہماری قوم میں تلخ حقیقتیں سننے کا موصلا پیدا نہیں ہوا اور جب تک یہ پیدا نہیں ہوتا ہم جیسے لوگوں کو  
 سچ بولنے کے لئے نام بدلنا پڑیں گے۔

• • •

جس گھر سے مکینوں کا اعتماد اٹھ جائے  
 اُسے کوئی نہیں بچا سکتا

محب وطن شہریوں کے لئے یوم آزادی پر ایک فکری تحفہ

تو پھر ارشد ہوا۔

میں تمہیں بتاتا ہوں میں کیوں واپس امریکہ جا رہا ہوں۔ ہم دونوں سے امریکی تیں۔ میرے باپ نے ۱۹۵۸ء میں کیلی فورنیا کی ایک کلب ڈانس سے شادی کر لی اور میں پیدا ہوا۔ میں جو مشرق اور مغرب کے درمیان کڑی ہوں شروع سے مختلف تھا۔ میرا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا چلنا پھرنا امریکیوں سے مختلف تھا۔ میری براؤن جلد میری کالی آنکھیں اور میرے سیاہ بال تھے ان لوگوں میں "میں اپنا" نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں وہاں انجینی تھا بالکل کھجور کے اس ورمٹ کی طرح انجینی جو پہاڑ پر آگ کیا ہو یا صحرا میں اٹے چنے کی طرح۔ میں نے کیلی فورنیا یونیورسٹی سے الیکٹریکل انجینئر کی ڈگری لی اور پاکستان آنے کا اعلان کر دیا تو میری ماں نے مجھے روک کر کہا تم پاکستانی نہیں ہو دیکھو میری طرف دیکھو کیا میں تمہیں مشرقی نظر آتی ہوں، اپنی گریڈ ما اور اپنے گریڈ پاگو دیکھو کیا وہ تمہیں انڈین نظر آتے ہیں، اپنے باپ کے کاغذات دیکھو وہاں کسی بھی جگہ پاکستان لکھا ہوا ہے لیکن میں ہنس پڑا کیونکہ مجھے پتا تھا وہ اپنی کلموں میں اٹنے کے باوجود دیسی پودے پر ویسی پھول بنی کھلتے ہیں اور میں تو برسوں کا وہ پھول تھا جو میرا باپ جہلم سے اپنے خون میں چھپا لایا تھا۔ قصہ مختصر میں اپنی "اور بچن" کی تلاش میں یہاں آ گیا اس اور بچن کی تلاش میں جسے میرا باپ ۳۰ برس پہلے چھوڑ گیا تھا۔

میں آیا تو میں نے دیکھا، یہ سب لوگ یہاں سے بھاگنا چاہتے ہیں، اس بیل کی طرح جسے کھونٹے سے بندھے بندھے چاہنا تک احساس ہو گیا ہو کہ زندگی اس دائرے سے باہر ہے۔ مجھے ہر شخص کے چہرے پر سراسیمگی نظر آتی جیسے انہیں کسی نے خبر کر دی ہو کہ چند لمحوں بعد بم پھٹنے والا ہے اور جو بھاگ سکتا ہے بھاگ لے، میں روزانہ میٹھی روڈ سے گزرتا تو مجھے غیر ملکی سفارتخانوں

یہ چند دوستوں کی کہانی ہے جو پاکستان کے یوم آزادی پر ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دکھ شیئر کرتے ہیں۔ جب یہ مضمون شائع ہوا تھا تو حکومت نے میرے اوپر غداری کا مقدمہ بنانے کا فیصلہ کیا لیکن مقدمہ بنانے سے پہلے حکومت بدل گئی۔ یوں میں "ہیرہ" بننے بننے رہ گیا۔ یہ چند رہ برس چھ مضمون ہے۔ افسوس اس مضمون کے پاکستان اور آج کے پاکستان میں کوئی فرق نہیں۔

کے باہر ایسے سینکڑوں لوگ نظر آتے جن کے لباس سے پینے کی بو آ رہی ہوتی اور جن کے دانتوں پر دات کے کھائے کی میل جمی ہوتی لیکن وہ قدرت کی مہربانی کے انتظار میں قطار میں کھڑے ہوتے۔ ان سے پوچھا تم کہاں جانا چاہتے ہو تو وہ بولے باہر کسی بھی ملک میں امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وہ نہیں تو برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، چیکو سلواکیہ، یونان، ترکی اور نہیں تو جاپان، فلپائن، سنگاپور، ملائیشیا، کوریا اور چین، یہاں بھی گنجائش نہیں تو ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان، روس یا یوکرین بھیج دو، ہم وہاں سے آگے چلے جائیں گے اور بھی پابندی ہے تو چلو سعودی عرب، عراق، کویت، ابوظہبی، صلالہ، لیبیا اور مصر ہی کسی اور نہیں جانے دیتے تو برازیل، پانامہ، میکسیکو، یا کیوبا جانے دو وہاں نہیں تو جنوبی افریقہ، تانزانیہ، مراکش اور سوڈان ہی کسی بس ہمیں کسی طرح یہاں سے نکالو خدا کے لئے نکالو کہیں دیر نہ ہو جائے تمہیں پیسے چاہئیں تو بولو کتنی رقم لاؤں گھر بچ دوں گا بیوی کا زیور نیلام کر دوں گا، دکان فروخت کر دوں گا، بوزھے باپ کی ساری جمع پونجی دے دوں گا بس تم مجھے یہاں سے نکالو، دوستو! میں نے دیکھا اپنے ہی ملک پر اتنا عدم اعتماد کہ امریکہ ویزہ لائبریری کا اعلان کرے اور ملک کے تین کروڑ بالعموم میں سے دو کروڑ ایلائی کر دیں، میں نے دیکھا لوگ امریکی پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے دس لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہیں، دن ملین روپیہ، میں نے دیکھا ترکی کا ویزہ لگوا کر یونان کے باؤر پر گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں لیکن اگلے ہی روز پھر پڑھ سو بندے ترکی اٹھیں گے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوستو! میں پوری دنیا دیکھ چکا ہوں لیکن میں نے کسی جاپانی کو برطانوی کہا اتے نہیں، دیکھا کسی امریکی کو فرینچ کہہ، میں تو وہ مرنے مارنے پر اتر آتا ہے سکاٹش دنیا کے کسی کو نے میں چلا جائے وہ سکاٹش ہی کہلائے گا لیکن پاکستانی ہر دوسری قوم میں ضم ہونے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے، لوگ اسے امریکی کہیں، برطانوی کہیں، جرمن کہیں، جاپانی کہیں، اس کا سینہ پھول جائے گا آنکھوں میں چمک آ جائے گی، گردن تن جائے گی پھر وہ دوسرے پاکستانیوں سے کترائے گا کہ کہیں پہچان نہ لیا جائے اور اگر کبھی رنگ و نسل کا سوال آ جائے تو وہ بڑے آرام سے کہے گا ”آئی ایم این ایسٹرن“ اپنے ہی ملک پر اتنا عدم اعتماد۔

میں نے ان لوگوں سے پوچھا تم کیوں جانا چاہتے ہو تو انہوں نے جواب دیا زندہ رہنے کے لئے کیونکہ ہمیں پتہ ہے اس ارض پاک کی حدود ختم ہوتے ہی ہمیں انسان سمجھا جائے گا۔ کوئی نیم اور خواندہ سپاہی ہمیں چوک پر بے عزت نہیں کرے گا۔ بغیر سرچ وارنٹ کے پولیس کی

پوری گارڈ ہمارے گھر داخل نہیں ہوگی۔ ہمیں بغیر چالان جیلوں میں بند نہیں کیا جائے گا۔ کوئی ہمیں سچ سرگ روک کر نکاح نامہ طلب نہیں کرے گا۔ ہمیں ہسپتال جانے کے لئے سفارشی رقعے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میرے بچوں کو بغیر تردد تعلیمی اداروں میں داخلہ ملے گا۔ میرٹ پر انہیں ملازمت ملے گی جب تک ہم بے روزگار رہیں گے ہمیں وظیفہ ملے گا رہنے کے لئے گھر اور کھانے پینے کے لئے وافر ضروریات زندگی ملیں گی، کوئی ہم پر جھوٹا استغاثہ نہیں کرے گا، ہم انصاف کے لئے مارے مارے نہیں پھریں گے۔ وہاں صدر، وزیراعظم، وزراء اور گورنر کے لئے سرکاری بلاک نہیں ہوں گی، وہاں سیاسی نمائندوں سے ملاقات کے لئے سارا سارا دن دھوپ میں کھڑا نہیں ہونا پڑے گا، وہاں کوئی میرے گھر میری دکان میرے پلاٹ پر قبضہ نہیں کرے گا۔ وہاں میں جتنا کام کروں گا مجھے اتنے پیسے ملیں گے اور میرا مالک دوران ملازمت میری عزت نفس پر حملہ نہیں کرے گا تو ہم یہاں سے کیوں نہ چلے جائیں جو ملک ہمارے حقوق پر بے نہیں کرتا جو ہمیں تحفظ نہیں دیتا جو ہماری عزت نفس کی حفاظت نہیں کرتا اسے ہم چھوڑ کیوں نہ دیں۔

دوستو! میں نے انہیں کہا وہاں تم لوگ نسلوں تک اجنبی رہو گے۔ تمہارا ثقافتی بعد، تمہارے رنگ و نسل کا فرق، تمہارا طرز فکر تمہیں اس معاشرے میں حل نہیں ہونے دے گا تم ہمیشہ منفرد رہو گے الگ تھلگ ”آسولٹ“ تو انہوں نے کہا ہم یہاں بھی تو آسولٹ ہیں، اجنبی، تنہا، شور جو صرف ووٹ دینے اور کڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، جہاں قانون ہمارا نہیں، پولیس ہماری نہیں، زبان ہماری نہیں، حکمران ہمارے نہیں اور نظام ہمارا نہیں وہ ملک ہمارا کہاں ہے؟ تم زرا غور کرو تو ہم تمہیں غدار وطن نہیں لگیں گے ہم اپنا ملک چھوڑ کر نہیں جا رہے بلکہ اجنبی لوگ ایک اجنبی جگہ چھوڑ کر دوسری اجنبی جگہ جا رہے ہیں؟

ادھر کی مال روڈ پر جب ہجوم نے دکانوں کے شیشے توڑنا شروع کر دیے تو میں نے چند لوگوں کو روک کر کہا تم اپنی ہی پراپرٹی کو نقصان کیوں پہنچا رہے ہو تو انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا، ہماری پراپرٹی، یہ بینک ہمارا تو نہیں، یہ شاؤنگ مال تو ایچ کریم بخش والوں کا ہے کتابوں کی یہ دکان میاں فیروز کی آل اولاد کی ہے اور یہ بیروں پر حکومت کا ہے، ان میں کون سی عمارت ہماری ہے؟ ہمیں بتاؤ ان میں سے تم کس پر اپنی کو ہماری کہتے ہو جو پاکستانیوں کی ہے، ہم جیسے شہریوں کی ہے یہاں تو جس کے پاس چند لاکھ ہیں وہ آقا ہے اور باقی سب غلام، آداب عرض ہے حضور کا اقبال بلند ہو کو فرش بجالاتے ہیں اور بس یہ ہیں ہم۔

اور اسے صحافی، ارشد نے رندھی آواز میں کہا، جاؤ اپنے اس دانشور سے پوچھو جو کبھی تمہارے ایک حکمران کا دست راست تھا اور اب وہ گھر میں بیٹھ کر صرف کتابیں پڑھتا ہے اور شام کو واک کے دوران اسے جب کبھی کوئی ہمدرد مل جائے تو وہ اس سے دنیا کے حالات سن کر کڑھتا رہتا ہے لوگ اسے الطاف گوہر کہتے ہیں، جاؤ اس سے ملو اور اس بوڑھے پروفیسر کا احوال سنو جسے چند ماہ قبل کراچی میں پولیس بیٹے سمیت گھر سے اٹھا لے گئی تھی، ان کی آنکھوں پر ان ہی کی قیصیں بندھی ہوئی تھیں۔ پھر جب انہیں مجرموں کی قطار میں کھڑا کر دیا گیا تو ایک ان پڑھا اسے ایس آئی نے اس بوڑھے پروفیسر کی چھاتی پر انگلی سے دستک دے کر کہا او بڑھے تم کیا کرتے ہو؟ اور اس بوڑھے پروفیسر نے برستی آنکھوں سے کہا "میں یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔" تو تم لڑکوں کو قتل کراتے ہو؟ اس وقت اسے ایس آئی کی انگلی اس کی ٹانگے آلود پیشانی پر تھی اس تضحیک پر اسے ایس آئی کے پیچھے کھڑے اہلکاروں نے قہقہہ لگا کر اپنے افسر کو داد دی تو اسے ایس آئی نے اس بوڑھے پروفیسر کے گرد چکر لگا کر کمال شہنشاہیت سے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا، جاؤ تمہاری جان بخش دی لیکن پروفیسر چکوال کے اس نوجوان اسے ایس آئی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اسے ایس آئی نے کبھی کسی کا کام نہیں دیکھا ہوگا، اپنے کسی تائے چاہے یا بھائی کی "کوششوں" سے اس عزت و عظمت کا مالک بن گیا ہوگا، اسے ایس آئی نے رعوت سے کہا کیوں اب کیا تکلیف ہے؟ بوڑھے پروفیسر نے کانپتے ہوئے کہا حضور میرا بچہ بے گناہ ہے، اسے ایس آئی کے سامنے کھڑے اس نوجوان کی طرف مڑا، اسے ایس آئی نے اس کے گرد ایک چکر لگایا اور پروفیسر کی طرف مڑ کر کہا یہ تو مجھے کوئی دہشت گرد لگتا ہے اس سے تو تفتیش کرنا ہوگی تم چلے جاؤ اور پھر وہ بوڑھا پروفیسر ساری رات تھانے کے باہر سردی میں آنکڑوں بیٹھا رہا اور اندر تفتیش ہوتی رہی۔ صبح جب اس کا بیٹا تھانے سے باہر آیا تو وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے پھٹے بیٹے کو دیکھ کر بھی بوڑھے پروفیسر کے چہرے پر بہاری گزر گئی اور وہ گھر تک تشکر آمیز نگاہوں سے آسمان کو دیکھتا رہا کیوں؟ اسے صحافی صرف اس لئے کہ اس کا بیٹا ان چند خوش قسمتوں میں سے ایک تھا جو اس تھانے میں گئے اور "پولیس مقابلے" میں مارے جانے سے بچ گئے۔ گھر کی دہلیز عبور کرتے ہوئے پروفیسر نے سوچا چند چوٹیں ہی تو ہیں تھوڑے ہی عرصے میں ٹھیک ہو جائیں گی شکر ہے اس کی جان تو بچ گئی لیکن وہ پروفیسر بڑا بے وقوف تھا جو یہ تک نہ جان سکا کہ جان ہی تو نہیں بچی وہ نوجوان بیٹا اپنی تمام تر عزت نفس کے ساتھ حب الوطنی اور نظریہ پاکستان بھی دین تھا نے میں چھوڑ

آیا تھا۔ جہاں اسے صرف اس جرم کی سزا ملی کہ ۴ برس پہلے اس کے بزرگ اہلکاروں میں چھوڑ چھاڑ کر یہاں آگئے تھے۔ اور وہ تمہارا دانشور جب بھی کسی کو یہ قصہ سنانا ہے تو آخر میں اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے کہتا ہے "پرندہ تو مر گیا لیکن چٹان پر بنے لہو کے نشان ابھی نہیں گئے۔" اور اگر پھر بھی یقین نہ آئے تو مری روڈ کے اس شوروم میں جھانک کر دیکھو جس کے سامنے ایک نوجوان گاڑیاں صاف کرتا نظر آئے گا جس نے دس دن سے شیونٹیں بنائی، جس کے پڑوں پر انجن آئل کے دھبے سجے ہیں اور جس کے سیاہ ہاتھوں سے مٹی کیچڑ اور پٹرول کی بو آتی ہے۔ اس لڑکے نے تمہارے ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی تھی اور جب اسے "نظام" نوکری دے دیا تو وہ حالات کی چوکھٹ پر آگرا۔ اگر یقین نہیں تو اپنے ہی دفتر کے اس شخص سے پوچھ لو جس نے اسے ڈگریوں کا لٹافہ دیا پس کرتے ہوئے کہا تھا "ہمیں افسوس ہے تمہارے پاس آپ کے شایان شان کوئی نوکری نہیں" اور جب اتفاقاً وہ شخص اس شوروم میں گیا تو اس نوجوان نے اس کا دامن پکڑ کر کہا "جناب دیکھئے میں نے بالآخر اپنے شایان شان نوکری تلاش کر لی لی" اور اب وہ شخص جب کسی کو یہ قصہ سنانا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ٹپکلیں اعتراف گناہ میں آنکھوں پر گر جاتی ہیں اور اگر تم پھر بھی ان حقائق کو سنی سنائی باتیں سمجھو تو جاؤ نواکھ نو ہزار چھ سو چھیانوے مربع میل پر پھیلے اس وسیع و عریض ملک کے کسی شہر میں داخل ہو جاؤ وہاں تمہیں ایسے مایوس لوگوں کی وسیع تعداد ملے گی جو اپنی اشیائیں اپنے ہی کندھوں پر اٹھا کر گلیوں بازاروں میں نوحرکناں ہیں۔

مجھے پتہ ہے تم لوگ یقین نہیں کرو گے کیونکہ آسودگی تمہارے گھروں کی دیواروں میں بسی ہے اور آشتی اور فراوانی تمہاری زندگی کا حصہ ہے۔ کافی تمہارا مشروب، سٹائری اور چیری تمہارا پھل، حاملہ عورت کی طرح پھولی کپڑوں کی الماریاں، درجنوں جوتے اور نئے ماڈل کی عورتیں اور گاڑیاں تمہارا طرز معاشرت ہے اور یہ وہ عینک ہے جس سے سب ہر اہی نظر آتا ہے پھر تم یقین کیوں کرو گے؟ لیکن اس کے باوجود میری بات پر یقین کر لو میں تمہارا ہمدرد ہوں کیونکہ میں تمہارا سیاسی مشیر نہیں، میں رکن پارلیمنٹ نہیں، میں کوئی سیکرٹری نہیں، میں نے الیکشن نہیں لڑنا پھر میں بھوت کیوں بولوں گا دیکھو صرف ایک بار بازار میں نکل کر دیکھو تمہیں پھلوں کی ریڑھیوں پر ایسے درجنوں لوگ نظر آئیں گے جو صرف ریٹ پوچھ کر واپس چلے جائیں گے، تمہیں نچلے درجے کے ہونٹوں میں ایک پلیٹ پر دو دو تین تین بھوکے نظر آئیں گے، تمہیں شاپنگ پاروں کے ہار ایسے

سینکڑوں لوگ ملیں گے "پر کس چٹ" پڑھ کر گھر چلے جانا جن کا مشغلہ ہے تم اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو جاؤ رات کو کسی سڑک پر ٹائز بدلنے کے لئے رک جاؤ اور جب کوئی شخص پستول کی تالی تمہاری گردن پر رکھ دے تو اس کی آنکھیں پڑھو جو تمہاری جی سچائی عورت کی بجائے اس کے گلے میں لٹکے ہار پر مرکوز ہوگی اور اس کی انگلیاں جب تمہاری بیوی کی طرف بڑھیں گی تو ہار پر آ کر رک جائیں گی کہ بھوک جنس سے بڑا جذبہ ہے۔

یہ چند لوگ نہیں کہ تم انگلیوں پر گن لو یہ کروڑوں ہیں جن کو سنبھالنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ قطرے نہیں کہ تمہارے ہتھیلی پر بنی خشک ہو جائیں یہ سمندر ہیں جو بوتل میں بند نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ بڑے طاقتور ہیں انہیں اپنا دوست بنا کر رکھو کہ محاذ پر فوجی صرف اس وقت جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے جب اسے یقین ہو چکے اس محاذ سے بہت پیچھے لاکھوں لوگ اس کی شجاعت کے گیت گارہے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو جب بگڑتے ہیں تو جرنیل ڈھاکہ کے میدان میں دشمن کے کمانڈر کو سیلوٹ کر کے اپنی بندوقیں پیش کر دیتے ہیں، یہ لوگ بڑے ظالم ہیں جب نظام سے تنگ آ جائیں تو سوویت یونین جیسا کوہ گراں بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہرتا ان لوگوں کو یہاں سے نکل جانے وڈ کوئی سعودی عرب جا کر آباد ہو جائے کوئی کوریا اور کوئی یورپ نہیں تو یہ لوگ تمہیں نہیں بخشیں گے۔ تمہارے فوجی محاذ پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ تمہاری پولیس کو یہ پکھل کر رکھ دیں گے اور تمہاری انتظامیہ ان کے سامنے کان پکڑ کر بیٹھ جائے گی اور اگر یہ سب کچھ نہ ہو گا تو یہ کسی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کو دعوت دے دیں گے کہ آج سے پونے دو سو سال پہلے مہاجنوں کے ڈسے، جاگیرداروں کے ستارے اور آقاؤں کے ہاتھوں کچلے لوگوں نے انگریز کو "کالی کٹ" کی بندرگاہ سے اٹھا کر دہلی پہنچا دیا تھا۔

دیکھو میری فلائٹ بالکل تیار ہے میں اگلے چند گھنٹوں میں یہاں سے دور چلا جاؤں گا اور پھر میرا اس زمین سے کوئی رشتہ کوئی ناٹھ نہیں رہے گا۔ میرے باپ نے دو بار ہجرت کی ایک بار ۱۹۳۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۵۸ء میں۔ وہاں کیلی فورنیا میں بیٹھ کر وہ پوری زندگی یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا اپنا وطن کون سا ہے کرنال جہاں وہ پیدا ہوا یا جہلم جسے وہ چھوڑ کر چلا آیا۔ مجھے یقین ہے یہ فیصلہ اس کا باپ بھی نہیں کر سکا ہو گا جو پانی پت سے آ کر کرنال آباد ہوا تھا اور اس کا باپ دادا یا پردادا بھی نہیں جو بابر کے ساتھ فرغانہ سے پانی پت آیا اور فرغانہ سے آگے بھی تو دنیا میں ہیں جہاں انسانی نسل کی کڑیاں ابھی تک رزق ناک نہیں ہوئیں، میں چاہوں تو وہاں اپنے خون کے

آثار تلاش کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ یہ بے وقوفی ہے انسان جوں جوں ماضی میں اترتا ہے زمین آگے آگے سرکتی چلی جاتی ہے لہذا انسان کو تھک ہار کر کہیں نہ کہیں رکتا پڑتا ہے۔ زمین کے کسی نہ کسی ٹکڑے کو اپنا وطن قرار دینا پڑتا ہے اور وہ وطن کون سا ہوتا ہے؟ جہاں اس کے ہم نسل، ہم زبان اور ہم خیال لوگ زیادہ ہوں، گویا نظریہ اور ثقافت ہی وطن ہوتے ہیں لہذا نا سمجھو زمین کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی یہ ہمارا نظریہ ہماری فکر اور ہماری سوچ ہوتی ہے جو ہمیں ایک قطعہ ارض پر ثابت قدم رکھتی ہے لیکن جب سوچ اڑ جائے نظریہ دم توڑ دے اور فکر بکھر جائے تو وطن زمین کا ایک ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے نہ رہے تو رہے تو نہ رہے۔

"جاؤ ان لوگوں سے کہہ دو" ارشد دم لینے کے لئے رکا اس کا سانس دھنکتی کی طرح چل رہا تھا اور اس کے سرخ و سپید چہرے پر پیدائش کا چمک رہا تھا۔ ان لوگوں سے جو ہر پانچ برس بعد کائن کے سفید سولوں پر سیاہ ویسٹ کوٹ پہن کر ملک کے سب سے بڑے ادارے میں آ جاتے ہیں اس سے کہو "تم لوگ ہو اس کے ذمہ دار، تم ہی وہ لوگ ہو جو خبر بوزے کو اوپر سے بھی کاٹ رہے ہو اور نیچے سے بھی۔ بیوہ کے سیاہ لباس کے بھی تم ہی ذمہ دار ہو اور آسمان کے نوٹے ستاروں کے مجرم بھی تم، ان کو سمجھاؤ کہ جب لوگ نہ رہیں تو زمینیں بکھر ہو جاتی ہیں اور درخت پھل دینا بند کر دیتے ہیں اور بنجر زمینوں اور بے پھل درختوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا کوئی وطن نہیں ہوتا اور ہاں حاکم وقت سے کہہ دو جب بھی آسمانوں سے عذاب اترتے ہیں تو تمام تر ذمہ داری تخت و تاج پر ہوتی ہے اسے یہ بھی کہہ دو کہ پریش کر کی ٹکی بند ہو چکی ہے لیکن آگ مسلسل جل رہی ہے یہ آگ نہ بجھی تو دھماکہ ہو گا۔ اور پھر تم کہاں جاؤ گے۔ پیرس، لندن، جنیوا، فرینکفرٹ یا نیویارک لیکن تم وہاں کیا ہو گے، معمولی سے پناہ گزین یا شاہ ایران کی طرح پردیس میں تمہارا بھی ایک تنگ و تنار یک دیران اور اس سامر قد ہو گا اور اس پر دن رات مسلح گارڈز کا پہرہ ہو گا۔ یاد رکھو جو لوگ خلق خدا کے لئے زندگی کا حلقہ تنگ کر دیتے ہیں زمین ان کی لاشوں کو پناہ نہیں دیتی۔

قارئین کرام آپ کو یوم آزادی مبارک ہو۔

• • •

حکمرانوں کے روحانی باپ

۴۰ برس پہلے کی بات ہے۔

گورنر جنرل غلام محمد سے ایک دن ان کی چیت پرانیٹ سیکرٹری مس روتھ بورل نے بے باکی سے پوچھا۔ ”سر مجھے آپ میں حکمرانوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی، فالج سے آپ چل پھر نہیں سکتے، بول آپ نہیں سکتے، کھانے کے دوران لقمے آپ کے منہ سے گر جاتے ہیں۔ تو پھر آپ اسٹے برسوں سے اس ملک کے حکمران کیسے چلے آ رہے ہیں۔ میں بہت حیران ہوں۔“ غلام محمد مسکرائے اور اپنے بٹھے کے نیچے سے ایک بوسیدہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکال کر مس بورل کے ہاتھ میں پکڑا دی اور اپنی جناتی زبان میں بولے (جسے صرف مس بورل ہی سمجھ سکتی تھی اور ہر قسم کی محفلوں میں گورنر جنرل کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیتی تھی) ”صرف اس شخص کی وجہ سے! مس بورل نے غور سے تصویر دیکھی اور پوچھا ”سر یہ کون ہیں؟“ غلام محمد نے تصویر واپس لی اور عقیدت سے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا کر بولے۔ ”یہ میرے مرشد ہیں۔“

گورنر جنرل غلام محمد حاجی وارث شاہ سے بہت عقیدت رکھتے تھے، حاجی وارث شاہ صاحب لکھنؤ کے نزدیک ”دیواشریف“ میں مدفون ہیں۔ غلام محمد کے بقول ان کی زندگی پر پیر آف دیواشریف کا بڑا اثر رسوخ تھا اور انہوں نے زندگی میں جتنی بھی ترقی کی اس کے پیچھے حاجی صاحب کا ہی ہاتھ ہے۔ پیر دیواشریف ۲۰ ویں صدی کے شروع میں انتقال کر گئے۔ تقسیم سے قبل غلام محمد ان کے مزار پر اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ جب وہ گورنر جنرل بنے تو پیر آف دیواشریف کا ایک متولی گورنر جنرل ہاؤس میں آ کر بس گیا غلام محمد کے بقول یہ متولی باباجی اور ان کے درمیان ”رابٹل“ کا ذریعہ ہے اور انہیں کسی بھی کام سے قبل مراقبے کے ذریعے باباجی سے مشورہ لے کر جاتا ہے۔ اس دور میں پاکستان کے ”مقدّر“ کے کئی اہم فیصلے اسی متولی کے مراقبوں سے سرانجام پائے۔ ان اہم فیصلوں میں اسمبلیوں کی بر خاستگی اور کابینہ کے متعدد وزراء کی بر طرفی جیسے

۱۹۹۶ء میں اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی۔ ”بے نظیر بھلو

اقتدار میں اوام کے لیے ہر تنک کی اور گاہ پر گیس جہاں بیچ صاحب نے چھڑیاں مار کر انہیں بے اقتدار کی بشارت دے دی۔“ میں نے یہ خبر پڑھی تو سوچا کیا بے نظیر پاکستان کی پہلی حکمران ہیں جو اس روحانی مخالف کا شکار ہیں یا دوسرے حکمران بھی اس نفسیاتی کمزوری میں مبتلا تھے۔ میں نے اس نقطے سے تحقیق شروع کی تو پاکستان کے زیادہ تر سابق اور موجودہ حکمران اپنی تمام نفسیاتی اور روحانی کمزوریوں کے ساتھ میرے سامنے آ گئے۔ یہ مضمون بھی آپ کی نذر رہے۔

”معمولی“ کا رتا سے بھی شامل ہیں۔ غلام محمد اقتدار کے آخری دنوں میں نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ روز صبح سوٹ سوٹ پہن کر گورنر جنرل ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے اور ہاؤس کے سٹاف کو جمع کر کے اس کی ایک مصنوعی کا بینہ بناتے اور اس میں پورٹ فولیو تقسیم کرتے رہتے تھے۔ اس وقت اسی مٹولی نے بابائی کی ”ناراضگی“ کا اعلان کیا اس اعلان کے چند روز بعد غلام محمد سکندر مرزا کے ہاتھوں اقتدار ہار کر کنٹنشن میں اپنی بہن کے گھر شفٹ ہو گئے، ان کے ذاتی معالج کرل سرور انٹر لوگوں کو بتایا کرتے تھے کہ غلام محمد اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہیں بلا کر کہتے تھے سرور میں طیارہ چارٹر کر کے دیو اشریف جانا چاہتا ہوں شاید میری حاضری سے بابائی ”راضی“ ہو جائیں مگر زندگی نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔ لیکن زندگی بھر مادی وارث شاہ کی تصویر غلام محمد کے سر ہانوں کے نیچے یا سامنے تپائی پر رہی اور انہوں نے زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم فیصلے پر حاجی صاحب کو ”شامل حال“ رکھا۔

ایوب خان نے مارشل لا لگایا تو ان دنوں ڈیفنس ہاؤسنگ سکیم کراچی میں ایک خاتون عطیہ (ابھی زندہ ہے) رہتی تھی یہ Seer تھی اور ہونے والے واقعات کو قبل از وقت دیکھ لیتی تھی، اس خاتون نے اپنی نجی محفلوں میں کہنا شروع کر دیا۔ ”اس بے وقوف پنہان کو بتا دو میں اس کی لاش کو گولیوں کی پاڑ پو دیکھ رہی ہوں“ یہ بات اڑتے اڑتے ایوب خان کے کانوں تک پہنچ گئی تو انہوں نے قدرت اللہ شہاب کو عطیہ موجود کے پاس بھیجا۔ عطیہ نے شہاب کو بتایا فلاں تاریخ کو فلاں ریل گاڑی میں مجھے تین چار بیگمات نظر آ رہی ہیں، ان کے عطیہ یہ ہیں، یہ بیگمات ایوب خان کو قتل کرنے کے لئے بھیجی جا رہی ہیں۔ قصہ مختصر عطیہ موجود کی بتائی گئی تاریخ کو ٹرین پر چھاپہ مارا گیا تو واقعی اس میں چار بیگمات سوار تھیں انہیں گرفتار کر کے تفتیش کی گئی تو انہوں نے انکشاف کیا سکندر مرزا نے انہیں ایوب خان کو راستے سے بنانے کے لئے بھیجا ہے۔ پھر اسی رات گورنر جنرل ہاؤس کو آرمی نے اپنے قبضے میں لے لیا اور سکندر مرزا کو گرفتار کر کے کوئٹہ بھیج دیا گیا اس واقعہ کا ایوب خان کے ذہن پر بڑا اثر ہوا اور وہ زندگی بھر جوتھیوں، اہل کشف، بزرگوں، پیراسائیکا لو جیٹلی پاورز کے مالک لوگوں اور ”بابوں“ میں دلچسپی لیتے رہے۔

ان دنوں امریکہ میں جین ڈکسن کا بڑا شہرہ تھا۔ اس خاتون کا دعویٰ تھا کہ جب وہ کسی سے ہاتھ ملاتی ہے تو اس شخص کا ماضی حال اور مستقبل آشکار ہو جاتا ہے۔ امریکی صدر جان ایف کینڈی کے قتل کے بارے میں اس کی پیش گوئی ان دنوں چہار داغ عالم میں گونج رہی تھی۔ اس پیشین گوئی میں جین ڈکسن نے کینڈی کے قاتل کے نام کے ابتدائی حروف بھی بتا دیئے تھے۔

صدر ایوب خان جین ڈکسن کی اس شہرت سے بہت متاثر تھے چنانچہ جب وہ امریکہ کے دورے پر گئے ان کی خواہش پر جین ڈکسن سے ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ جین ڈکسن نے ایوب خان کا ہاتھ پکڑا کر آنکھیں بند کیں اور یوں انا شروع کر دیا۔ دروغ گردان راوی جین ڈکسن نے ایوب خان کو بتایا ”تم ۶۸ تک اقتدار میں رہو گے۔ تمہاری بے وفائی اتنی بدترین ہوگی جتنے تمہارے اقتدار کے دن شاندار۔ تمہارے اقتدار کے بعد بھی بھارت سے پاکستان کی ایک جنگ ہوگی جس میں تمہارے ملک کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کشمیر اس صدی کے آخر تک آزاد ہو جائے گا لیکن کشمیری پاکستان کے ساتھ الحاق کی بجائے خود مختاری کو زیادہ اہمیت دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یعنی شاہدوں کا کہنا ہے ایوب خان نے اس ملاقات کا برا اثر لیا اور وہ اپنی نجی محفلوں میں جین ڈکسن کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے، اس ذکر سے صاف محسوس ہوتا تھا وہ جین ڈکسن کی پیش گوئیوں سے خائف ہیں۔

اس واقعہ کے بعد بھی ایوب خان زندگی کے اہم موڑوں پر جین ڈکسن سے مشورے لیتے رہے۔ خوشاب کے ایک وکیل عبدالغفور صدر ایوب کو ایوان صدارت میں خط لکھتے تھے۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ بعض طاقتوں نے ان کی ڈیوٹی لگائی ہے اور وہ یہ ناگوار ”فرض“ ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ عبدالغفور نے اپنے پہلے خط میں لکھا ”محترمی ارباب بست و کشاد نے مجھے علم دیا ہے کہ روزانہ آپ کو خط لکھوں۔ خط لکھنے کا مقصد ذاتی مفاد حاصل کرنا ہے اور نہ ہی آپ سے قرب حاصل کرنا۔ جناب والا یقین کریں جس قدر میرے خط پڑھنا آپ کے لئے ناگوار ہو گا اتنا ہی میرے لئے آپ کو خط لکھنا ناگوار ہے لیکن یہ ایک مجبوری ہے چونکہ حکم ماننا میرے لئے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔“ صدر ایوب یہ خط پڑھ کر بہت کینوز ہوئے اس کے بعد عبدالغفور ایڈووکیٹ صدر ایوب کو ایک برس تک مسلسل خط لکھتے رہے۔ ان خطوں میں انہوں نے ایوب خان کو ۶۵ء کی جنگ کی، معاہدہ تاشقند، اعلیٰ بہادر شاستری کی وفات، اقتدار کو درپیش خطرات، ایوب خان اور ان کے ساتھیوں کی سیاسی غلطیوں کی پیش از وقت اطلاع دیں، جنگ کے دوران ایوب خان کو مشورہ دیا کہ سیر فارن نہ کرنا اگر کرنا پڑے تو منہ زبانی کرنا عملی نہ تاشقند کے سلسلے میں مشورہ دیا کہ بااؤ سے پر تاشقند نہ جانا اگر ضروری ہو تو کوئی نمائندہ بھیج دینے وغیرہ۔ صدر ایوب خان عبدالغفور ایڈووکیٹ کی ”معلومات“ پر بڑے حیران تھے کیونکہ ان کے خطوں سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایوان صدر میں ہونے والے انتہائی فیفا جلاں تک کی خبر رکھتے ہیں لہذا معاہدہ تاشقند کے دوران ایوب خان نے ان کے گھر کے سامنے خفیہ ایجنسیوں کے لوگ بٹھا دیئے لیکن عبدالغفور اس کے باوجود باخوف خطوط لکھتے رہے۔ صدر ایوب کے سیکرٹری نے جب عبدالغفور ایڈووکیٹ کے انتقال

کی خبر دی تو صدر ایوب کو بہت شاک پہنچا۔ انہوں نے تھوڑا سوچا اور کہا ہاں وہ سچ کہتا تھا لیکن میں کیا کروں غیر سائنسی باتیں مجھے اپیل ہی نہیں کرتیں۔

ایوب خان اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں مری کے مجذوب بابا لال شاہ کے ”مرید“ ہو گئے تھے۔ ۶۵ء کے الیکشن کے دوران جب محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کا بری طرح گھیراؤ کر لیا تو صدر پاکستان اپنی اہلیہ کے ساتھ بابا لال شاہ کے پاس حاضر ہوئے لوگ قطاروں میں لگے ہوئے تھے ایوب بھی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دروغ برگردن راوی جب صدر پاکستان کی باری آئی تو لال شاہ نے انہیں نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور حکم دیا اپنی بیوی کو اٹھاؤ اور ایوب خان نے بھرے جھوم کے سامنے خاتون اول کو بازوؤں میں اٹھالیا۔ باباجی نے خوش ہو کر کہا ”اینوں چک لیا تے اونوں وی چک لیں گا“ (اس کو اٹھالیا ہے تو فاطمہ جناح کو بھی اٹھا لو گے) باباجی کے اس اذن کے بعد ایوب خان کو انتخاب میں اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ ایوب خان کو بابا لال شاہ سے بہت عقیدت تھی وہ اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے باباجی کو متعدد مرتبہ ایوان صدر آنے کی دعوت دی لیکن بقول شخصے باباجی نے اپنا آستانہ چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔

ایوب خان مرید حسن کے قبرستان میں مدفون اللہ بخش نامی بزرگ کی قبر پر بھی حاضری دیتے تھے۔ اللہ بخش سے ایوب خان کو ”متعارف“ کرانے کا سہرہ قدرت اللہ شہاب کے سر جاتا ہے۔ اللہ بخش کے ایک مرید خاص بھائی جان نہ صرف شہاب اور اللہ بخش کے درمیان رابطے کا ذریعے تھے بلکہ ایوب خان اور باباجی کے درمیان ”میل ملاقات“ بھی انہی کے ذریعے ہوتی تھی۔ باباجی ایوب خان کے اقتدار سے بہت پہلے انتقال فرما چکے تھے لیکن بھائی جان کے بقول وہ اب بھی زندہ ہیں اور کارگاہ زیست میں اپنا کام تمام کر کر وفر کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں۔ بھائی جان ایک مرتبہ قدرت اللہ شہاب کو باباجی کی قبر پر لے گئے اور ان کے سر پر دستار باندھ کر اللہ بخش صاحب کی خوشنودگی کا ”پیغام“ دیا جس کے بعد شہاب باقاعدگی سے مرید حسن کے قبرستان میں حاضری دینے لگے۔ عقیدت کے اس دور میں شہاب نے ایوب خان کو بھی اللہ بخش سے متعارف کرایا اور ایوب خان بھی باباجی سے ”مشاورت“ فرمانے لگے۔

جنرل ضیاء الحق بزرگوں سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ بہت سے کچے پکے ولیوں سے ان کی ملاقات کے شواہد ملتے ہیں۔ لیکن وہ سب سے زیادہ حکیم فاضل ظہیر سے متاثر تھے۔ حکیم فاضل ظہیر لاہور کی مال روڈ پر ”برائٹ“ کے نزدیک رہتے تھے۔ ان کا تعلق صابریہ سلسلہ سے تھا وہ جہاں روح کی پیچیدہ دنیا کے ماہر تھے وہاں دین اور علم فلکیات کے بھی عالم تھے۔ ان کے علم و فضل

اور معجزات کے باعث آرمی آفیسرز کا ایک بڑا طبقہ ان کا معترف تھا۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ جنرل ضیاء الحق حکیم صاحب سے پہلی مرتبہ کب اور کہاں ملے لیکن یہ بات علم میں آئی ہے کہ حکیم صاحب نے جنرل ضیاء کو اقتدار کی نوید اس وقت سنا دی تھی جب اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا بعد ازاں جب حالات جنرل ضیاء کے حق میں سازگار ہو گئے تو ان کا حکیم صاحب پر اعتماد بڑھتا چلا گیا یہ اعتماد بالآخر عقیدت کی شکل اختیار کر گیا۔ برسر اقتدار آنے کے بعد جنرل ضیاء الحق کی حکیم صاحب سے مشاورت جاری رہی حکیم صاحب کا مشورہ جنرل ضیاء الحق کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ بعض رازدانوں کا دعویٰ ہے جنرل ضیاء کے دور میں ہونے والی اسلامی اصلاحات کے پیچھے حکیم فاضل ظہیر کی تعلیمات کا رفرما تھیں۔ بیگم شفیقہ ضیاء اور مولانا کوثر نیازی کے بقول حکیم صاحب نے سانحہ بہاولپور سے قبل جنرل ضیاء کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ۷ اگست ۱۹۸۸ء کی صبح حکیم صاحب نے جنرل ضیاء الحق کو بہاولپور کے سفر سے روکنے کے لئے ایوان صدر فون کیا لیکن ان کی صدر سے بات نہ ہو سکی معاملہ حساس ہونے کے باعث حکیم صاحب نے ایوان صدر کے کسی دوسرے شخص کو راز دار نہ بنایا تاہم وہ بہاولپور چھاؤنی فون کرتے رہے لیکن صدر ضیاء سے ان کا رابطہ نہ ہو سکا بقول مولانا کوثر نیازی حکیم صاحب نے ان کے صاحبزادے کو حکم دیا کہ وہ کار پر بہاولپور جائے اور جنرل ضیاء کو بہاولپور سے واپسی سے قبل مجھ سے فون پر بات کرنے کا کہے لیکن یہ کوشش بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور شام کو جنرل ضیاء کی حادثاتی موت کا پیغام نشر ہو گیا۔

بابا ملتان کا بھی دعویٰ ہے جنرل ضیاء ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے انہیں اور ان کے اہل خانہ کو جنرل ضیاء نے متعدد حج اور عمرے کرائے اور انہیں (بابا ملتان) جنرل ضیاء کے ساتھ خانہ کعبہ اور حجرہ نبوی کے اندر تک جانے کی سعادت حاصل ہوئی جنرل ضیاء ملتان کے بزرگوں سے بھی وابستہ تھے لیکن ان کے نام ابھی تک پردہ راز میں ہیں۔

مانسہرہ سے ۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ”لساں نواب“ نامی ایک قصبہ ہے وہاں سے سات کلومیٹر کے پیدل پہاڑی سفر کے بعد ”رحمت اللہ دیوانہ بابا“ کا آستانہ آتا ہے دیوانہ بابا کو عرف عام میں تنکہ بابا کہا جاتا ہے۔ اس درگاہ پر زمین سے تین فٹ بلند چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا ہے جس پر چھپر پڑا ہے اور اس چبوترے پر لنگوٹی باندھے ویسٹ کوٹ پہنے معروف روحانی کردار ”تنکہ بابا“ ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے بیٹھا ہے اور اس کے سامنے ”زائرین“ کی ایک طویل قطار بنی ہوئی ہے۔ ایک ایک کر کے یہ زائرین بابا کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور باباجی حسب توفیق ہر شخص کی کمر پر ایک دو ڈنڈے مار دیتے ہیں اس ڈنڈا نوازی سے زائرین اپنے گونا گوں مسائل سے چھٹکارا پا

جاتے ہیں۔ باباجی کی کرامات اول اول صرف ہزارہ تک محدود تھیں لیکن ”لساں نواب“ سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ایک گاؤں ”جھوکاں گراں“ کی ایک خاتون کی شادی جمالی فیملی میں ہو گئی اس شادی کے بعد باباجی بین الاقوامی اہمیت اختیار کر گئے۔ اس خاتون نے اپنے سسرال میں تنگ بابا کی کرامات کا ذکر کیا تو میر ظفر اللہ خان جمالی کی والدہ متاثر ہو کر بابا تنگ کے پاس حاضر ہو گئیں۔ بعد ازاں میر ظفر اللہ خان جمالی بھی وہاں تشریف لے گئے۔ ان دنوں بلوچستان میں ان کے لئے حالات سازگار نہیں تھے باباجی کی ”تواضع“ کے بعد جمالی صاحب کی مشکلات حل ہو گئیں۔ جمالی صاحب نے باباجی کا ذکر اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف سے کیا۔ چند روز کے بعد نواز شریف کا سرکاری ہیلی کاپٹر تنگ بابا کی درگاہ کے قریب اتر اور مانسہرہ جیسے دور دراز مقام کے اس کردار کو بین الاقوامی شہرت مل گئی۔ تنگ بابا نے نواز شریف کی کمر پر تین ڈنڈے مارے اور کہا ”تو بادشاہ بنے گا“ باباجی کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور نواز شریف ۱۹۹۰ء میں وزیر اعظم بن گئے جس کے بعد انہوں نے لساں نواب سے باباجی کی درگاہ تک تین کروڑ روپے کی لاگت سے سڑک تعمیر کرنے اور درگاہ کے بالکل سامنے ہیلی پیڈ بنانے کا حکم دیا تاکہ آئندہ کسی قائد حزب اختلاف کی بچاؤ اور وزیر اعظم کے ہیلی کاپٹر کو باباجی تک رسائی میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ نواز شریف کے دور اقتدار میں بابا تنگ کی شہرت ایوان اقتدار میں پوری طرح گونجتی رہی۔ اس شہرت نے اس وقت کی قائد حزب اختلاف بے نظیر بھٹو کو بھی متاثر کیا اور ۱۹۹۱ء میں وہ بھی سات کلومیٹر تک پیدل سفر کر کے بابا تنگ کے حضور حاضر ہو گئیں۔ باباجی کے ملنگ آج تک زائرین کو بے نظیر کی حاضری کی داستان فخر سے سناتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا ”جب بے نظیر باباجی کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔“ بابا جی نے انہیں دیکھا اور اپنے سامنے بٹھالیا۔ باباجی کی طرف سے ترجمانی کے فرائض ایک نیم خواندہ ملنگ ادا کر رہا تھا جبکہ بے نظیر بھٹو کی ترجمان ان کی لیڈی سیکرٹری تھی۔ ملاقات کے آخر میں باباجی نے تین عدد ڈنڈے مار کر کہا ”ہن تیری داری اے“ (اب تمہاری باری ہے) پیش گوئی اس بار بھی سچ ثابت ہوئی لہذا بے نظیر بھٹو نے ۱۹۹۲ء میں برسر اقتدار آتے ہی درگاہ تک پختہ سڑک کی تعمیر کا کام تیز کرنے کا حکم دے دیا۔ مئی ۱۹۹۰ء میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی باباجی کے حضور حاضری دی اور باباجی نے انہیں بھی ڈنڈوں سے نوازا لیکن تاہم تحریر ان ڈنڈوں کا اثر سامنے نہیں آیا۔

مسلم کمرشل بینک جہلم میں عرفان احمد نامی (ابھی زندہ ہیں) ایک صاحب ملازم تھے انہیں قدرت نے ماضی اور مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت عطا کر رکھی تھی۔ نواز شریف (وزیر اعلیٰ

پنجاب کے دور میں) نے کسی شخص کو دو کروڑ روپے دیئے۔ اس شخص نے یہ رقم راجہ افضل کو پہنچا نہ تھی لیکن وہ شخص رقم لے کر غائب ہو گیا کیس حساس نوعیت کا تھا افشائے راز کے خوف سے اس میں پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کو ملوث نہیں کیا جاسکتا تھا لہذا راجہ اکرم (بری امام والے) راجہ افضل اور مرحوم سیف الدین حسام (معروف ادیب اور دست شناس) عرفان احمد کو لے کر نواز شریف کے پاس پہنچ گئے۔ عرفان احمد نے آنکھیں بند کیں اور کہا میں اس صلیب کے شخص کو فلاں تاریخ کو راوی پل سے داتا دربار کے درمیان گھومتے دیکھ رہا ہوں اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس ہے جس میں رقم موجود ہے اور یہ شخص اس دن کے بعد ملک سے فرار ہو جائے گا۔ وزیر اعلیٰ کے حکم سے مقررہ تاریخ کو پولیس نے راوی کے پل سے داتا دربار تک سارا علاقہ سیل کر دیا پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور وہ شخص حیرت کی حالت میں قریب پکڑا گیا رقم بریف کیس میں محفوظ تھی۔ اس واقعہ کے بعد نواز شریف عرفان احمد کے محترف ہو گئے اور گاہے بگاہے پیچیدہ قومی مسائل پر ان کی ”مدد“ لیتے رہے۔

فیصل آباد ڈسٹرکٹ روڈ پر دس کلومیٹر کے فاصلے پر ”دساں آرائیاں“ نام کا گاؤں ہے۔ یہ گاؤں صوفی برکت المعروف ”سالار صاحب“ کے حوالے سے بڑی شہرت کا حامل ہے۔ سالار صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے اور وہ ایک ہاتھ میں تلیج پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ تحریر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ان تحریروں کو لاہور کا ایک پبلشر خوبصورت اور قیمتی کاغذ پر شائع کرتا ہے اور یہ تحریریں زائرین میں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ سالار صاحب کے پاس روز سینکڑوں لوگ آتے ہیں ہر شخص ان کے سامنے چند لمحات کے لئے حاضری دیتا ہے اور پھر اٹھ کر چلا جاتا ہے اس دوران وہ اگر کسی سے بات کرنا چاہیں تو صرف ہونٹ ہلاتے ہیں اور ان کا مرید خاص ہونٹوں کی اس حرکت کو پڑھ کر سنا دیتا ہے۔ سالار صاحب نے وہاں ایک ”قرآن محل“ بھی بنا رکھا ہے جس میں قرآن مجید کے قدیم اور جدید لاکھوں نسخے رکھے گئے ہیں۔ نواز شریف کو فیصل آباد کے ایم این اے شیر علی وہاں لے کر گئے تھے۔ سالار صاحب نے ان سے تفصیلی بات چیت کی وہ میاں صاحب کو قرآن محل بھی لے گئے جہاں انہوں نے میاں نواز شریف کے لئے بلند اقبال کی دعا فرمائی۔ وزارت عظمیٰ کے دوران نواز شریف سالار صاحب سے اکثر ملاقاتیں کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۲ء میں ان کی برطرفی تک جاری رہا دروغ برگردان راوی جب نواز شریف کی صدر اسحاق سے آویزش طول پکڑ گئی اور دونوں کا جانا ٹھہر گیا تو نواز شریف مشورے کے لئے سالار صاحب کے پاس گئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ ”یہ شخص اب ہمارے پاس زیادہ ہی آنے لگا ہے۔“

نواز شریف بیرون الدین سے بھی گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ بیرون صاحب سے نواز شریف کو ڈاکٹر طاہر القادری نے ”اپنے“ دنوں میں متعارف کرایا تھا۔ بیرون صاحب عبد القادر جیلانی کے نسب سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہری و باطنی علوم کے ماہر ہیں۔ پاکستان کے اندر اور ملک سے باہر ان کے عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ موجود ہے نواز شریف ان سے بھی بعض امور پر مشاورت کرتے رہے لیکن یہ سلسلہ ڈاکٹر طاہر القادری کے ساتھ گزرنے کے بعد کچھ کمزور پڑ گیا تاہم نواز شریف آج بھی بیرون صاحب کا نام بڑی عقیدت سے لیتے ہیں۔

بھٹو خاندان کی بیروں، بزرگوں، جوتشیوں اور غیر مرنی طاقتوں کے حامل حضرات سے وابستگی کی داستان بڑی ہوشربا ہے۔ اس تحقیق کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کی ”عقیدت“ کے زیادہ شواہد نہیں مل سکے لیکن بیگم بھٹو بے نظیر اور آصف علی زرداری کے بارے میں خاصا مواد سامنے آیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر مولانا کوثر نیازی اس طرح کیا کرتے تھے ”اقتدار کے آخری دنوں میں بھٹو نے اپنے ہاتھ کا پرنت دیا اور کہا اے ایم اے ملک کے پاس لے جاؤ اور اس سے میرے نام کا ذکر کئے بغیر پوچھو اس شخص کا کیا بنے گا۔ وہ پرنت ایم اے ملک کے پاس لے گئے تو ایم اے ملک صاحب نے نام اور تاریخ پیدائش پوچھی جو بتانے سے انکار کر دیا تھا، بہر حال ایم اے ملک نے کہا یہ شخص قدرتی موت نہیں مرے گا شاید چھانسی چڑھ جائے۔ بھٹو کیس کے دوران جب بیگم بھٹو بے نظیر ہر طرف سے مایوس ہو گئیں تو ان کے مشیروں نے روحانی طاقتوں سے مدد لینے کا مشورہ دیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو شاہ عبد المظیف بھٹائی کے مزار پر گئیں وہاں ان کی ملاقات ایک مجذوب سے کرائی گئی اس نے بیگم بھٹو سے کہا۔ ”تمہارے سر کا سائیں نہ رہے تو بھی بادشاہت تمہارے ہی گھر رہے گی۔“ مجذوب کی یہ بات اس وقت دونوں خواتین کے لئے دیوانے کی ہر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن جب دس بارہ برس بعد پاکستانی سیاست میں بھٹو خاندان کی جگہ بننے لگی تو بے نظیر بھٹو کو مجذوب کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ ۸۸ء میں ضیاء کریش پھر انتخابات میں جیتنے پارتی کی کامیابی کے بعد غیر مرنی طاقتوں پر بھٹو خاندان کی روحانی وابستگیوں کی داستانیں چند ہونٹوں تک محدود رہیں اگر یہ بات باہر نکلی بھی تو لوگوں نے پروپیگنڈا سمجھ کر نفی کر دی لیکن الگست ۹۰ء میں حکومت کی برطرفی کے بعد بے نظیر بھٹو کے روحانی ”راہبوں“ کو عوامی دھام مل گیا جس کی تفصیل دلچسپ حکایات سے کم نہیں۔

حکومتی برطرفی کے چند روز بعد ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو چکوال سے چند کلومیٹر پیچھے جاتلی میں مقیم مجذوب سائیں بھلی (زندہ ہے) سے ملاقات کے لئے گئیں۔ مس نابد خان اور

پرویز اشرف بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سائیں بھلی بابا لال شاہ کا شاگرد تھا بعد ازاں وہ بڑے عرصے تک ہری امام کے مزار پر رہا پھر اس کی ”ذیوی“ چکوال میں لگا دی گئی۔ سائیں بھلی نے بے نظیر کو دشمنوں پر قابو پالینے کی نوید سنائی اور سارے وفد کو تھپکپھیاں دے کر رخصت کر دیا۔ دو بارہ برس اقتدار آتے ہی مس نابد خان نے ایک قیمتی پلنگ تحفہ سائیں کی خدمت میں پیش کیا یہ پلنگ بھلی سرکار نے اپنی بہن کو دے دیا۔ مس نابد خان کا آج تک سائیں بھلی کے ساتھ رابطہ ہے اور وہ ہندو قبائلی کے لئے سائیں سے باقاعدگی سے دعائیں کراتی ہیں۔

کراچی کے علاقے چاکیوڑہ میں ایک ویران اور شکستہ مزار پر ایک غیر معمم خاکروب ہے یہ سغلی علوم کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ پیپلز پارٹی کراچی کے ایک صاحب جنہیں جمعہ غری کہا جاتا ہے ۱۹۹۱ء میں بے نظیر بھٹو کو اپنی ذاتی گاڑی میں اس کے پاس لے کر گئے۔ ”ماہر“ نے جتنی آگ میں کوئی چیز جھنکی اور دھوکیں پر نظریں گاڑ کر کہا ہم تمہارے دشمنوں کا اتحاد توادیں گے۔ بعد ازاں بے نظیر بھٹو باقاعدگی سے اس ”ماہر“ کے پاس جاتی رہیں کچھ عرصے بعد محمد خان جو بھٹو کا انتقال ہوا اور سلطان لیگ و حصوں میں تقسیم ہوئی جس کے بعد نواز شریف حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔ بے نظیر اس ساری تہذیبی کا کریڈٹ اس ”ماہر“ کے چلوں کو دیتی ہیں۔ دو بارہ برس اقتدار آنے کے بعد جمعہ غری صاحب کی خدمات کے اعتراف میں گورنر ہاؤس کے پریس سیکشن میں اعلیٰ افسر لگا دیا گیا وہ ۱۹۹۶ء تک وہاں تعینات رہے۔

آصف علی زرداری نے قید کے دوران مذہب کا مطالعہ شروع کیا تو تصوف کی چند کتابیں بھی ان کی نظر سے گزریں۔ ان میں بزرگوں کے احوال پڑھ کر انہوں نے کسی اللہ والے سے ملاقات کا فیصلہ کیا ان کے چند سیاسی ملاقاتیوں کو جب ان کے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے میا نوالی کے نواب جہانگیر ابراہیم المعروف ”ابرا“ سے زرداری کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ نازل زندگی میں درویشانہ طرز معاشرت کے حامل ”ابرا“ کے پاس چند غیر مرنی طاقتیں ہیں جس کے باعث وہ مختلف نوعیت کی پیش گوئیاں کرنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ ”ابرا“ نے ملاقات کے دوران زرداری کو مستقبل قریب میں رونما ہونے والے چند واقعات کے اشارے دیئے جو بعد ازاں سچ ثابت ہوئے تو زرداری کو ”ابرا“ سے عقیدت ہو گئی۔ اس دوران بے نظیر بھٹو سے بھی ان کی چند ملاقاتیں ہوئیں لیکن ”ابرا“ انہیں زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہاں سے انکیشن تک راوی کو ”ابرا“ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد ”ابرا“ کو وزیر اعظم ہاؤس میں بارہ رک ٹوک آتے جاتے دیکھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ آصف زرداری

کی انتہائی حساس میٹنگوں میں بھی بغیر پیشگی اطلاع کے چلا جاتا تھا اور زرداری صاحب خوشی سے اس کا استقبال کرتے تھے۔ ۹۵ء میں بے نظیر کے دورہ امریکہ کے دوران "ابرا" نے پہلی مرتبہ اخبارات میں طلوع ہو کر شہرت حاصل کی چند ہفتوں تک سرخیوں کا موضوع بننے کے بعد ابرا دوبارہ گوشہ گنہامی میں چلا گیا لیکن وزیراعظم ہاؤس تک اس کی پہنچ اسی طرح قائم رہی۔

۹۳ء کے انتخابات کے دوران بے نظیر بھٹو جب فیصل آباد کے دورے پر گئیں تو وہاں ان کے شوق سے واقف ایک سیاسی شخصیت نے ان کی ملاقات ایک نجوی سے کرائی۔ نجوی نے زانچہ بنا کر بتایا آپ الیکشن جیت جائیں گی لیکن آپ کا اقتدار صرف اڑھائی سال تک چلے گا۔ وہ چونکہ پڑیا اور کہا مجھے ریحانہ (گوجر خان میں مقیم ہے) نے بھی یہی کہا تھا۔

بے نظیر بھٹو ۱۹۹۵ء میں نیلسن منڈیلا کی تقریب حلف برداری میں شرکت کے لیے جنوبی افریقہ گئیں۔ اقتدار سنبھالنے کی تقریب کا آغاز افریقہ کے روایتی انداز سے ایک وسیع ڈاکٹر کی دعا سے ہوا۔ وسیع ڈاکٹر کو دیکھتے ہی وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے معروف پاکستانی صحافی اور دانشور الطاف گوہر کے کان میں کہا "افریقی آپ کے پرانے دوست ہیں میں اس وسیع ڈاکٹر سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں آپ میری ملاقات کا انتظام کر دیں۔" صحافی کے بقول تقریب کا باقی وقت وزیراعظم پاکستان نے عجیب بے چینی اور اضطراب میں گزارا۔ تقریب کے بعد دونوں کی ملاقات کا اہتمام کر دیا گیا۔

ترکی کے توپ کاپی میوزیم میں نبی اکرم کی مہر موجود ہے۔ نبی رسالت اپنے تمام مکتوبات پر یہ مہر لگایا کرتے تھے۔ یہ مہر مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی عثمانی خلفاء تک پہنچی تو وہ ہر سال چند کاغذوں پر یہ مہر ثبت کر کے یہ کاغذ اپنے پسندیدہ درباریوں، وزراء اور معززین شہر میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ "تعویذ" بلند اقبالی باعث برکت اور باعث سعادت سمجھا جاتا تھا۔ وزیراعظم بے نظیر کو خبر ہوئی تو انہوں نے ترکی کے دورے کے دوران توپ کاپی میوزیم کھلوا کر مہر رسالت کا وہ تعویذ حاصل کیا۔

باواملتانی ایک ایسا عجیب کردار ہے جو پچھلے ۳۰ برس سے ایوان اقتدار کے ارد گرد منڈلاتا نظر آ رہا ہے۔ ایوب خان کی والدہ، ہمشیرہ اور اہلیہ، یحییٰ خان کی اہلیہ، جنرل ضیاء کے اہلی خانہ اور نواز شریف سے اس کے تعلقات کے باقاعدہ شواہد ملتے ہیں۔ اس ان پڑھ بزرگ کو بزرگی کا ۶۰ سالہ تجربہ ہے۔ پورے ملک کے اعلیٰ طبقوں میں اس کے زائرین پائے جاتے ہیں۔ کراچی ۱۱ ہور اور اسلام آباد میں باواملتانی کی بڑی شاہانہ رہائش گاہیں ہیں جہاں روز بڑی بڑی گاڑیوں میں سوار پاکستان کی کریم حاضری دیتی ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک معروف اداکار جو ۳۵

برس سے باواجی کے مرید ہیں انہوں نے مجھے بتایا باوا ۱۱ ہور میرے گھر آ کر ٹھہرتا تھا جب کسی خصوصی زائر کا کام کرنا ضروری ہوتا تو باوا کوٹلوں کی آگے بٹھی اور دو چھریاں منگواتا چھریاں کوٹلوں میں دبا دیتا جب لوہا سرخ ہو جاتا تو وہ ان چھریوں کو اپنی زبان پر بھجانا شروع کر دیتا اور زائر کا کام ہو جاتا۔ باواجی نے برہنہ پا پورا پاکستان گھوما ہے ہر جگہ اس کے زائرین ہیں بالخصوص وفاقی سیکرٹری آرمی کے جنرل عدلیہ کے اعلیٰ ارکان، تاجروں اور سیاست دانوں کی بڑی تعداد باوا کے حلقہ اثر میں داخل ہے۔ مضبوطی و قوت سرخ آنکھوں اور گھنی سفید داڑھی والے باوا سے بے نظیر بھٹو کا رابطہ کراچی میں ہوا جہاں باوا سے بے نظیر کی ملاقات کے باقاعدہ شواہد ملتے ہیں۔ آج کل باواملتانی راول ٹاؤن میں اپنی شاہانہ رہائش گاہ میں مقیم ہے۔ جہاں ایک مرتبہ وزیراعظم محترم بے نظیر بھٹو بھی تشریف لے گئیں جبکہ باواملتانی متعدد مرتبہ وزیراعظم ہاؤس گیا۔

شیخوپورہ کے بابا شیر نوالہ اور ٹھٹھہ کے بابا جناتی کا بھی وزیراعظم سے رابطہ ثابت ہوتا ہے تاہم ان کے بارے میں زیادہ تفصیل دستیاب نہیں ہماری معلومات اخبارات کی کہانیوں تک محدود ہیں لہذا وہ خارج از بحث ہیں۔

علامہ اقبال ٹاؤن کے جہانزیب بلاک میں مقیم سید سرفراز شاہ عصر حاضر کے ایک چڑھے لکھے بزرگ ہیں۔ لندن سے ایم بی اے کیا۔ پاکستان میں ایک بڑی فرم میں نمبر ٹو ہیں لیکن اپنی روحانی طاقتوں کے باعث چڑھے لکھے اور صاحب اقتدار حلقے میں ان کی بڑی دھوم ہے۔ ان کا اصل کمال کشف ہے وہ چہرہ دیکھ کر ماضی حال اور مستقبل کا احوال بتانا شروع کر دیتے ہیں جو حاضرین کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اندھوں کی بینائی لوٹانے کی ان کے پاس خصوصی دعا ہے جس سے وہ میسوں مریضوں کو شفا یاب کر چکے ہیں۔ وہ ملاقاتیوں سے صرف جمعہ اور ہجر کے روز ملتے ہیں۔ تنخواہ کا زیادہ تر حصہ مہمانوں کی خاطر داری پر لگا دیتے ہیں۔ حکمران طبقے میں میاں منظور احمد وٹو اور ان کے وزراء کی ایک کثیر تعداد ان سے وابستہ ہے۔ آرمی آفیسر زعدلیہ کے جنوں دانشوروں ادیبوں اور صحافیوں کا ایک بڑا طبقہ بھی ان کے حلقہ اثر میں شامل ہے۔ جنرل جہانگیر اشرف قاضی کو عارضی آرمی چیف بننے اور جسٹس الیاس کو عبوری گورنر شپ کی نوید شاد صاحب نے بہت پہلے سنا دی تھی۔

مسلم لیگ جو پنجو کے زیادہ تر ارکان ہری پور کے بزرگ ڈاکٹر جان محمد وارثی کے معتقد ہیں۔ وارثی صاحب سلسلہ وارثیہ کے بزرگ ہیں۔ ظاہری و باطنی علوم کے ماہر ہیں۔ طبیعت کی عاجزی اور کشادہ دلی سے ہر ملنے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ ۹۰ برس کے سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ لیکن ملنے والوں کو "بزرگی" کی لالچی سے نہیں ہانکتے لہذا ان کی محفل میں "جہانگیر گپ" نہیں وہ

بہنی طور پر نابالغ شوخ و شنگ نوجوان سے مل کر بھی اتنے ہی خوش ہوتے ہیں۔ جتنے ایک اعلیٰ پائے کے عالم سے۔ اقبال احمد خان چودھری عبدالستار (ایم این اے) اور ملک خدا بخش نوانہ ان کے بہت معتقد ہیں۔ اقبال احمد خان نے تو پاکستان نظریاتی کونسل کی چیئرمین شپ بھی اس وقت تک قبول نہ کی جب تک وارثی صاحب نے ان کو اجازت نہ دے دی۔

قارئین کرام! دنیا میں موجود روحانی نظام سے انکار ممکن نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ نگاہ مرد مومن سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ گمراہ لوگوں کو منزل مل جاتی ہے اور روحانی بحران میں مبتلا لوگ مرکز حیات تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اس روحانی نظام کے ارباب بست و کشاد کون ہیں؟ دو کہاں ہوتے ہیں؟ ان تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے؟ اور ان کی نشانیاں کیا ہیں؟ یہ تفصیل طلب اور متنازعہ موضوع ہے ہاں البتہ ایک بات واضح ہے کہ بعض جعل سازوں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تسلیوں، چوغوں اور دوازیوں کو ایک کاروبار بنا لیا ہے۔ اور ان لوگوں کی ان کمزور حرکات کی وجہ سے نہ صرف آج کے انسان کا روحانیت سے یقین اٹھ گیا ہے بلکہ وہ مذہب سے بھی دور ہو گیا ہے۔ جس کا نتیجہ سنگین ذہنی، قلبی اور روحانی بحران کی شکل میں سامنے آیا جس کی عملی تفسیر آج کا انسان ہے۔ یہ بھی ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس پر کچھ بھی بات ہوگی۔ مندرجہ بالا تحقیقی مقالے میں کچھ اصلی بزرگ ہیں اور کچھ اصل نما، کچھ عامل ہیں اور کچھ قدرت کی روحانی طاقتوں کا خوبصورت شہکار ان میں اصل کون ہے اور اصل نما کون؟ اس کا تعین آپ نے خود کرنا ہے۔ ہمیں آپ کی ذہانت پر عمل اعتماد ہے۔ جہاں تک ہمارا کام ہے ہم نے کسی بھی ”بزرگ“ کی ہنس سے سو فیصد پرہیز کیا کیونکہ اندر کے بچیدار خدا جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم جسے اصل سمجھ رہے ہوں وہ اصل نما ہوں اور جسے جعل سمجھ رہے ہوں۔ وہی اصلی ہوں باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔

• • •

بجٹ نہیں زندگی مسئلہ ہے

ہمارے پاس دو کمروں کا فلیٹ تھا۔

ایک چھوٹا سا کچن، ایک باتھ روم، الماریوں اور کھڑکیوں سے غاری دو چھوٹے سے کمرے ایک بالکونی اور بس، دو ہزار کرائے کے اس فلیٹ میں ہم چھ افراد رہتے تھے۔ تین ایک کمرے میں تین دوسرے میں جبکہ بالکونی میں ہمارا ملازم رؤف رہتا تھا۔ ہم سب غیر شادی شدہ زندگی گزار رہے تھے۔ سب مختلف شہروں سے تھے۔ سب مختلف دفاتر میں کام کرتے تھے اور سب کی تنخواہیں تین ہزار سے کم تھیں۔ صرف رؤف ہمارا ملازم شادی شدہ تھا لیکن اس کے دونوں بچے اور بیوی مانسہرہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ رؤف ڈیرہ برس سے ہمارے پاس ملازم تھا، شروع میں ہم اسے ایک ہزار روپے ماہانہ دیتے تھے لیکن اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر ہم نے ایک سال بعد اس کی تنخواہ میں پورے دوسرو روپے کا اضافہ کر دیا۔ مہینے کی آخری تاریخوں کو رؤف بہت بے چین ہو جاتا تھا اور ہم میں سے سب سے پوچھتا تھا۔ ”صاحب آپ کو تنخواہ کب ملے گی؟“ فلیٹ کے ہر مکین سے اس کا یہی سوال ہوتا۔ ہم اس کو تنخواہ نہ ملنے کا معقول جواب پیش کرتے لیکن اس کی تسلی نہ ہوتی اس بے چینی میں پہلی تاریخیں آ جاتیں ہم جب شام کو واپس لوٹتے تو روز اسے دہلیز پر منتظر پاتے لیکن ہماری خالی جیبیں اسے مایوسی کی انتہا تک لے جاتیں۔ جس روز ہمیں تنخواہ ملتی وہ گھر سے باہر ہی اپنے ۱۲ سو روپے اچک کر مانسہرہ بھاگ جاتا پھر دو دن تک ہمیں اس کی خبر نہ ملتی۔ تنخواہ کی ”اکسٹنٹ“ ختم ہوتے ہی وہ واپس آ کر دو بارہ کچن میں سر دے کر بیٹھ جاتا۔ صبح میں صرف ایک بار سینما میں فلم دیکھنا اور سو دے سے پیسے بچا کر چھپ چھپ کر گھنیا سے سگریٹ پینا اس کے دو ہی شوق تھے۔ ڈاکٹر کی فیس سے ڈر کر وہ کبھی بیمار نہیں پڑا، ہمارے پٹے پرانے کپڑے پہنتا جو اس نے تین برس قبل خریدا تھا جسے وہ انتہائی اہم موقع پر ہی استعمال کرتا۔

حکومت ہر سال جون میں اگلے مالیاتی سال کا بجٹ پیش کرتی ہے ہر سال یہ بجٹ بجلی بنا کر عوام کے سروں پر گرتا ہے ہم لوگ جب بھی اس بجٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے یہ بجٹ ایک ایسی چٹکی ہے حکومت جس میں اس ملک کے عوام کو پیسے دے گی۔ اس مضمون میں ایک عام شخص کے ذاتی بجٹ کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ یہ فیچر ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔ آپ آج کی مہنگائی کو سامنے رکھ کر اس کے اعداد و شمار میں تبدیلی کر لیں۔

ہم نے اسے جب بھی دیکھا ننگے پاؤں ہی دیکھا۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا تم بارہ سو میں گزارا کیسے کرتے ہو؟ تو اس نے مجھے جہت سے دیکھ کر کہا 'گزارا؟ ہمارے گھر والے چوبیس گھنٹوں میں ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔ آپ مجھے جو کچھ دے دیتے ہیں ان میں سے ایک اپنے لئے رکھ کر باقی گھر لے جاتا ہوں جو اپنا جی اٹی اور میری بیوی بہن لیتی ہے۔ جب وہ ان کے کام کے نہیں رہتے تو ہم انہیں کاٹ کر بچوں کے پیرے بنا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ہے ہم پورے گاؤں میں سب سے امیر ہیں کیونکہ میں کام پر لگا ہوا ہوں پر صاحب مہنگائی بہت ہے۔ میں چھپلے مہینے گھر گیا تو ابا جی کو خون کی اللیاں لگی ہوئی تھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تو اس نے ۸ سو روپے لے لیے دو سو روپے آنے جانے پر خرچ ہو گئے اور دو سو روپے میں اپنی بیوی کو رہے آیا۔

قارئین کرام آج نیا بجٹ آرہا ہے ابھی چند گھنٹوں بعد قومی اسمبلی کا ایوان ہمارے منتخب نمائندوں سے بھر جائے گا اور وزیراعظم مختار مدظلہ العالی نے بے نظیر بھتہ اور قلمی حزب اختلاف میاں نواز شریف کی موجودگی میں مخدوم شہاب الدین اعداد و شمار کی توپ چلائیں گے۔ اتنے ارب خسارہ اتنے ارب کے مزید ٹیکس، سو پلوں کو اتنے ارب روپے ملیں گے، فلاں ٹیکس میں چھوٹ، فلاں دیوٹی کا اخلاق اور ٹیلی فون بجلی اور گیس کے نرخ میں اتنا اضافہ وغیرہ وغیرہ روپے کی باتیں ہو گئیں۔ کروڑوں کے سوال اٹھائے جائیں گے اور لاکھوں روپے میں جواب ہونگے لیکن سامعین دیکھنے گا اس پورے ایوان میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جو اس روف کی بات کرے گا جس کا سارا بجٹ بارہ سو روپے پر محیط ہے اور جس کا خاندان مانسمرد میں ہے اور وہ اسلام آباد کے ایک فلیٹ میں کسمپرسی سے زندگی گزار رہا ہے اور یہ وہ روف ہے جس کے لئے جون کے مہینے میں کوئی وچسی نہیں پہنچا پارٹی ہو یا مسلم لیگ، بھٹ ہو یا نہ ہو یا یو پی، آئی ایم ایف ہو یا عالمی بینک اسے کوئی غرض نہیں کیونکہ وہ دنیا کو ضرورت کی آنکھ سے دیکھتا اور ضرورت کی آنکھ سے سنتا ہے۔ ضرورت ہی اس کا ملک ہے اور ضرورت ہی اس کی حکومت، ضرورت ہی اس کی سوچ اور ضرورت ہی اس کا ایمان بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ سرتاپا ضرورت ہی ضرورت ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ لیکن ہم تو اس روف کی بات کر سکتے ہیں کیونکہ ہم حکومت ہیں اپوزیشن اور نہ ہی وزیر خزانہ۔ آئیے دیکھیں اس ضرورت سے بڑے روف کو زندگی گزارنے کے لئے روز کتنے وسائل کی ضرورت ہے۔

فرض کریں اس کا کنبہ چھ افراد پر مبنی ہے تو

(خوراک)

- (1) ناشتہ = چائے + بند مٹل 6 روپے اگر خاندان چھ افراد پر مشتمل ہے تو 36 روپے بہت کفایت شعاری کی جائے تو پورا خاندان 30 روپے میں ناشتہ کرے گا۔
  - (2) دوپہر کا کھانا = 3 روٹی + سالن مبلغ 14 روپے پورا خاندان 84 روپے کفایت شعاری کے ساتھ 80 روپے۔
  - (3) رات کا کھانا اگر نیا سالن کپلے تو تین روٹی + سالن مبلغ 14 روپے فی کس پورا خاندان 84 روپے کفایت شعاری کے ساتھ 80 روپے۔
  - (4) دو وقت کی چائے = چار روپے، پورا خاندان 24 روپے، کفایت شعاری کے ساتھ 20 روپے۔
  - (5) تیاری کے لئے نہانا شیو، پیسٹ اور تیل اوسطاً 5 روپے روزانہ پورا خاندان 30 روپے اور کفایت شعاری کے ساتھ 26 روپے روزانہ۔
- یوں گھر کا ہر شخص 43 روپے چھ افراد کا کنبہ 258 روپے اور کفایت شعاری کے ساتھ 236 روپے روانہ خرچ کرتا ہے جبکہ اس مد میں ماہانہ خرچ فی کس 1290 روپے پورے خاندان کا 7740 روپے اور کفایت شعاری کے ساتھ 7080 روپے بنتا ہے۔

مسفر

اگر دفتر سکول، کالج اور مارکیٹ چار کلومیٹر کے اندر ہے تو وہ لیکن کا دو طرفہ کرایہ چھ روپے ماہانہ خرچ 180 روپے اگر گھر کے تین افراد روزانہ لیکن پر سفر کرتے ہیں تو 540 روپے ماہانہ اضافی خرچ ہوگا اگر مزید کفایت شعاری کی جائے تو بھی 500 روپے ضرور خرچ ہونگے۔

رہائش

محکمہ بہبود آبادی کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ایک کمرے میں اوسطاً چار افراد رہائش پذیر ہیں جبکہ شہری آبادی کا چالیس فیصد حصہ کراچی لاہور اور فیصل آباد میں اقامت پذیر ہیں۔ ان تینوں بڑے شہروں میں دو کمرے کا انتہائی عام گھر ایک ہزار روپے کرائے سے کم نہیں ملتا لہذا اگر ایک ہزار کرائے کے گھر میں چھ افراد اقامت پذیر ہیں تو رہائش پر فی کس خرچ 167

روپے ماہانہ ہوا جبکہ رہائشی سہولیات بجلی، پانی، گیس، فرنیچر اور مرمت پر اوسطاً فی شخص 165 روپے ماہانہ خرچ کرتا ہے (سالانہ 990 روپے انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ 900 روپے)۔

## لباس

ہر شخص سال میں کم از کم دو جوڑے کپڑے بناتا ہے۔ انتہائی گھٹیا لباس پر بھی تین سو روپے خرچ ہوتے ہیں (دو جوڑوں کے 600 روپے) یوں پورے کنبے کے لباس پر 3600 روپے خرچ آئے گا۔ انتہائی کفایت شعاری کی جائے تو تین ہزار روپے خرچ ہو سکے اس کی اگر ماہانہ اوسط نکالی جائے تو ہر شخص پچاس روپے اور پورا خاندان 300 روپے ہر ماہ اس ضمن میں خرچ کرتا ہے۔

## جوتا

غریب آدمی سال میں ایک سے زائد جوتا خریدنے کی معاشی طاقت نہیں رکھتا لیکن عام سے عام جوتا بھی تین سو روپے سے کم میں نہیں ملتا۔ اس اوسط سے پورا کنبہ سال میں 1800 روپے جوتوں پر خرچ کرتا ہے۔ ماہانہ اوسط فی شخص 25 روپے اور خاندان 150 روپے بنتی ہے۔

## اچانک یا حادثاتی سفر

مہینہ بھر میں خاندان کا ایک شخص شہر کے اندر کم از کم سو روپے کے اچانک یا حادثاتی سفر کر جاتا ہے جبکہ سال میں کم و بیش ایک مرتبہ پوری فیملی کو شہر سے باہر بھی سفر کرنا پڑتا ہے جس پر 12 سو روپے سے کم خرچ نہیں ہوتا یوں اندرون اور بیرون شہر پر اوسط 150 روپے فی کس ماہانہ خرچ بھی ہو جاتا ہے۔

## حادثاتی اخراجات

بیماری، مرگ، پیدائش، مہمان اور اس نوعیت کے دیگر حادثات پر ایک خاندان اوسطاً 600 روپے ماہانہ ضرور خرچ کر بیٹھتا ہے۔ اس خرچ کو چھ افراد کے کنبے پر تقسیم کیا جائے تو ہر شخص کے حصے میں ایک سو روپے آتے ہیں۔

ان تمام اخراجات کا جدول کچھ یوں بنتا ہے۔

وجہ خرچ	ایک شخص کا ماہانہ خرچ	پورے خاندان کا کفایت شعاری سے ماہانہ خرچ
خوراک	1290 روپے	7080 روپے
روزانہ سفر	180 روپے	500 روپے
رہائش	167 روپے	1000 روپے
رہائشی سہولیات	165 روپے	900 روپے
لباس	50 روپے	300 روپے
جوتا	25 روپے	150 روپے
حادثاتی سفر	150 روپے	900 روپے
حادثاتی اخراجات	100 روپے	600 روپے
ٹوٹل		2120 روپے
		11600 روپے

اب اگر چھ افراد کے کنبے میں صرف دو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں تو یونیفارم جوتے، کتابوں اور فیسوں پر کم از کم 300 روپے فی کس خرچ مزید شامل کر لیا جائے (دونوں بچوں کا 600 روپے) یوں فی کس ماہانہ خرچ 2420 روپے اور پورے کنبے کا خرچ 12200 روپے ماہانہ ہو جائے گا۔

اگر پورا خاندان مہینے میں ایک بار سیر و تفریح پر نکل جائے تو سینما پارک کے ٹکٹ، آئس کریم، پاپ کارن، سموٹے، پکڑے اور چائے وغیرہ پر چار سو روپے اضافی خرچ ہوگا۔ یوں 67 روپے کے اضافے سے فی کس ماہانہ خرچ 2487 روپے اور پورے کنبے کا خرچ 12600 روپے تک جا پہنچے گا۔

ان اعداد و شمار کی روشنی میں کنہیوں کی تقسیم کچھ یوں ہوگی اگر خاندان دو افراد پر مشتمل ہے تو 4934 روپے تین افراد پر مشتمل ہو تو 7401 روپے، چار افراد پر مشتمل ہو تو 9868 روپے، پانچ افراد ہوں تو 12335 روپے اور اگر چھ افراد پر مشتمل ہو 14802 روپے ماہانہ خرچ

سونا۔ (اگر کفایت شکاری سے کام لیا جائے تو چھ افراد کا ماہانہ خرچ 12300 روپے ہوگا)۔

اب آتے ہیں خاندان ٹیبر میں کمانے والے افراد کی طرف۔ ٹیبر بھڑا آبادی کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کے 15 کروڑ مہام سے صرف تین کروڑ دس روزگار ہیں جبکہ باقی 12 کروڑ بے کفایت ہیں۔ گویا 5 افراد میں ایک شخص کمانے والا ہے اب ہمارے تحقیق کردہ اشخاص کی رو سے دیکھا جائے تو اگر وہ ہر روزگار شخص 9868 روپے ماہانہ کما کر لائے تو بھی چار افراد پر مشکل خاندان روکھی سوکھی کھا سکتا ہے۔

اگر ہمارے فی سال آمدنی پر مبنی سالانہ (14000 روپے) ہے جو ماہانہ 1133 روپے روزانہ بنتی ہے جبکہ ہر شخص کو 71 روپے روزانہ 2120 روپے ماہانہ 25440 روپے سالانہ روزگار ہیں اب وہ 36 روپے روزانہ 1120 روپے ماہانہ اور 11400 روپے سالانہ حساباً کہیں سے پورا کرے گا جبکہ پاکستان میں ایسے ٹھکانوں کی بھی کوئی کمی نہیں جن میں ایک دالہ سے دو افراد گزار سکتے ہیں۔ دیہات میں تو ایک ٹھکانے والے میں دس لاکھ کڑا رہتا ہے۔

پاکستان میں ابی وقت قریب ایک روزانہ دو سو کاروباری ملازمین ہیں جن میں تقریباً نصف آرمڈ فورسز میں کام کر رہے ہیں۔ سول میں کسی ایک سے گریڈ سات تک چھ لاکھ افراد مل سکتے ہیں۔ ہر سال 22 لاکھ افراد گریڈ سات سے باہر تھے۔ سوال کا جواب یہ ہے کہ ہر سال دو سو لاکھ افراد روزانہ 26 لاکھ افراد روزانہ کما رہے ہیں۔ چھ لاکھ دو سو روزگار افراد بڑھیں۔ غیر سرکاری اداروں اور خانوں اور اسپورٹس، کاشتکاری اور مزدوری کے شعبوں سے وابستہ ہیں۔

سرکاری ملازمین کو اپنی بنیادی تنخواہوں کے علاوہ 45 فیصد باؤنس 90 روپے میڈیکل 130 روپے ٹرانسپورٹ اور سات فیصد کاسٹ آف لیونگ الاؤنس ملتا ہے۔ ان تمام الاؤنسز کو ملا کر ان کی تنخواہوں کی صورتحال کچھ یوں ہے۔ (یہ 1995ء کے اعداد و شمار ہیں)۔

گھریلو	بنیادی تنخواہ	الاؤنسز	کل
1	1245	867	2112 روپے
2	1275	883	2158 روپے
3	1320	906	2226 روپے
4	1360	928	2287 روپے

5	1400	948	2348 روپے
6	1440	968	2409 روپے
7	1480	989	2470 روپے
8	1540	1021	2561 روپے
9	1605	1052	2657 روپے
10	1660	1083	2743 روپے
11	1725	1117	2842 روپے
12	1830	1172	3002 روپے
13	1950	1234	3184 روپے
14	2065	1294	3359 روپے
15	2190	1359	3549 روپے
16	2535	1538	4073 روپے
17	3880	2508	6388 روپے

نوٹ۔ اس میں انگریز شخص شامل ہیں۔

اگر ہم اعداد و شمار دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ 80 فیصد ہر روزگار پاکستانی ہمسائی ممت کے شعبوں سے وابستہ ہیں۔ زیادہ تر لوگ تعمیرات، کارخانوں اور کھیت کھلیان میں کام کرتے ہیں جہاں سے انہیں اوسطاً ایک سو روپے روزانہ ملتے ہیں جن سے انہوں نے کم از کم چھ افراد کا پیٹ پالنا ہوتا ہے جبکہ غیر سرکاری دفاتر میں بی اے سے کم تعلیمی قابلیت کے حامل افراد کو نوکریاں نہیں ملتیں۔ نئے بھرتی ہونے والے 85 فیصد نائب قاصد میٹرک اور ایف اے ہیں۔ دوسری طرف ایم اے اور پروفیشنل کورسز میں ماسٹر ڈگری کے آنے والے زیادہ تر نو جوانوں کو شروع میں تین ہزار روپے سے زائد تنخواہ نہیں ملتی جس میں وہ بمشکل اپنا گزارہ چلاتے ہیں جبکہ اکثر کیسوں میں نوکری تکتے ہی ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ یوں پہلے سے معاشی گرداب میں پھنسے سربراہ خانہ (نو جوان کا باپ بھائی یا والد) پر بہو اور ایک آدھ برس بعد پوتے پوتی کا بوجھ بھی

آپڑتا ہے۔ دوسری طرف جب تین چار برس کی دن رات کی محنت کے بعد اس نوجوان کی تنخواہ میں دو تین ہزار کا اضافہ ہوتا ہے تو وہ تین چار بچوں کا باپ بن چکا ہوتا ہے۔ یوں وہ جب والدین سے الگ ہوتا ہے تو ایک معاشی جدوجہد سے بھری تلخ زندگی منہ کھولے اس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس کی معاشی گردن پر بوڑھے والد بیمار والدہ یا بہن کی شادی کی ضرب بھی آگتی ہے جس سے اس کے جانبر ہونے کے امکانات مفقود ہو جاتے ہیں۔

تو رؤف اپنی بیوی کو دوسو روپے دے کر اسلام آباد آ گیا وہ رؤف جو ہمارا ملازم تھا جو فیٹ کی بالکونی میں سوتا تھا جو ہمارے کپڑے پہنتا اور ننگے پاؤں پھرتا تھا اور جو کھانا کھاتے وقت لقمہ ہونٹوں کے قریب لا کر سوچوں میں گم ہو جاتا تھا یا جورات کو بالکونی میں بار بار پہلو بدلتا تھا اس وقت ہمیں یقین ہوتا کہ وہ اپنے بچوں اپنی بیوی اور اپنے والدین کے بارے میں سوچ رہا ہے جو اس سے دور مانسہرہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں جنہوں نے دوسو روپے میں پورا مہینہ گزارنا ہے اور وہاں ایک دن زدہ بوڑھا باپ بھی ہے جو خون کی اللٹیاں کرتا ہے اور ڈاکٹر نے جس کے علاج کے لئے آٹھ سو روپے لے لئے تھے یقیناً رؤف کے ہونٹوں کے دروازے پر ٹھہرے لقمے اس سے سوال کرتے ہوں گے کہ اس کے بچوں نے تو دونوں سے کھانا نہیں کھایا بالکونی کی پتھریلی زمین اس سے پوچھتی ہوگی کہ اس کی سدا کی بھوکی بیوی اپنی ناموس پلو سے باندھے اس کا انتظار کر رہی ہے اور گلی سے گزرنے والا ہر شخص جب کھانستا ہوگا تو اسے اپنے باپ کی چھاتی کا درد یاد آ جاتا ہوگا..... لیکن صاحبو! یہ لقمے یہ سخت زمین اور یہ سینوں سے اٹھتی کھانسی صرف رؤف کو ہی تنگ کرتی ہے۔ آج قومی اسمبلی کے ایوان سے تو کوئی شخص رؤف کے بارے میں سوال نہیں کرے گا کیونکہ یہاں تو اربوں کروڑوں اور لاکھوں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بارہ سو روپے لینے والے اس رؤف کو کون پوچھتا ہے خواہ یہ رؤف ملک کا 80 فیصد ہی کیوں نہ ہو..... لیکن صاحبو! میری روتی ہوئی آنکھیں اور میرے گلے میں پھنسی ہوئی بے کس مجبور آواز وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور قائد حزب اختلاف میاں محمد نواز شریف اور خزانہ کے وزیر مملکت مخدوم شہاب الدین سے ایک سوال کرتی ہے ہاں صرف اور صرف ایک سوال کہ کیا آپ لوگ ان 80 فیصد رؤفوں سے صرف نظر کر کے گرم پانیوں کے سمندر میں برف کے جزیرے نہیں بنارہے؟



کسی شخص نے اللہ تعالیٰ سے رابطہ کیا اور اس سے کوئی ذمہ داری سوچنے کی درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا۔ ”یہ سامنے ایک چٹان پڑی ہے اسے دھکا دیتے رہو۔“ وہ شخص اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے چٹان دھکیلنے لگا، ایک دن گزرا، ایک ہفتہ گزرا، ایک سال گزرا، دس سال گزر گئے لیکن چٹان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ لوگوں نے اسے سمجھایا ”بھلے مانس تم یہ چٹان نہیں ہرکا سکو گے، کیوں اپنی جان ہانک کر رہے ہو۔“ وہ لوگوں کی باتیں سنتا رہا، سنتا رہا لیکن چٹان بھی دھکیلتا رہا۔ جب لوگوں کے مذاق میں تیزی آگئی تو اس نے ایک دن سوچا، واقعی دس برسوں میں یہ چٹان ایک انچ بھی آگے نہیں سرکی، وہ سیدھا ہوا اور آسمان کی طرف منہ کر کے شکوہ کرنے لگا۔ ”یا پروردگار! یہ چٹان تو نہیں ہرک رہی؟“ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ ”اے بے وقوف شخص! ہم نے تمہیں اس چٹان کو دھکا دینے کا حکم دیا تھا، اسے ہرکانے کا نہیں، سو جسٹ ہٹس اٹ۔“

لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں ”تمہارے لکھے کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟“ میں ان سے عرض کرتا ہوں۔ ”جس قوم پر قرآن مجید کا اثر نہیں ہوا اس پر کالم کیا خاک اثر کریں گے۔“ لوگ پوچھتے ہیں۔ ”تمہیں اپنی ناکامی پر ٹینشن نہیں ہوتی؟“ میں کہتا ہوں۔ ”نہیں ہوتی“ وہ پوچھتے ہیں۔ ”کیوں؟“ میں عرض کرتا ہوں۔ ”مجھے اللہ تعالیٰ نے چٹان کو دھکیلنے کی ذمہ داری سونپ رکھی ہے، اسے ہرکانے کی نہیں، سو آئی ایم جسٹ پچنگ اٹ۔“ وہ ہنس پڑتے ہیں اور میں بھی قہقہہ لگا کر خاموش ہو جاتا ہوں۔

